ضیائے نبوی
اردو ترجمہ وشرح: اربعین نووی
مترجم وشارح
جمشید عالم عبد السلام سلفی
نظر ثانی، تصحیح وتنقیح
فضیلۃ الشیخ وصی اللہ مدنی
فضیلۃ الشیخ شفیق الرحمن مدنی
ناشر
مکتبۃ السلام انتری بازار شہرت گڑھ، سدھارتھ نگر، یوپی، انڈیا

ضیائے نبوی

اردو ترجمہ وشرح

اربعین نووی

مترجم وشارح

جمشید عالم عبدالسلام سلفیؔ

نظر ثانی، تصحیح وتنقیح

فضیلۃ الشیخ وصی اللہ مدنیؔ

فضیلۃ الشیخ شفیق الرحمٰن مدنیؔ

ناشر

مکتبۃ السلام

انتری بازار، شہرت گڑھ، سدھارتھ نگر، یوپی، انڈیا

نام کتاب.................. ضیائے نبوی اردو ترجمہ وشرح اربعین نووی

اردو ترجمہ وشرح.................. جمشید عالم عبد السلام سلفی

نظر ثانی، تنقیح و تصحیح.................. فضیلۃ الشیخ وصی اللہ مدنی

فضیلۃ الشیخ شفیق الرحمان مدنی

صفحات.................. ۳۱۲

ناشر.................. مکتبۃ السلام انتری بازار، شہرت گڑھ، سدھارتھ نگر

کمپوزنگ.................. ابو معاذ سلفی

باہتمام.................. حافظ محبوب عالم سلفی

طبع اوّل.................. مئی ۲۰۲۳ء

تعداد اشاعت.................. گیارہ سو

قیمت.................. ۲۴۰ روپے

مکتبة السلام

انتری بازار، شہرت گڑھ، سدھارتھ نگر، یوپی، انڈیا، ۲۷۲۲۰۵

Maktaba Al-Salam

Antari Bazar, Shohratgarh, Siddharth Nagar, (U.P.) India. 272205

Mob : 9628953010/6393225101 Email : maktabsalam2@gmail.com

فہرست عناوین

تعارف راویانِ حدیث صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

حرفِ اوّل

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام علىٰ خير خلقه محمد وعلىٰ آله وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين، أمابعد :

جس طرح اللہ رب العالمین کی نازل کردہ کتاب قرآن کریم اور خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح نبی کریم ﷺ کی احادیث کی حجیت کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔ احادیث کی حجیت پر ایمان لائے بغیر رسول کی رسالت پر ایمان لانا بے معنیٰ ہو گا۔ اگر ہم رسول کی رسالت کو تسلیم کرتے ہیں، مگر رسول کی احادیث پر ایمان نہیں لاتے ہیں تو یہ صرف زبانی دعویٰ ہو گا۔

رسول کریم ﷺ سے الفت و محبت ایمان کی نشانی ہے۔ ایک مسلمان کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ نبی ﷺ سے اپنی جان و مال اور دیگر تمام چیزوں سے بڑھ کر محبت نہ کرنے لگے اورآپ ﷺ سے محبت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی نبوی تعلیمات کے مطابق گزاریں، احادیثِ نبویہ کو حرزِ جاں بنائیں اور انھیں عام کریں تاکہ لوگ نبوی احکام و تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال کر دنیوی و اُخروی سعادتوں سے بہرہ ور ہو سکیں۔ دراصل رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے سچی محبت کرنے کے لیے رسول کی اتباع کرنا ضروری ہے اور رسول کی اتباع کا مطلب یہ ہے کہ جملہ معاملات میں رسول کریم ﷺ کی احادیث سمیت آپ کی لائی ہوئی شریعت کی پیروی کی جائے۔

احادیثِ نبویہ کا سیکھنا سکھانا اور ان کی نشر و اشاعت کرنا بڑا بابرکت اور مستحسن عمل ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے زبانِ نبوی سے بڑی اہم بشارت و فضیلت وارد ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے :

((نَضَّرَ اللَّهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَأَدَّاهَا)) ”اللہ اس شخص کو تروتازہ رکھے، جس نے میری حدیث کو سنا، اسے یاد کیا، اس کی حفاظت کی اور پھر اسے آگے بیان کیا۔“ [مسند شافعی : ۱۱۰۵]

اسی جذبے کے تحت احادیثِ نبویہ کی نشر و اشاعت کی جاتی ہے۔ چناں چہ زندگی کے تمام شعبہ جات سے متعلق مختلف و متنوع موضوعات پر علمائے کرام نے دنیا کی تمام زبانوں میں احادیثِ نبویہ کا

حسین گلدستہ تیار کیا ہے۔ خدماتِ حدیث کے باب میں سے ایک ”أربعین“ نویسی بھی ہے، جس کی بابت علمائے حدیث نے نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ مختلف ادوار میں متنوع موضوعات پر ہزاروں کی تعداد میں اربعینات تیار کی گئی ہیں، تاہم اربعینات کے باب میں ”أربعین نووی“ کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ اس باب میں کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ امام نووی رحمہ اللہ کی عبقری شخصیت اور ان کی خدماتِ حدیث محتاجِ تعارف نہیں ہے، اہلِ علم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اپنی اربعین میں ایسی اہم احادیث کا انتخاب کیا ہے، جو اساسِ دین کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کی منتخب کی ہوئی تقریباً ہر حدیث شریعتِ مطہرہ کے اہم قواعد وضوابط پر مشتمل ہے۔ ”أربعین نووی“ کی انھی نمایاں خوبیوں کی وجہ سے اسے کافی پذیرائی ملی اور علماء نے مختلف زبانوں میں اس کی متعدد شروحات لکھی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب **”ضیائے نبوی“** بھی ”أربعین نووی“ کا اردو ترجمہ اور شرح ہے، جسے میرے بڑے بھائی مولانا جمشید عالم عبد السلام سلفؔی حفظہ اللہ نے ترتیب دیا ہے۔ اللہ رب العزت کا شکر و احسان ہے کہ مذکورہ کتاب کی نشر واشاعت کا شرف **”مكتبة السلام“** کو حاصل ہو رہا ہے۔ ہم نے اس کتاب کو صوری و معنوی ہر اعتبار سے بہتر اور نفع بخش بنانے کی پوری کوشش کی ہے، اس کے لیے عام فہم اسلوب اور آسان زبان استعمال کی گئی ہے نیز احادیث کی تشریح و وضاحت خالص کتاب و سنت کی روشنی میں کی گئی ہے، تاہم ہم اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہیں اس کا فیصلہ قارئینِ کرام اور اہلِ علم ہی فرمائیں گے۔

دعا ہے کہ اللہ رب العالمین کتاب کو قبولیتِ عام عطا فرما کر اسے نفع بخش بنائے، عوام الناس اور طلبہ و طالبات کو اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے اور اسے مؤلف، مترجم و شارح، مراجعین، ناشر اور دیگر سبھی معاونین کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین! وصلى الله علىٰ نبيه الكريم

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خادم کتاب و سنت

محبوب عالم عبد السلام سلفؔی

مدیر: ”مكتبة السلام“ انتری بازار، شہرت گڑھ، سدھارتھ نگر، یوپی، انڈیا

۲۵ / اپریل ۲۰۲۳ء

تقریظ

(فضیلۃ الشیخ وصی اللہ عبد الحکیم مدنیؔ)

استاد حدیث کلیہ عائشہ صدیقہ للبنات کرشنا نگر، نیپال

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين والصلاة والسلام علىٰ أشرف الأنبياء والمرسلين محمد بن عبد الله الأمين وعلىٰ آله الطيبين وأصحابه الطاهرين ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين، أمابعد :

کتاب و حکمت یعنی قرآن کریم اور صحیح احادیثِ نبویہ دونوں ہی ہماری شریعتِ اسلامیہ کا بنیادی ماخذ اور مصدر ہیں، حجت و اعتبار اور اطاعت و انقیاد میں دونوں یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ محدثینِ کرام رحمہم اللہ نے احادیثِ رسول کی مختلف پہلوؤں سے قابل رشک اور بے نظیر خدمات سر انجام دی ہیں۔ اَربعین نویسی بھی خدمتِ حدیثِ نبوی کا ایک روشن و مستقل باب ہے۔ محدث شہیر امام عبد اللہ بن مبارک مروزی رحمہ اللہ (وفات:181ھ) کو اَربعین نویسی میں شرفِ اولیت کی سعادت حاصل ہے۔ ان کے بعد بہت سارے علماء اور ائمۂ کرام نے مختلف موضوعات پر مشتمل اربعین کے سینکڑوں مجموعے مرتب کیے۔ ساتویں صدی ہجری کے ایک نامور محدث، بلند پایہ فقیہ، عابد و زاہد اور کئی مستند و معتبر کتابوں کے مؤلف امام ابو زکریا یحییٰ بن شرف نووی دمشقی رحمہ اللہ (631-676ھ) نے بھی ایک عطر بیز گلدستۂ حدیث بنام "**الأربعين في مباني الإسلام و قواعد الأحكام**" مرتب فرمائی، جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ مؤلف کتاب کے اخلاص و للّٰہیت اور نیک نیتی کے باعث سلسلۂ اربعینات کی اس سنہری کتاب کو جو شہرتِ دوام اور قبولِ خاص وعام حاصل ہوئی وہ کسی اور مجموعۂ حدیث کے حصہ میں نہیں آئی۔ اس کی جامعیت اور افادیت کے پیشِ نظر ہر دور کے اہلِ علم حضرات نے دنیا کے مختلف زندہ زبانوں میں اس کے تراجم، شروح، حواشی، تعلیقات، منظومات اور اس کی تحقیق و تخریج کیے ہیں۔ شیخ راشد بن عامر غفیلی رحمہ اللہ (وفات:1387ھ) نے اپنی کتاب "**إتحاف الأنام بذكر جهود العلماء علىٰ الأربعين في مباني الإسلام و قواعد الأحكام**" میں ایک سو بائیس (122) شروح و حواشی اور ان کے مصنفین کے اسمائے گرامی کا ذکر کیا ہے۔ ان میں امام محمد بن علی

معروف بابن دقیق العید (وفات:699ھ) امام عبد الرحمن بن احمد رجب حنبلی (وفات:795ھ) حافظ ابن حجر عسقلانی (وفات:852ھ) علامہ احمد بن حجر ھیتمی (وفات:974ھ) علامہ عزیز زبیدی (وفات: ۲۰۰۳ء) فقیہ ملت علامہ محمد بن صالح العثیمین (وفات: 1421ھ) رحمہم اللہ نیز ڈاکٹر علامہ صالح بن فوزان الفوزان، پروفیسر سعید مجتبیٰ سعیدی اور برادرِ فاضل شیخ عبد الہادی عبد الخالق مدنی حفظہم اللہ وغیر ہم کے اسمائے گرامی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

پیشِ نظر کتاب **"ضیائے نبوی"** یگانۂ روزگار، شبِ زندہ دار، بالغ نظر محدث وفقیہ امام اَبوزکریا یحیٰ بن شرف نووی رحمہ اللہ کی بے نظیر مرتب کردہ مجموعۂ حدیث "الاَربعین" کے ترجمہ اور شرح و فوائد پر مشتمل ہے، جو میرے عزیز گرامی مولانا جمشید عالم عبد السلام سلفی سلمہ اللہ کی علمی و دعوتی کاوش ہے۔ عزیز موصوف کی متانت و سنجیدگی، خوش مزاجی و کشادہ ظرفی، زبان و قلم کی جولانی و گہرباری، روانی و شائستہ گوئی، قلب و نظر کی توانائی و تابانی کے علاوہ دینی و فقہی ذوق و بصیرت علمی حلقوں میں معروف و مسلَّم ہے۔ آپ کی کئی کتابیں منصۂ شہود پر آکر لوگوں کی رشد وہدایت ورہنمائی کا ذریعہ بن رہی ہیں اور اہلِ علم سے خراجِ تحسین بھی حاصل کر چکی ہیں۔ عام طور پر ان کی بیش تر تحریریں حشو وزائد سے پاک، سادہ و دل نشیں اور تحقیق انیق کی شاہکار ہوا کرتی ہیں۔ عزیز مکرم نے اپنی اس کتاب کو بھی اپنے مخصوص دل کش انداز اور سلیس و عام فہم تذکیری و دعوتی اسلوب میں پیش کیا ہے۔ میں نے پوری کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور الحمد للہ اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کتاب کا ترجمہ اور شرح و فوائد ادبی حسن اور روانی کا شاہکار ہے، احادیث کا ترجمہ عربی متن کے عین مطابق ہے، کتاب کے تمام مباحث و مضامین کو انتہائی محققانہ انداز میں سپرد قلم کیا گیا ہے اور اس کے لیے عام فہم سادہ اسلوب اور آسان زبان استعمال کی گئی ہے، مشکل الفاظ وتراکیب اور بوجھل و پیچیدہ جملوں سے حتی الامکان پرہیز کیا گیا ہے، شرح و فوائد میں اختصار و جامعیت کا پہلو غالب ہے، جو ہر حدیث کا معنٰی و مفہوم سمجھنے کے لیے کافی مدد و معاون ہے تاہم جہاں کہیں تفصیل کی ضرورت تھی وہاں خوب شرح و بسط سے کام لیا گیا ہے، بالخصوص ایمان و توحید، تخلیقِ جنین کے مراحل، تقدیر، حیا و حسنِ اخلاق، اور بیش تر سماجی و معاشرتی مسائل سے متعلق سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، جو قابلِ مدح وستائش اور لائقِ مطالعہ ہے۔ میری نظر میں یہ کتاب "مشک

آں است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" کی مصداق ہے۔

پیشِ نظر کتاب کی تالیف کا مقصد وحید رضائے الٰہی کا حصول، خدامِ حدیث کی صفوں میں شمولیت اور بشارتِ نبوی "نضرالله عبدا سمع مقالتي ...." کی تلاش وجستجو ہے۔ جس کی ترجمانی عربی زبان کے معروف شاعر ابوالعباس العزفی (وفات: 633ھ) نے یوں کی ہے:

أَهْلُ الْحَدِيْثِ عِصَابَةُ الْحَقِّ فَازُوا بِدَعْوَةِ سَيِّدِ الْخَلْقِ
فَوُجُوْهُهُمْ زُهْـرٌ مُنَضَّرَةٌ لَأْلَاؤُهَا كَتَأَلُّقِ الْبَـرْقِ
يَا لَيْتَنِيْ مَعَهُمْ فَيُدْرِكَنِيْ مَا أَدْرَكُوهُ بِهَا مِنَ السَّبْقِ

ترجمہ: "اہل الحدیث برحق جماعت ہیں، جنھوں نے سید الخلائق کی دعا کی کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کے چہرے نہایت ہی منور اور پُر رونق ہیں، جو بجلی کی طرح چمکتے ہیں۔ کاش میں بھی حدیث والوں کے ساتھ ہوتا جو سبقت وفضیلت انھیں حاصل ہے مجھے بھی حاصل ہوتی۔"

فاضل مرتب کی قلبی خواہش پر میں نے ان کی اس تالیفِ لطیف کو حرفاً حرفاً انتہائی دقت وباریک بینی سے پڑھا ہے اور جہاں کہیں اصلاح و اضافہ کی ضرورت محسوس کی ہے وہاں اپنی رائے پیش کی ہے، جسے فاضل موصوف نے نہایت فراخ دلی و کلمۂ تشکر کے ساتھ قبول کیا ہے۔ فجزاه الله أحسن الجزاء

میرے نزدیک اس کتاب کی بعض نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

◙ ہر حدیث کی دل کش وجاذب نظر معنیٰ خیز اور موزوں عنوان بندی کی گئی ہے۔

◙ ہر حدیث کی ترقیم و متنِ حدیث نئے صفحہ پر دائیں جانب لکھا گیا ہے اور اردو ترجمہ اسی کے بالمقابل بائیں جانب رکھا گیا ہے تاکہ حدیث کے الفاظ کو پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہو۔

◙ ترجمہ اور شرح کی زبان شستہ، سلیس، بامحاورہ، عام فہم اور صاف ہے۔ نگارشِ تحریر دل آویز، شگفتہ اور مؤثر ہے۔

◙ بعض احادیث کے مشکل الفاظ کی مختصر تشریح اور وضاحت کی گئی ہے۔

◙ "**شرح وفوائد**" کے عنوان سے ہر حدیث کی جامع انداز میں شرح کی گئی ہے اور جو مباحث و مسائل مزید تفصیل اور توضیح کے محتاج تھے، اُنھیں قدرے تفصیل سے مدلل قلم بند کیا گیا ہے۔

◙ پوری کتاب میں وارد احادیث کی مختصر تخریج اور غیر صحیحین احادیث کی صحت پر محدث عصر و

فقیہ دہر علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ (وفات:1420ھ) اور ماہر علومِ حدیث شیخ حافظ زبیر علی زئی (وفات: 1435ھ) رحمہا اللہ کی تحقیقات وافادات پر اعتماد کیا گیا ہے۔

◙ اربعین نووی کے تمام راویانِ حدیث کا مختصر اور جامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔

◙ پوری کتاب میں کہیں بھی کسی ضعیف حدیث سے استدلال نہیں کیا گیا ہے۔

کتاب معنوی وعلمی خوبیوں کے علاوہ ظاہری محاسن سے بھی آراستہ ہے۔ میری نظر میں زیرِ نظر شرح اردو زبان میں پائی جانے والی شروحات میں ممتاز، بہترین اور عمدہ شرح ہے۔ اللہ رب العزت اس کتاب کو بھی اصل کتاب کی طرح دنیا میں قبولیت اور شہرت عطا فرما کر مفید اور نفع بخش بنائے اور مؤلف وشارح سمیت تمام معاونین کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین!

فاضل مترجم وشارح شیخ عزیز مولانا جمشید عالم عبد السلام سلفیؔ کو میں اس عظیم خدمتِ حدیثِ نبوی پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی انھیں مزید علمی ودعوتی اور تصنیفی خدمات سر انجام دینے کی توفیق ارزانی عطا کرے اور ہم سب کو علم وعمل کے زیور سے آراستہ فرمائے۔ آمین! تقبل یارب العالمین! امید کہ قارئینِ کرام "**مكتبة السلام**" کی جانب سے اس حدیثی پیش کش کو شرفِ قبولیت سے نوازیں گے۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد!

وصلى الله علىٰ عبده ورسوله محمد وعلىٰ آله وصحبه وسلم تسليماً كثيراً

خادم جماعت وجمعیت

وصی اللہ عبد الحکیم مدنیؔ

ناظم ضلعی جمعیت اہلِ حدیث، سدھارتھ نگر، یوپی

استاد حدیث کلیۃ عائشہ صدیقہ للبنات کرشنا نگر

وجامعہ سراج العلوم السلفیہ، جھنڈا نگر، نیپال

Wasimadni50@gmail.com

۲۲/۰۴/۲۰۲۳ء

مقدمہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ، نَحْمَدُهُ، وَنَسْتَعِينُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا، وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ.

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران : ١٠٢) ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ (النساء : ١) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا﴾ (الأحزاب : ٧٠-٧١)

أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ، وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ، وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ.

قرآن کریم میں اللہ رب العالمین کا ارشاد ہے:

﴿لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُواْ ٱللَّهَ وَٱلْيَوْمَ ٱلْآخِرَ وَذَكَرَ ٱللَّهَ كَثِيرًا﴾ ”یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول میں ہمیشہ سے اچھا نمونہ ہے، اس کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہو۔“ [الأحزاب : ٢١]

زندگی کے ہر شعبے میں نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی، آپ کے اقوال وافعال اور احوال مسلمانوں کے لیے عمدہ نمونہ ہیں، جن کی اقتدا و پیروی کرنا واجب ہے اور زندگی کے کسی بھی معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنے سے گریز کرنا اور صحیح احادیثِ رسول سے منہ پھیرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے لیے آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے محبت وعقیدت رکھنا اور آپ کے جملہ احکام و فرامین کی اطاعت و فرماں برداری کرنا اور آپ کے تمام افعال واحوال و تقریرات کی پیروی کرنا شریعتِ

اسلامیہ کا بنیادی رکن اور نجاتِ اُخروی کی کامیابی کی لازمی شرط ہے۔ اللہ رب العالمین کی کتاب قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی اور دینِ اسلام کی اصل بنیاد ہیں، ان دونوں کو مضبوطی سے تھامنے ہی میں ہر طرح کی بھلائی اور کامیابی ہے اور جو کوئی بھی مسلمان خلوصِ نیت اور یقینِ قلب کے ساتھ ان پر عمل کرے گا وہ کبھی گمراہ نہیں ہو گا، جیسا کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ، لَنْ تَضِلُّوا مَا مَسَكْتُمْ بِهِمَا : كِتَابَ اللَّهِ، وَسُنَّةَ نَبِيِّهِ)) ''میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے ہر گز گمراہ نہیں ہو گے: اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔'' [موطأ امام مالک:۲۶۱۸]

اس حدیث کو اگرچہ امام مالک رحمہ اللہ نے کسی سند کے بغیر معلقاً روایت کیا ہے، مگر اس حدیث کی بہت سی شواہد موجود ہیں اور یہ حدیثِ نبوی محدثینِ کرام رحمہم اللہ کے یہاں اس قدر مشہور و معروف اور محفوظ ہے کہ اسناد کے ذکر سے بے نیاز ہے۔ یہ حدیث الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر کئی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے، جن سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کی ہوئی حدیث کو مزید تقویت ملتی ہے۔ اس قبیل کی چند روایتیں حسب ذیل ہیں:

▪ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا: ''شیطان مایوس ہو گیا ہے کہ تمھاری سرزمین میں اس کی عبادت کی جائے، لیکن وہ اس بات سے خوش ہے کہ اس کے سوا ان اعمال میں اس کی پیروی کی جائے گی جنھیں تم حقیر سمجھتے ہو، سوائے لوگو! چوکنا ہو جاؤ: ((إِنِّي قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ فَلَنْ تَضِلُّوا أَبَدًا : كِتَابَ اللَّهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ...)) ''بے شک میں تم میں وہ چیز چھوڑے جارہا ہوں، جسے اگر تم لوگ مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو تم کبھی بھی گمراہ نہیں ہو گے: اللہ کی کتاب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت...'' [المستدرك للحاكم : ۳۱۸، السنن الكبرى للبيهقي : ۲۰۸۳۸. اس حدیث کی سند کو ابن القیم نے تهذيب السنن (۲۷۹/۷) میں، ابن العربی نے أحكام القرآن (۲۵۰/٤) میں اور شیخ البانی نے صحيح الترغيب والترهيب (برقم : ٤٠) میں صحیح قرار دیا ہے۔]

▫ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((...وَمَا عَطَّلُوا كِتَابَ اللهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِه، إِلَّا جَعَلَ اللَّهُ بأسَهُمْ بَيْنَهُمْ)) "...اور جو لوگ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو چھوڑ دیں گے تو اللہ ان کے درمیان اختلاف پیدا کر دے گا۔" [شُعب الإيمان للبيهقي : ۳۳۱۵، علامہ البانی نے صحيح الترغيب والترهيب : ۲۱۸۷ میں اسے صحیح لغیرہ قرار دیا ہے۔]

▫ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنِّي قَدْ خلَّفْتُ فِيكُمْ شيئَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا بَعدَهُمَا أبدًا مَا أخَذْتُم بِهِمَا، أَوْ عَمِلْتُمْ بِهِمَا : كِتَابَ اللَّهِ، وسُنَّتِي، وَلَنْ يَّتَفَرَّقَا حَتَّى يَرِدَا علَيَّ الْحَوْضَ)) "بے شک میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم ان دونوں کو تھامے رہو گے یا ان دونوں پر عمل کرتے رہو گے کبھی گمراہ نہیں ہو گے: اللہ کی کتاب اور میری سنت، یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ یہ دونوں حوضِ کوثر پر میرے پاس آئیں گے۔" [أخرجه البزّار : ۸۹۹۳ واللفظ له، والدارقطني : ۴/ ۲۴۵، والحاكم : ۴۳۲۱ علامہ ابن حزم نے الإحكام في أصول الأحكام (۲/ ۲۵۱) میں اور علامہ البانی نے صحيح الجامع الصغير وزيادته : ۳۲۳۲ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔]

تمام امور و معاملات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا، سنت کے مطابق چلنا اور بدعات سے بچنا جہاں واجب ہے وہیں یہ دخولِ جنت کا موجب بھی ہے، چناں چہ جو کوئی سنت کی پیروی نہیں کرتا اور نبوی احکام و فرامین کی نافرمانی کرتا ہے، گویا وہ زبانِ حال سے جنت میں داخل ہونے سے انکار کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرنا اور سنت سے اعراض کرنا حرام ہے اور یہ دخولِ جہنم کا سبب ہے، جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى. قَالُوا : يَا رَسُوْلَ اللَّهِ! وَمَنْ يَأْبَى؟ قَالَ : مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى)) "میری پوری امت جنت میں داخل ہو گی سوائے اس شخص کے جس نے انکار کیا۔" صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کس نے انکار کیا؟ آپ نے فرمایا: "جس شخص نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کر دیا۔" [صحیح بخاری: ۷۲۸۰]

جو لوگ باطل تاویلات کا سہارا لے کر رسول اللہ ﷺ کی ثابت شدہ حدیثوں کا انکار کرتے ہیں یا صحیح حدیث کی حجیت کو تسلیم نہیں کرتے ہیں اُنھیں اس حدیث کی روشنی میں اپنے انجامِ بد کے بارے میں ضرور غور کرنا چاہیے!! کیوں کہ اس حدیث میں جان بوجھ کر صحیح حدیث کا انکار کرنے، سنت کی مخالفت کرنے اور اس سے اعراض کرنے کو جنت سے محرومی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

یہ مذہبِ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے کہ خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے مکمل حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ آپ کے اقوال و افعال اور تقاریر بھی محفوظ ہیں۔ واقعاتی طور پر محدثینِ کرام رحمہم اللہ کی متبرک و مقدس گروہ نے اپنی بے مثال کاوش و محنت سے حدیث کی حفاظت کا وہ عظیم الشان کارنامہ سر انجام دیا ہے کہ جس کی نظیر مذاہبِ عالم کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے اور پھر رسول کریم ﷺ کی احادیث محفوظ کیوں نہ ہوں جب کہ قرآن کریم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ احادیثِ رسول کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ربِ کائنات نے خود لی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ ''بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔'' [الحجر:۹]

آیتِ کریمہ میں **الذِّكْر** سے مراد قرآن کریم ہے، جس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے لی ہے، لیکن یہاں غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ اس کے لیے لفظِ ''قرآن'' کے بجائے اللہ نے **الذِّكْر** کا لفظ ارشاد فرمایا ہے، جس کے لغوی معنیٰ یاد دہانی اور نصیحت کے ہیں، اس اعتبار سے اس سے مراد اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی تمام امور وحی ہو گی یعنی اس سے مراد اللہ کی کتاب قرآن کریم اور وہ شرعی احکام ہوں گے، جنھیں اللہ نے رسول کریم ﷺ کو اپنی جانب سے عطا فرمایا، جنھیں ہم حدیث یا سنت کہتے ہیں اور یہ معلوم بات ہے کہ قرآن کریم کو حدیثِ رسول کے بغیر سمجھنا اور اس پر عمل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، لہٰذا قرآن کریم کی حفاظت کے مفہوم میں حدیثِ رسول کی حفاظت بھی شامل ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف قرآنِ کریم کی حفاظت کا ہی ذمہ نہیں لیا ہے، بلکہ اس کے معانی و مطالب یعنی احادیثِ رسول ﷺ کی حفاظت کا بھی ذمہ لے رکھا ہے۔

قرآنی آیات واحکام کی طرح نبی کریم ﷺ کی صحیح احادیثِ مبارکہ بھی مستقل طور پر حجت ہیں،

ان کی اتباع و فرماں برداری اور ان کے مطابق عمل کی فرضیت میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، دونوں آپس میں ایک دوسرے کی مؤید ہیں اور ان کے مابین کوئی تعارض بھی نہیں ہے، حجت و عمل کے سلسلے میں ان کے درمیان تفریق کرنا اور دونوں میں سے کسی ایک کی حجیت کا انکار کرنا یا قرآن کریم کو سنت و حدیث کے بغیر سمجھنے کا دعویٰ کرنا گمراہی کی علامت اور اہلِ ہوس و بدعت کا شیوہ ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ حدیثِ نبوی میں اگر کوئی اضافی حکم ہے تو وہ بھی بنفسہ حجت ہے اور مستقل طور پر حدیث سے بھی فرضیت و حرمت ثابت ہوتی ہے۔ سیدنا مقداد بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَلَا إِنِّي أُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ، أَلَا يُوشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانٌ عَلَى أَرِيْكَتِهِ يَقُولُ : عَلَيْكُمْ بِهَذَا الْقُرْآنِ فَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَلَالٍ فَأَحِلُّوهُ، وَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوهُ، وَإِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُولُ اللَّهِ كَمَا حَرَّمَ اللَّهُ)) ”سن لو! مجھے قرآن اور اس کے ساتھ اس کے مثل عطا کی گئی ہے۔ آگاہ رہو! قریب ہے کہ کوئی شکم سیر شخص اپنی مسند پر یوں کہے گا: تم اس قرآن کو لازم پکڑو اور تم جو چیز اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو چیز اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ یقیناً اللہ کے رسول نے جس چیز کو حرام قرار دیا ہے وہ اللہ کے حرام قرار دینے کی طرح ہے۔“ [سندہ صحیح / سنن أبو داود: ۴۶۰۴، سنن ابن ماجہ: ۱۲، سنن دارمی: ۶۰۶]

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں صرف کتاب اللہ پر اکتفا کر کے عمل بالحدیث سے اعراض کرنے اور سنت کو ترک کرنے پر تنبیہ فرمائی ہے اور اپنی ناراضی کا اظہار فرمایا ہے تو عام امتی کے آراء و خیال کو حدیثِ نبوی پر ترجیح دینا کیوں کر درست ہو گا؟ حدیث سے بے اعتنائی کی ایک صورت یہ بھی ہے، جو کہ ہمارے اس دور میں بعض الناس کے یہاں بہت عام و معروف ہے۔

مذکورہ بالا حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش گوئی فرمائی ہے کہ اس امت میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے، جو صرف قرآن کو فیصل و حجت بنائیں گے اور حدیث کا انکار کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی کہ بہت سے لوگ انکارِ حدیث کے مرتکب ہوئے ہیں اور صرف قرآن کے حجت ہونے کے دعوے دار ہیں اور ایک زمانے سے یہ منکرینِ حدیث ”اہلِ قرآن“ کے نام سے وہی کچھ کر رہے ہیں، جس کی خبر حدیث میں دی گئی ہے۔ ماضی قریب میں فرقہ ”اہل قرآن“ کا سرغنہ و سردار

عبد اللہ چکڑالوی نامی منکرِ حدیث اس حدیث کا مصداق ثابت ہوا ہے، وہ بھی تخت پر بیٹھ کر حدیثِ نبوی کے بارے میں کہتا تھا کہ میں حدیث کو نہیں مانتا قرآن مجید سے مجھے مسئلہ دکھاؤ۔

پوری اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے خوارج نے صرف قرآن کو ماننے کا دعویٰ کر کے صحیح احادیث کا انکار کیا اور پھر ان کی تقلید کرتے ہوئے روافض، معتزلہ، جہمیہ اور منکرینِ حدیث نے بھی صحیح احادیث کی حجیت کا انکار کیا اور قرآن کو حدیثِ رسول کے بغیر سمجھنے کا زبانِ حال سے دعویٰ کیا اور حدیث کو قرآن پر پیش کرنے کا باطل قاعدہ وضع کر کے مختلف حیلہ و بہانہ کے ذریعہ ثابت شدہ صحیح حدیثوں کا انکار کیا۔ انکارِ حدیث کے تعلق سے ماضی میں اور موجودہ دور میں منکرینِ حدیث کی جماعت نبی کریم ﷺ کی مذکورہ بالا پیش گوئی کا زندہ ثبوت ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حدیثِ نبوی کے انکار یا استخفاف کے نت نئے طریقے ایجاد ہوتے رہے ہیں اور دورِ حاضر میں بہت سے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو بظاہر حدیث کی حجیت کو تو تسلیم کرتے ہیں، مگر جو حدیث ان کی خود ساختہ عقل و درایت کے خلاف معلوم ہوتی ہے بلا جھجھک اس کا انکار کر بیٹھتے ہیں یا کسی حدیثی اصول و ضابطہ کے بغیر محض اپنے عقل و فہم کو فیصل مان کر ثابت شدہ صحیح احادیثِ آحاد کو قرآن کریم کے خلاف قرار دے کر ان کا انکار کر دیتے ہیں۔ یہ بیماری عام پڑھے لکھے لوگوں میں بھی پھیلتی جارہی ہے، جب کہ اس طرح کی گمراہی سے بچنا بے حد ضروری ہے۔

لوگوں کا عجب طرزِ استدلال ہے کہ دنیا جہان کے لوگوں کے کلام کو بطور استشہاد و استدلال پیش کرتے ہیں، مگر حدیث سے حجت پکڑنا اور اس کی روشنی میں الٰہی فرامین کو سمجھنا انھیں ناگوار گزرتا ہے، جب کہ قرآن کریم کو حدیثِ نبوی کی روشنی میں سمجھنا واجب ہے اور حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ حدیثِ رسول کی مدد کے بغیر قرآن کو نہ سمجھا جاسکتا ہے اور نہ اس کی تفسیر و تشریح کی جاسکتی ہے۔ قرآن کریم جہاں وحی جلی اور وحی متلو ہے، وہیں حدیثِ رسول وحی خفی اور وحی غیر متلو ہے اور احادیث کا انکار قرآن کا انکار ہے، کیوں کہ خود قرآن میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت اور نبی کے شرعی احکام کو وحیِ الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے :

﴿مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۖ وَمَن تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا﴾

”جو رسول کی فرماں برداری کرے تو بے شک اس نے اللہ کی فرماں برداری کی اور جس نے منہ موڑا تو ہم

نے تجھے ان پر کوئی نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔" [النساء:۸۰]

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ﴾ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کا حکم مانو اور اس رسول کا حکم مانو اور اپنے اعمال باطل مت کرو۔" [محمد:۳۳]

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۞ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ "اور نہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں۔ وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔" [النجم:۳-۴]

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ "اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔" [الحشر:۷]

جو لوگ احادیث کو حجت نہیں مانتے اور رسول کی اطاعت کو تسلیم نہیں کرتے ہیں انھیں خوف کھانا چاہیے کہ صرف ایک معاملے میں رسول کی اطاعت نہ کرنے پر قرآن کریم میں یہ وعید سنائی گئی ہے :

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ "پس جو لوگ اس (یعنی رسول) کا حکم ماننے سے پیچھے رہتے ہیں لازم ہے کہ وہ لوگ ڈریں کہ انھیں کوئی فتنہ آ پہنچے یا انھیں دردناک عذاب آ پہنچے۔" [النور:۶۳]

قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ شریعتِ اسلامیہ کے بنیادی مآخذ ہیں اور حجت و عمل کے اعتبار سے قرآن اور حدیث کے مابین کوئی فرق بھی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ دورِ نبوی ہی سے شریعتِ اسلامیہ کے ان دونوں مآخذ کی خوب خوب حفاظت کی گئی ہے، چناں چہ محدثینِ کرام رحمہم اللہ کی متبرک جماعت نے قرآن کریم کے ساتھ ساتھ احادیثِ رسول کی تدوین و حفاظت کی جانب بھی بھرپور توجہ دی اور اس کے لیے اپنی پوری توانائی اور زندگی کے قیمتی ماہ و سال کو صرف کر کے عملی طور پر رسول اللہ ﷺ کی سنت و حدیث کو ہر طرح سے محفوظ کر دیا۔ انھوں نے ہمہ جہت پہلوؤں سے احادیثِ رسول کو محفوظ کرنے کے لیے بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں، احادیث کی چھان پھٹک اور اس کی صحت و ضعف کو جانچنے کے لیے مستقل طور پر "علوم الحدیث" اور "علم اسماء الرجال" کا فن ایجاد کیا اور اس کے تحت مختلف راویانِ حدیث کا مکمل تعارف اور پوری امانت و دیانت کے ساتھ ان کا بایو ڈاٹا تیار کر دیا تاکہ اچھی طرح سے

احادیث کی جانچ پڑتال کی جاسکے اور کسی دوسرے کے کلام کو حدیثِ نبوی نہ قرار دیا جاسکے۔

محدثینِ کرام رحمہم اللہ نے حدیثِ نبوی کی جمع و تدوین کے علاوہ تحقیق و تخریج اور فقہ الحدیث پر بھی کافی کام کیا ہے۔ صحاح، سنن، مسانید، معاجم، مصنفات، جوامع، مسلسلات اور اجزاء وغیرہ کے نام سے متعدد کتابوں میں مختلف موضوعات پر حدیثیں جمع کی ہیں اور ان کی شروحات بھی تیار کی ہیں، مجموعات و خدماتِ حدیث کے سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی ''اَربعین نویسی'' کی بھی ہے، جو خدماتِ حدیث کے تئیں ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ سب سے پہلے امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے اربعین مرتب کرنے کی سعادت حاصل کی اور پھر اس کے بعد مختلف موضوعات پر متعدد علمائے حدیث کی جانب سے سینکڑوں مجموعے مرتب ہوئے اور ان کی شروحات بھی تیار ہوئیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ سلسلۂ اربعینات کی ایک اہم کڑی امام نووی رحمہ اللہ کی ''اَربعین نووی'' بھی ہے، جو تمام اربعینات میں ممتاز و نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ اسی شہرہ آفاق کتاب کے ترجمہ و شرح کی سعادت راقم آثم کو حاصل ہو رہی ہے۔ اَربعین نووی کے متعلق مزید گفتگو کرنے سے پہلے اس کے مؤلف اور ساتویں صدی ہجری کے عظیم المرتبت محدث وفقیہ اور امام و مجتہد علامہ نووی رحمہ اللہ کا مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے:

امام نووی رحمہ اللہ کی کنیت ابو زکریا اور لقب محی الدین ہے، نام و نسب کی مختصر تفصیل اس طرح ہے: یحییٰ بن شرف بن مُرِّی بن حسن بن حسین بن محمد بن جمعہ بن حِزام۔ آپ کی ولادت ماہِ محرم الحرام کے درمیانی عشرے میں ۶۳۱ھ مطابق ۱۲۳۳ء میں دمشق کے علاقے حوران سے متصل ''نویٰ'' نامی بستی میں ہوئی اور جائے پیدائش ''نویٰ'' ہونے کی وجہ سے آپ نووی کہلائے۔ آپ کے آباو اجداد حِزام سے ہجرت کرکے یہاں آباد ہوگئے تھے، اس لیے حزامی بھی کہلائے نیز شافعی المسلک ہونے کی وجہ سے شافعی کہلائے، تاہم آپ کے اندر مذہبی تعصب نہیں تھا، بلکہ آپ محقق و مجتہد تھے اور ہر مسئلے میں کتاب و سنت کو ترجیح دیتے تھے، جیسا کہ آپ کی تمام تصنیفات میں دیکھا جاسکتا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ بچپن ہی سے حصولِ علم کے بڑے شوقین اور نہایت ذہین و فطین تھے، بلوغت سے پہلے کم عمری ہی میں والدین کے زیرِ سایہ حفظِ قرآن کریم مکمل کر لیا اور فقہ کی بعض کتابیں بھی ان سے پڑھتے رہے۔ آپ بڑے عابد و زاہد تھے، بلکہ بچپن ہی سے زہد و ورع کی طرف کافی میلان تھا اور

والدین بھی بڑے دین دار تھے، جس کا نمایاں اثر و چھاپ آپ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ والدین نے دینی ماحول میں آپ کی پرورش کی اور جب انھوں نے آپ کی علمی لگن اور ذوق و شوق کو دیکھا تو آپ کو اُس دور کے مرکزِ علم دمشق بھیج دیا، جہاں آپ کمال الدین مغربی کے علاوہ بیسیوں مشہور اساتذہ و مشائخ سے فیض یاب ہوئے اور بڑی محنت و لگن سے حصولِ علم میں لگ گئے۔ حصولِ علم کے دور ہی میں جو کچھ اسباق پڑھتے ان کی شرح و تعلیق کا کام بھی کرتے جاتے، آپ کا بیش تر وقت مطالعۂ کتب، شرح و تعلیق اور عبادتِ الٰہی میں صرف ہوتا تھا، علم سے آپ کا یہ لگاؤ اور انہماک ضرب المثل بن گیا تھا۔

آپ نے دمشق میں پڑھنے کے بعد وہیں کے مختلف مدارس میں مسند ہائے درس کو زینت بخشی، ساتھ ہی اپنی ذوق کے مطابق تصنیف و تالیف اور فقہ و فتاویٰ کا بھی وقیع کارنامہ انجام دیا۔ زاہد و عابد اور باکمال عالم ہونے کے ساتھ بڑے نڈر اور بے باک داعی بھی تھے۔ تذکرہ نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام نووی رحمہ اللہ علم، زہد و تقویٰ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں ممتاز تھے اور یہ تینوں خصوصیتیں آپ کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ویسے تو آپ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، لغت، عربیت، نحو و صرف، منطق اور فلسفہ وغیرہ میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے اور ان تمام علوم میں جامع کمالات تھے، لیکن مختلف علوم و فنون میں کامل دسترس ہونے کے باوجود ان کی اصل دل چسپی کا مرکز و محور حدیث و فقہ تھا، حدیث و فنونِ حدیث پر گہری نظر تھی اور درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔

آپ نے دمشق کے اندر تقریباً اٹھائیس سال گزاری اور پھر اپنی جائے پیدائش مقامِ نویٰ میں ۶۷۶ھ میں واپس ہوئے اور وہاں کچھ عرصہ بیمار رہ کر اسی سال یعنی ۲۴ رجب المرجب ۶۷۶ھ مطابق ۱۲۷۷ء میں فوت ہوئے۔ زندگی میں دو مرتبہ حج کی سعادت سے فیض یاب ہوئے۔ آپ نے پینتالیس سال کی مختصر عمر پائی، لیکن اپنی تصنیف و تالیف، تقویٰ و طہارت، خلوص و للّٰہیت اور بے لوث علمی و حدیثی خدمات کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید ہو گئے۔ مختلف علوم و فنون میں آپ کی تقریباً اٹھائیس تالیفات موجود ہیں، مگر ان میں : **التبیان فی آداب حملة القرآن، المنهاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج، ریاض الصالحین من کلام سید المرسلین ﷺ، الأذکار المنتخبة من کلام سید الأبرار ﷺ، الأربعین فی مبانی الإسلام وقواعد الأحکام، التقریب والتفسیر**

لمعرفة سنن البشير النذير ﷺ، المجموع شرح المهذب للشيرازی، منهاج الطالبين، تهذيب الأسماء واللغات اور **بستان العارفين** وغیرہ کافی مقبول ومشہور ہیں۔

امام نووی رحمہ اللہ کی ''ریاض الصالحین'' اور ''الأربعین'' اہلِ علم کے یہاں معروف و متداول تو ہیں ہی، عوامی حلقے میں بھی انھیں زبردست شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اربعینات میں اربعین نووی کو جو مقام و مرتبہ، مقبولیت اور شہرتِ دوام حاصل ہوئی وہ اس باب میں کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ اس کی بنیادی وجہ شاید امام نووی رحمہ اللہ کا خلوص و تقویٰ ہے اور پھر آپ سے پیش تر اربعینات کے مرتبین نے خاص موضوعات پر اربعین تیار کیا تھا، چناں چہ بعض نے توحیدِ الٰہی سے متعلق اور بعض نے اصول و مہماتِ دین سے متعلق، بعض نے جہاد سے متعلق اور بعض نے زہد و مواعظ اور بعض نے آداب واخلاق اور فضائل و اعمال وغیرہ سے متعلق چالیس حدیثوں کو جمع کیا ہے اور ان کے بالمقابل امام نووی رحمہ اللہ نے اپنی اربعین میں مذکورہ تمام امور کا لحاظ رکھا ہے، اس لیے ان کا یہ مجموعہ انتہائی جامع اور گوناگوں اغراض و مقاصد کا حامل ہو گیا۔ خود امام نووی رحمہ اللہ نے اربعین کے اپنے مقدمہ میں اس بات کی صراحت کر رکھی ہے، جسے عنقریب آیندہ صفحات میں آپ پڑھیں گے۔

یہ امام نووی رحمہ اللہ کی حسنِ نیت، اخلاص اور جذبۂ خیر خواہی کا ثمرہ ہے کہ ان کی اس تالیفِ لطیف کو علماء اور عوام دونوں میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی اور پوری دنیا میں یہ کتاب پھیل گئی، مساجد اور قابلِ ذکر لائبریریوں کی زینت بنی اور مدارسِ دینیہ کے نصاب کا حصہ قرار پائی، بالخصوص اکابر اہلِ علم کے یہاں اسے خاصی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، جس کا زندہ ثبوت اس کی بے شمار شروحات ہیں، عربی زبان کے علاوہ مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اور اس کی شرحیں لکھی گئیں، اردو زبان میں بھی اس کی کئی مختصر و مطول شرحیں لکھی گئی ہیں، غرض کہ اَربعین نووی کی شروحات کی فہرست کافی طویل ہے، جو اس کے مقبولِ عام ہونے کی واضح دلیل ہے۔

''اَربعین نووی'' کی سب سے اہم اور امتیازی خصوصیت مجموعۂ احادیث میں سے احادیث کا حسنِ انتخاب اور جامعیت ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اُن چنندہ احادیث کا انتخاب کیا ہے، جو ''جوامع الکلم'' پر مشتمل ہیں اور ''اساسِ دین'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ محدثینِ کرام نے ان کی منتخب کی ہوئی حدیثوں میں

سے بعض احادیث کو نصف دین، بعض کو ایک تہائی دین اور بعض کو ایک چوتھائی دین قرار دیا ہے یعنی ایک ہی حدیث میں نصف دین یا ایک تہائی دین یا ایک چوتھائی دین سمو دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ منتخب احادیث اتنی اہم ہیں کہ اُن کی فہم و معرفت ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور طالبانِ علومِ نبوت کے لیے انھیں یاد رکھنا اور ان کے معانی و مفاہیم کو سمجھنا ازحد ضروری ہے۔

یہ منتخب حدیثیں زیادہ تر صحیحین کی ہیں اور دیگر کتبِ حدیث کی بیش تر حدیثیں صحیح یا حسن درجے کی ہیں، لیکن چند احادیث کے متعلق بعض محدثین نے جرح و تعدیل کے اصول و قواعد کی روشنی میں کلام کیا ہے، مگر ان احادیث کا صحیح یا حسن اور قابلِ حجت ہونا راجح ہے، جیسا کہ کتاب کے متعلقہ مقامات پر ان کی وضاحت کر دی گئی ہے، البتہ ستائیسویں نمبر کی دوسری حدیث اور اکتالیسویں نمبر کی حدیث سنداً ضعیف ہیں، تاہم معنوی اعتبار سے وہ بھی درست ہیں۔

اربعین، چالیس کو کہتے ہیں، لیکن اربعین نووی میں بیالیس احادیث ہیں اور ستائیسویں حدیث کے تحت ایک اور حدیث ذکر کی گئی ہے، اس اعتبار سے اربعین نووی میں کل تینتالیس حدیثیں ہیں، اس لیے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے اربعین کا نام کیوں دیا گیا؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: چوں کہ اہلِ عرب کسی بھی دسویں عدد کے قریب ہونے پر پورا عدد بول لیتے ہیں اور کسر کا اعتبار نہیں کرتے ہیں، مثلاً چالیس سے ایک یا دو عدد کم ہو اور ایک یا دو عدد زیادہ ہو تو اسے چالیس کہہ دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام نووی رحمہ اللہ نے بیالیس یا تینتالیس حدیثیں ہونے کے باوجود اسے اربعین کا نام دیا ہے۔

زیرِ مطالعہ کتاب **"ضیائے نبوی"** بھی مذکورہ سلسلۂ شروحاتِ اربعین کی ایک کڑی ہے، جو اربعین نووی کے اردو ترجمہ و شرح پر مشتمل ہے۔ یہ اربعین نووی کی سابقہ شروحات میں کوئی نیا اور انوکھا اضافہ نہیں ہے، بلکہ صحیح احادیث میں احادیث کو سننے، یاد کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی جو فضیلت بیان ہوئی ہے اور حاملینِ حدیث کے متعلق جو دعائے نبوی وارد ہوئی ہے محض اسی فضیلت اور اجر و ثواب کو پانے کی نیت سے یہ شرح لکھی گئی ہے۔ اللہ رب العزت اسے قبول فرمائے، اس کے نفع کو عام کرے اور اسے اپنی ذات کے لیے خالص بنائے۔ آمین!

خاص دینی مصلحت و ضرورت کے تحت میں نے بھی اپنی جانب سے اس میں دو حدیثوں کا اضافہ

کرکے اس کی شرح پیش کی ہے، جن میں سے ایک حدیث کا تعلق مرنے کے بعد جاری رہنے والے اعمالِ صالحہ سے ہے اور دوسرے کا تعلق حاملینِ حدیث کی فضیلت و اہمیت سے ہے۔ اس اضافہ کا مقصد فقط یہ ہے کہ ان دونوں احادیث میں بیان ہوئے مضمون کی جانب لوگ خصوصی توجہ دیں، ہمارے دور میں بیش تر لوگوں کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ انھیں اپنی دنیا بنانے کی فکر تو ہے، مگر آخرت سے غافل ہیں اور دینی علوم کو حاصل کرنے اور احادیث کے پڑھنے پڑھانے کو عبث ولایعنی کام تصور کرتے ہیں۔

اربعین نووی کی احادیث کا ترجمہ اور ان سے مستنبط ہونے والے احکام و مسائل کو آسان و عام فہم اسلوب اور جامع انداز میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے اور ہر حدیث کے مفہوم کو واضح کرنے کی جانب خصوصی توجہ دی گئی ہے اور اس ضمن میں مستدل قرآنی آیات کے ترجمہ کے لیے بالغ نظر مفسر و مترجمِ قرآن حافظ عبد السلام بُھٹوی حفظہ اللہ کے ترجمہ ٔقرآن سے استفادہ کیا گیا ہے۔

احادیث سے مستنبط ہونے والے ان احکام و مسائل کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جن سے ہمارے سماج و معاشرے میں بے اعتنائی برتی جا رہی ہے یا جنھیں معمولی سمجھا جاتا ہے اور اس جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض احادیث سے متعلق گفتگو قدرے طویل ہو گئی ہے، تاہم اس سلسلے میں کوئی بھی بات دلیل کے بغیر ذکر کرنے سے حتی الامکان پرہیز کیا گیا ہے اور اس ضمن میں صرف اور صرف قرآنی آیات اور صحیح حدیثوں کو بطور دلیل و حجت پیش کیا گیا ہے اور سلفِ صالحین کے فہم و منہج کے مطابق ہی ان کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے۔ نیز شرح و فوائد کے تحت پیش کی گئی مستدل احادیث کا حکم شیخ البانی اور شیخ زبیر علی زئی رحمہا اللہ کی تحقیق کی روشنی میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بطور خاص شیخ وصی اللہ عبد الحکیم مدنی حفظہ اللہ (استاد حدیث جامعہ سراج العلوم السلفیہ جھنڈا نگر وکلیہ عائشہ صدیقہ کرشنا نگر، نیپال) کا شکر گزار ہوں کہ شیخ محترم نے پوری دقت و باریک بینی سے متن و سند کے لحاظ سے ہر ہر حدیث کی تحقیق و تفتیش اپنے طور پر کر لی ہے اور پوری کتاب میں کہیں کوئی کمی نظر آئی تو اسے درست کرکے مکمل کر دیا ہے۔ اللہ رب العالمین انھیں اس کا بہتر بدلہ عنایت فرمائے۔ آمین!

طالبانِ علومِ نبوت کو ذہن میں رکھتے ہوئے حدیث میں وارد بعض احادیث کے مشکل الفاظ کی مختصر

تشریح ووضاحت بھی پیش کی گئی ہے اور ہر حدیث کے مرکزی موضوع کی مناسبت سے ان کی عنوان بندی بھی کی گئی ہے تاکہ اس سے استفادہ کرنے میں اور سرسری طور پر کسی خاص موضوع سے متعلق جانکاری حاصل کرنے میں آسانی رہے، حالاں کہ یہ معلوم بات ہے کہ حدیث سے اور بھی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ''أربعین نووی'' کے تمام راویانِ حدیث کا مختصر اور جامع تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ راویانِ حدیث کے تعارف کی تیاری کے سلسلے میں دیگر اور کتبِ کے علاوہ بطور خاص شیخ الحدیث علامہ عبید اللہ رحمانی مبارک پوری رحمہ اللہ کی شہرہ آفاق تصنیف ''مرعاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح'' میرے سامنے رہی ہے اور میں نے زیادہ تر انھیں کی تحقیق پر اعتماد کیا ہے۔

احادیث کی تشریح ووضاحت کے سلسلے میں میرے سامنے ''أربعین نووی'' مختلف شروحات کے علاوہ بطور خاص علامہ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ کی معروف شرح ''جامع العلوم والحکم'' رہی ہے نیز امام نووی رحمہ اللہ کی ''المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج''، ماضی قریب کے عظیم محدث ومجدد علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی معرکہ آراء تصنیفِ انیق ''سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيئ من فقهها'' اور حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ کی تحقیقات وافادات بھی بطور خاص سامنے رہی ہیں۔

اربعین نووی کی ہر حدیث کی مختصر تخریج کر دی گئی ہے اور اور اس کے لیے اصل کتاب کے رقم الحدیث کا حوالہ دے دیا گیا ہے اور صحیحین کے علاوہ جن احادیث پر بعض ناقدین حدیث کی طرف سے کلام کیا گیا ہے اس پر بھی مختصر گفتگو کی گئی ہے، تاہم اس بحث کو زیادہ طول نہیں دیا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں اربعین نووی کی تمام احادیث کے مکمل عربی متن کو علاحدہ طور پر درج کر دیا گیا ہے تاکہ یاد کرنے والوں کے لیے بیک نگاہ انھیں یاد کرنے میں آسانی رہے۔

یہ اس کتاب کی چند اہم خصوصیات ہیں، جن کی رعایت پوری کتاب میں کی گئی ہے۔ اہلِ علم حضرات سے بصد خلوص واحترام گزارش ہے کہ پوری کتاب میں بشری تقاضے کے مطابق اگر کہیں کوئی خامی یا کمی نظر آئے تو اصلاح کی خاطر ناچیز کو ضرور مطلع فرمائیں تاکہ اس کی اصلاح کی جا سکے۔ اللہ آپ کو اس کا بہترین اجر عطا فرمائے گا۔

اس اہم کام کی تکمیل پر میں اللہ رب العالمین کی حمد وثناء بیان کرتا ہوں اور اس کے کرم واحسان کا

بے حد ممنون وشاکر ہوں کہ اس نے اس سعادت کی توفیق بخشی اور اپنی مدد وتوفیق سے نوازا۔ اپنے اُن احباب واخوان اور اکابرین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے اس کی تیاری میں حصہ لیا، ہر موڑ پر میرا علمی تعاون فرمایا اور کسی بھی طرح سے اس کارِ خیر میں شریک ہوئے، بالخصوص رفیقِ گرامی شیخ شفیق الرحمان ضیاءاللہ مدنیؔ، فضیلۃ الشیخ مولانا وصی اللہ عبد الحکیم مدنیؔ، محب مکرم مولانا سعود اختر عبد المنان سلفیؔ حفظہم اللہ اور عزیز مکرم حافظ محبوب عالم عبد السلام سلفیؔ سلمہ اللہ کا بصد احترام شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے اس کے نوک پلک کو سنوارا اور اپنی دیگر مشغولیات ومصروفیات کے باوجود اپنا گراں قدر وقت دے کر اول سے آخر تک بالاستیعاب پوری کتاب کا مراجعہ کیا، حسبِ ضرورت اس میں ردو بدل سے کام لیا اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر ان احباب ورفقاء کا شکریہ نہ ادا کروں جنھوں نے حسبِ استطاعت مالی تعاون سے نوازا، جس سے کتاب کو زیورِ طباعت سے آراستہ کرانے میں آسانی پیدا ہوئی۔فجزاهم الله خيرا

اللہ رب العزت ہر ایک کی محنت وکوشش اور تعاون کو قبول فرمائے، اس کتاب کو عوام وخواص کی اصلاح کا ذریعہ بنائے اور کسی بھی طرح سے اس کی اشاعت میں حصہ لینے والوں کے لیے اسے ان کی نجات کا ذریعہ اور ان کے لیے توشۂ آخرت بنائے، اللہ ہمیں کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامنے اور ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے نیز کتاب وسنت کی مخالفت کرنے سے بچائے۔ آمین!

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم. وصلى الله علىٰ نبيه الكريم. آمين! تقبل يا رب العالمين!

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

طالبِ دعا

جمشید عالم عبد السلام سلفیؔ

استاد المعہد الاسلامی انوار العلوم گنجہڑا، سدھارتھ نگر، یوپی، انڈیا، ۲۷۲۲۰۵

Contact : 9628953010 Abuafaf9@gmail.com

یکم دسمبر ۲۰۲۲ء مطابق ۷/ جُمادی الأولیٰ ۱۴۴۴ھ بروز جمعرات

مقدمہ اَربعین نووی

از : امام نووی رحمہ اللہ

ہر قسم کی تعریف دونوں جہان کے رب، آسمانوں اور زمینوں کے سنبھالنے والے، تمام مخلوقات کی تدبیر کرنے والے، مکلفین کی ہدایت ورہنمائی اور واضح وقطعی دلائل وبراہین کے ساتھ دین کے احکام کو بیان کرنے کے لیے رسولوں -ان پر درود وسلام نازل ہو- کو بھیجنے والے اللہ کے لیے ہے۔ میں اس کی تمام تر نعمتوں پر اس کی تعریف وستائش اور شکر بجالاتا ہوں اور اس کے فضل وکرم سے مزید کا طلب گار ہوں۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ یکتا وغالب، انتہائی کرم گستر اور بہت زیادہ بخشنے والے اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول اور اس کے حبیب وخلیل ہیں، مخلوق میں سب سے افضل ہیں، مرورِ ایام کے باوجود جاری رہنے والے معجزہ قرآنِ عزیز اور ہدایت حاصل کرنے والوں کے لیے روشن سنتوں بالخصوص جوامع الکلم اور آسان دین کے ذریعہ ان کی تکریم وعزت افزائی کی گئی ہے۔ آپ ﷺ پر اور تمام نبیوں ورسولوں اور ان کی آل واولاد اور تمام تر نیک بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور اس کی سلامتی نازل ہوں۔

حمد وصلاۃ کے بعد معلوم ہو کہ: علی بن ابی طالب، عبد اللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابو الدرداء، ابن عمر، ابن عباس، انس بن مالک، ابو ہریرہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے واسطے سے بہت سی سندوں اور متنوع ومختلف روایات کے ساتھ ہم تک یہ روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَن حفِظَ عَلَى أُمَّتِي أَرْبَعِينَ حَدِيْثًا مِنْ أَمْرِ دِيْنِهَا بَعَثَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي زُمْرَةِ الْفُقَهَاءِ وَالْعُلَمَاءِ)) "میری امت کے جس کسی فرد نے اپنے دین سے متعلق چالیس حدیثیں یاد کیں، اللہ اسے روزِ قیامت فقہاء اور علماء کی جماعت میں اٹھائے گا۔" ایک دوسری روایت میں ہے: **((بَعَثَهُ اللَّهُ فَقِيْهًا عَالِمًا))** "اللہ اسے فقیہ اور عالم کی حیثیت سے اٹھائے گا۔" ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: **((كُنْتُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَافِعًا وَشَهِيْدًا))** "میں روزِ قیامت اس کے لیے سفارشی اور گواہ ہوں گا۔" اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: **((قِيْلَ لَهُ ادْخُلْ مِنْ أَيِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شِئْتَ))** "اس سے

کہا جائے گا جنت کے جس دروازے سے چاہو داخل ہو جاؤ۔" اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے:
((كُتِبَ فِي زُمْرَةِ الْعُلَمَاءِ وَحُشِرَ فِي زُمْرَةِ الشُّهَدَاءِ)) "اسے علماء کے گروہ میں لکھ دیا جائے گا اور اس کا حشر شہداء کے زمرے میں ہو گا۔" (1)

حدیث کے حفاظ اور ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سندوں کی کثرت کے باوجود مذکورہ بالا روایت ضعیف ہے۔ پھر بھی اربعینات کے باب میں علمائے کرام -اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو- نے بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں، ان کی تصنیفات کو شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔ میرے علم کے مطابق اس باب میں سب سے پہلے عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے کتاب تصنیف کی ہے اور پھر اس کے بعد علی الترتیب عالم ربانی محمد بن اسلم طوسی، حسن بن سفیان نسائی، ابو بکر آجُرّی، ابو بکر بن ابراہیم اصفہانی، دار قطنی، حاکم، ابو نعیم، ابو عبد الرحمٰن سلمی، ابو سعید مالینی، ابو عثمان صابونی، عبد اللہ بن محمد انصاری، ابو بکر بیہقی وغیرہ متقدمین و متاخرین علماء میں سے بے شمار لوگوں نے اس باب میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔

مذکورہ ائمۂ کرام اور حفاظِ اسلام رحمھم اللہ کی اقتداء و پیروی کرتے ہوئے میں نے بھی چالیس حدیثیں جمع کرنے سے متعلق اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا، اس لیے کہ فضائلِ اعمال سے متعلق وارد ضعیف احادیث پر عمل کرنے کے جائز ہونے کے بارے میں اہلِ علم کا اتفاق ہے، (2) لیکن اس کے باوجود بھی

---

(1) یہ حدیث کثرتِ طُرق کے باوجود سخت ضعیف بلکہ موضوع ہے، جیسا کہ محدثِ دوراں علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس کے جملہ طرق و اسناد پر بحث و گفتگو کرتے ہوئے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ تفصیلی بحث و معلومات کے لیے دیکھیے شیخ رحمہ اللہ کتاب: **سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة وأثرها السيئ في الأمة** جلد: ۱۰ ص: ۹۷، رقم الحدیث: ۴۵۸۹

(2) فضائلِ اعمال کے باب میں ضعیف احادیث پر عمل کرنے کے جواز کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ نے علمائے کرام کے اتفاق کی جو بات کہی ہے، یہ محل نظر ہے، کیوں کہ اس سلسلے میں علمائے متقدمین و متاخرین کا اختلاف معروف ہے اور اس سلسلے میں راجح موقف یہی ہے کہ کسی حدیث کا ضعیف ہونا ثابت ہو جائے تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس سے یہ یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ نبوی فرمان نہیں ہے۔ درحقیقت احکام اور فضائل کی احادیث کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، کیوں کہ دونوں شریعت کا حصہ ہیں۔ استحباب بھی

میرا اپنا اعتماد مذکورہ بالا ضعیف حدیث پر نہیں ہے، بلکہ اس سلسلے میں میرا اعتماد صحیح احادیث میں وارد رسول اللہ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے اس فرمان پر ہے: ((لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ)) "تم میں سے حاضر لوگ غائب لوگوں تک پہنچادیں۔" (3)

نیز میرا اعتماد آپ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے اس فرمان پر ہے: ((**نَضَّرَ اللَّهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَوَعَاهَا فَأَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا**)) "اللہ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات سنی، اسے یاد کیا اور پھر جس طرح سنا تھا اسی طرح پہنچادیا۔" (4)

اربعینات تیار کرنے والے مذکورہ علمائے کرام میں سے بعض لوگوں نے اصولِ دین سے متعلق چالیس حدیثیں جمع کی ہیں تو بعض نے فروعات سے متعلق اور بعض نے جہاد سے متعلق چالیس حدیثیں

ایک شرعی حکم ہے، جس کے لیے قابلِ حجت شرعی دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کے مذکورہ بالا کلام سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بذاتِ خود ضعیف حدیث سے استدلال اور اس پر عمل کرنے کے جواز کے بارے میں مطمئن نہیں ہیں۔ بعض اہلِ علم نے چند ایسی شرائط کے ساتھ فضائلِ اعمال سے متعلق ضعیف حدیث پر عمل کرنے کو جائز قرار دیا ہے کہ فضائل سے متعلق کسی بھی ضعیف حدیث پر عمل کرتے ہوئے ان شرائط کی پابندی کرنا ممکن ہی نہیں ہے، گویا یہ شرائط اسی موقف کو تقویت دیتے ہیں کہ ضعیف احادیث پر عمل کرنا درست نہیں ہے خواہ ان کا تعلق فضائلِ اعمال ہی سے کیوں نہ ہو۔ اہلِ علم کے بیان کردہ شرائط یہ ہیں:

❶ حدیث سخت ضعیف نہ ہو۔ ❷ جس عمل کی فضیلت پر دلالت کر رہی ہو وہ کسی صحیح عمومی نص سے ثابت ہو۔ ❸ اس ضعیف حدیث پر عمل کرتے ہوئے یہ اعتقاد نہ رکھا جائے کہ یہ نبی صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے ثابت ہے۔

ضعیف احادیث پر عمل کرنے کے جواز اور عدمِ جواز سے متعلق تسلی بخش معلومات و تحقیق اور اس سلسلے میں علماء کے اختلافات کی تفصیلی معرفت کے لیے شیخ غازی عزیر حفظہ اللہ کی مایہ ناز تصنیف "ضعیف احادیث کی معرفت اور اس کا شرعی حکم" کا ضرور مطالعہ کریں۔

(3) صحیح بخاری: ۱۰۵، صحیح مسلم: ۱۶۷۹

(4) یہ حدیث معمولی فرق کے ساتھ سنن أبو داود: ۳۶۶۰، سنن ترمذی: ۲۶۵۷، ۲۶۵۸، سنن ابن ماجہ: ۲۳۱، سنن دارمی: ۲۳۴ اور مسند احمد: ۱۶۷۳۸، وغیرہ میں محولہ مقامات پر اور دیگر جگہوں میں بھی موجود ہے اور یہ حدیث "صحیح حسن" ہے۔

جمع کی ہیں، بعض نے زہد سے متعلق تو بعض نے آداب سے متعلق اور بعض نے خطبات پر مشتمل چالیس حدیثیں جمع کی ہیں اور ان تمام علمائے کرام رحمہم اللہ نے نیک وصالح مقاصد ودواعی کے تحت چالیس حدیثیں جمع کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ ان سے اور ان کے عمل وکارنامے سے راضی ہو۔

میں نے مذکورہ تمام اسلوب وطریقے سے ہٹ کر چالیس ایسی اہم ترین احادیث جمع کرنے کا ارادہ کیا ہے، جن میں مذکورہ تمام مضامین پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر حدیث دین کے قواعد میں سے ایک عظیم اصول وقاعدے پر مشتمل ہے نیز ان میں سے بیش تر احادیث کو علمائے کرام نے دینِ اسلام کا مدار یا نصف اسلام یا ایک تہائی اسلام قرار دیا ہے یا اسے کسی اہم صفت سے متصف کیا ہے وغیرہ۔

علاوہ ازیں میں ان تمام حدیثوں کے بارے میں اس بات کی پابندی کروں گا کہ وہ صحیح ہوں اور ان میں سے زیادہ تر صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث ہوں گی اور میں ان کی سندوں کو حذف کرکے بیان کروں گا تاکہ انھیں یاد کرنے میں سہولت وآسانی رہے اور اس وجہ سے اگر اللہ نے چاہا تو ان احادیث سے فائدہ اٹھانے میں کافی سہولت رہے گی، علاوہ ازیں احادیث کو بیان کرنے کے بعد مستقل باب کے تحت احادیث میں وارد مشکل الفاظ کی تشریح اور املا کی وضاحت بھی کروں گا۔ [5]

آخرت کی رغبت رکھنے والے تمام افراد کو ان احادیث اور ان میں موجود اہم ترین امور ومعلومات کی معرفت حاصل کرنی چاہیے اور تمام تر طاعات سے متعلق جو تنبیہات ان میں پائی جاتی ہیں، ان سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ غور وتدبر کرنے والوں کے لیے یہ ساری باتیں واضح ہیں۔

اللہ ہی پر میرا اعتماد وبھروسہ ہے اور میرا سب کچھ اسی کے سپرد ہے، ہر طرح کی حمد وثنا اسی کے لیے ہے اور تمام طرح کی نعمتیں اسی کی عطا کردہ ہیں نیز نیکیوں کی توفیق اور برائیوں سے اجتناب کی توفیق بھی اسی کی طرف سے ملتی ہے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

---

(5) اس کتاب میں اس باب کا ترجمہ علاحدہ طور پر شامل نہیں کیا گیا ہے، تاہم احادیث کی تعریب اور تشریح و وضاحت کرتے ہوئے اس سے کافی استفادہ کیا گیا ہے اور تقریباً ان کی بیان کردہ ساری باتیں آگئی ہیں۔

اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے

(۱) عَنْ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِيْنَ أَبِي حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : ((**إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ**))

رَوَاهُ إِمَامَا الْمُحَدِّثِينَ أَبُو عَبْدِ اللهِ مُحَمَّدُ بنُ إِسْمَاعِيلَ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ بْنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ بَرْدِزْبَهْ الْبُخَارِيُّ الْجُعْفِيُّ، وَأَبُو الْحُسَيْنِ مُسْلِمُ بْنُ الْحَجَّاجِ بْنِ مُسْلِمٍ الْقُشَيْرِيُّ النَّيْسَابُورِيُّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا فِي صَحِيْحَيْهِمَا اللَّذَيْنِ هُمَا أَصَحُّ الْكُتُبِ الْمُصَنَّفَةِ.

امیر المؤمنین ابو حفص عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے: ”بے شک عملوں کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی ہے، جس کی اس نے نیت کی ہے، پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہو گی اور جس کی ہجرت دنیا پانے کے لیے ہو یا کسی عورت سے شادی کے لیے ہو تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہو گی جس کی طرف اس نے ہجرت کی ہو گی۔“ (اس حدیث کو امام المحدثین ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ بخاری، جعفی [۱، ۵۴، ۲۵۲۹، ۳۸۹۸، ۵۰۷۰، ۶۶۸۹، ۶۹۵۳] اور امام المحدثین ابو الحسین مسلم بن حجاج بن مسلم قشیری، نیساپوری [۱۹۰۷] -اللہ ان سے راضی ہو- نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے، جو اس باب میں لکھی گئی کتابوں میں سب سے زیادہ صحیح کتاب ہیں۔)

شرح و فوائد :

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کا آغاز اسی حدیث سے کیا ہے، اسی طرح امام نووی رحمہ اللہ نے بھی اسی مشہور حدیث سے اپنی اس کتاب کی ابتدا کی ہے، جس سے ان کا مقصود نیت کا خلوص اور محض رضائے الٰہی کا حصول ہے، اس سے کوئی اور دنیوی غرض وغایت اور منفعت مقصود نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اس کتاب کو پڑھنے، پڑھانے اور اس کی نشر و اشاعت کرنے والوں کو بھی چاہیے کہ وہ خلوصِ دل کے ساتھ محض رضائے الٰہی کی خاطر اسے پڑھیں اور پڑھائیں، اس کی نشر و اشاعت کریں، احادیث کو حرزِ

جاں بنائیں اور شریعت کی روشن تعلیمات کو زندگی میں داخل کریں اور یہ جان لیں کہ تمام اعمال کی قبولیت کا انحصار صحتِ نیت پر موقوف ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) يَعْنِي: رِيحَهَا. "جس نے اللہ کی رضامندی والا علم اس غرض سے حاصل کیا کہ اس کے ذریعہ دنیا حاصل کرے تو ایسا آدمی قیامت کے دن جنت کی خوشبو نہیں پاسکے گا۔" [صحیح / سنن ابو داود: ۳۶۶۴، سنن ابن ماجہ: ۲۵۲] نیز سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّمَا يُبْعَثُ النَّاسُ عَلَى نِيَّاتِهِمْ)) "یقیناً لوگوں کو ان کی نیتوں ہی کے مطابق اٹھایا جائے گا۔" [صحیح / سنن ابن ماجہ ۴۲۲۹، صحیح ابن ماجہ : ۳۴۲۶]

زیرِ مطالعہ حدیث کی اہمیت و عظمت کے تعلق سے علامہ عبد الرحمان بن مہدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "مَن أَرادَ أن يصنّفَ كتاباً فَليبدأْ بحديثِ الأعمالِ بالنيات" "جو کوئی بھی کوئی کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ ((الأعمالُ بِالنيات)) کی حدیث سے ابتدا کرے۔"

یہ حدیث ان جامع اور اصولی احادیث میں سے ہے، جن پر دینِ اسلام کی اساس و بنیاد ہے۔ ابن مہدی، شافعی، ابن حنبل، ابو داود اور ترمذی وغیرہ ائمۂ کرام رحمہم اللہ نے اس حدیث کو دینِ اسلام کا ثلث [⅓] قرار دیا ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام اعمال کا تعلق : ① دل ② زبان ③ اور "جوارح" ہاتھ پاؤں وغیرہ سے ہے۔ چوں کہ نیت کا تعلق دل سے ہے، لہٰذا یہ اسلام کا ثلث (ایک تہائی) ہے اور بعض علماء نے اس حدیث کو رُبع اسلام [¼] قرار دیا ہے۔

حدیث میں بیان ہوئے اعمال سے مراد مکلفین کے وہ تمام اعمال و افعال ہیں، جو اختیاری طور پر ان سے صادر ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بندوں سے اختیاری اعمال قصداً صادر ہوتے ہیں اور وہی نیت و ارادۂ قلبی ہی اس عمل کو کرنے اور وجود میں لانے کا سبب ہوتا ہے۔ لہٰذا تمام طرح کے اعمال کے قبول یا رد ہونے، ان کے صالح یا فاسد ہونے اور ان کے باعثِ اجر و ثواب بننے یا نہ بننے کا دار و مدار خود بندے کی اس نیتِ خیر و شر پر منحصر ہے، جس نے اس پر ابھارا اور انھیں وجود میں لانے کا تقاضا کیا۔

اَلنِّيَّات، نِيَّةٌ کی جمع ہے، جو نَوَي يَنْوِي نَوًي وَ نِيَّةً سے ثلاثی مجرد کے باب ضرب کا مصدر ہے،

جس کے معنی دلی ارادہ، عزم اور قصد کرنا کے ہیں۔ اس کے شرعی معنٰی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے کسی کام کا ارادہ کیا جائے اور یہاں اس حدیث میں یہ اپنے لغوی مفہوم یعنی قصد و ارادہ کے معنٰی میں مستعمل ہے، یعنی اعمال کے درست یا غلط ہونے میں نیت کا اعتبار ہو گا گویا یہاں فاسد اور صالح و درست نیت کے درمیان فرق بیان کرنا مقصود ہے نہ کہ نیت کے وجود یا عدم کا بیان مقصود ہے۔ البتہ اگر اعمال کا تعلق شرعی امور سے ہو تو اس کے شرعی معنٰی مراد ہوں گے یعنی اللہ کے لیے نیت کا خالص ہونا۔

نیز **اَلنِّیَّات**، **اَلأَعمال** کے مقابلے میں ہونے کی وجہ سے جمع کے ساتھ استعمال ہوا ہے یعنی ہر عمل کا اعتبار اس کی نیت کے حساب سے ہو گا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ اعمال کے تنوع کے اعتبار سے نیت میں بھی تنوع پایا جاتا ہے، لہٰذا ہر عمل کے لیے صالح نیت کا ہونا ضروری ہے۔ جب کہ کئی ایک صحیح احادیث میں نیت کا لفظ مفرد کے ساتھ بھی واقع ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ نیت کا محل دل ہے اور وہ ایک ہی ہے اسی مناسبت سے اسے مفرد لایا گیا ہے اور اس کے برعکس اعمال بظاہر کئی طرح کے ہوتے ہیں اس لیے اسے جمع کے ساتھ لایا گیا ہے۔ نیز نیت کو مفرد لانے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ نیت کا مقصد اخلاص ہے اور وہ مفرد ہے، جو کہ اس ذاتِ واحد کے لیے ہوتا ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

دراصل نیت اس دلی ارادے کا نام ہے، جو ہر اختیاری فعل سے پہلے بندے کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس قصد و ارادے کا مقام دل ہے زبان نہیں، لہٰذا نماز، روزہ اور دیگر عبادات کے لیے زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا غلط ہے، کیوں کہ زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا نہ تو خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور نہ صحابۂ کرام اور تابعین میں سے کسی سے ثابت ہے۔ بنابریں زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا شریعت کا حصہ نہیں ہے، بلکہ محض خود کی ایجاد ہے، اس لیے زبانی طور پر نیت کے الفاظ ادا کرنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح اعمالِ صالحہ کی صحت و اعتبار کے لیے نیت کا پایا جانا اور نیت کا خالص ہونا شرط ہے، اس کے برخلاف بُرے اور غیر شرعی اعمال اچھی نیت کی وجہ سے اچھے نہیں بن سکتے ہیں، چناں چہ ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ کھلے عام یا چھپ کر گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہماری نیت درست ہے۔ جب کہ جان بوجھ کر گناہ کرنا بُری نیت میں شامل ہے اگرچہ انسان اپنے بُرے کرتوت کے لیے ہزاروں وجہِ جواز تراش لے۔ مثلاً: صدقہ دینے کی نیت

سے چوری کرنا، بے ایمانی کرنا، ناحق لوگوں کے مال ہڑپنا وغیرہ گناہ ہی ہے، بلکہ اس طرح کے غلط کاموں کے لیے وجہِ جواز تراشنا گناہ کی شدت میں مزید اضافے کا باعث ہوگا، کیوں کہ ایسی صورت میں انسان برائی کو نیکی سمجھ لیتا ہے اس لیے اس پر شرمندہ ہو کر توبہ کرنے کے بجائے فخر کرتا ہے اور اسے اپنے اعمالِ صالحہ میں شمار کرتا ہے۔ اسی طرح اگر نیک اعمال خراب نیت سے کیے جائیں تو وہ بُرے بن سکتے ہیں یا یہ کہ نیک عمل سے مقصود محض ریا و نمود اور دکھاوا و شہرت طلبی ہو تو وہ عمل برباد ہو جائے گا اور کرنے والا گناہ گار ہوگا، جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ قیامت کے دن شہید، عالمِ قرآن اور سخی کے متعلق جب فیصلہ کیا جائے گا تو محض ان کے نیت کی فتور اور ریا و نمود کی وجہ سے انھیں ذلت و خواری کے ساتھ چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ [صحیح مسلم: ۱۹۰۵]

معلوم ہوا کہ تمام طرح کے اعمالِ صالحہ کی قبولیت کا دارومدار دلی نیت و ارادہ پر ہے، لہٰذا وضو، غسل، نماز، روزہ، حج اور تمام عبادات کے لیے نیت کا ہونا ضروری ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ماسوا تمام فقہاء کا اسی پر اجماع ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک وضو اور غسلِ جنابت وغیرہ میں نیت واجب نہیں ہے بلکہ سنت ہے۔ **علمائے کرام نے نیّت کے دو فائدے ذکر کیے ہیں:**

❶ **عبادات میں سے بعض کو بعض سے الگ کرنا۔** جیسے: صدقہ کو قرض کی ادائیگی سے الگ کرنا، نمازِ ظہر کو نمازِ عصر سے الگ کرنا اور نفلی روزے کو فرض روزے سے الگ کرنا وغیرہ۔

❷ **عبادات کو عادات سے الگ کرنا۔** جیسے: بعض دفعہ انسان غسل کرتا ہے اور اس سے جنابت (ناپاکی) سے دوری کا ارادہ ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں یہ غسلِ عبادت ہوگا، جس پر بندہ ثواب دیا جاتا ہے اور جب کوئی گرمی سے ٹھنڈک وغیرہ حاصل کرنے کے ارادے سے غسل کرے تو یہ غسلِ عادت ہوگا اور اس پر ثواب نہیں پائے گا۔

علمائے کرام نے اس حدیث سے یہ اہم شرعی قاعدہ اخذ کیا ہے: **"الأمور بمقاصدها"** یعنی "تمام امور میں ان کے مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے۔" یہ قاعدہ فقہ کے تقریباً تمام ابواب میں داخل ہے۔

اس حدیث سے کسی مسئلے کی توضیح و وضاحت اور مفہوم کو سمجھانے نیز مخاطب کے ذہن سے قریب تر کرنے کے لیے مثالیں بیان کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے مثال کے ذریعہ

نیتِ صحیحہ اور نیتِ فاسدہ کی وضاحت فرمائی ہے اور اس سلسلے میں ہجرت کو بطور مثال بیان فرمایا ہے۔

دیارِ کفر سے دیارِ اسلام کی طرف منتقل ہو جانے کو ہجرت کہتے ہیں اور احادیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اس فضیلت والے مہتم بالشان عمل میں بھی اگر ریا و نمود در آئے تو وہ ناقابلِ قبول ہو گا، چناں چہ جس کسی نے محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر ہجرت کیا تو اللہ تعالیٰ اسے اس کا اجر عطا فرمائے گا اور جس نے محض حصولِ دنیا یا کسی عورت سے شادی کرنے کی غرض سے ہجرت کیا تو آخرت میں اس ہجرت کے اجر و ثواب کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔

ممنوع اور بُرے اعمال کو حکمِ الٰہی کے بموجب ترک کر دینے اور حکمِ الٰہی کی نافرمانی کرنے والے فاسقوں و فاجروں سے ترکِ تعلق اور کنارہ کشی اختیار کرنے کو بھی ہجرت کہتے ہیں۔ لیکن یہاں حدیث میں ہجرت سے مراد ہجرتِ مکانی ہے۔

فرمانِ نبوی : ((أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا)) ”یا (ہجرت) کسی عورت سے شادی کے لیے ہو“ میں دنیاوی سامان کے بعد عورت کو خصوصی طور سے ذکر کیا گیا ہے، باوجود کہ وہ دنیاوی عموم میں داخل ہے تو اس کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں :

❶ پہلی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے عورتوں کے فتنے سے ڈرانا اور لوگوں کو ان سے متنبہ کرنا مقصود ہے، یعنی عام کے بعد خاص کا ذکر بطور تنبیہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے : ((مَا تَرَكْتُ بَعْدِي فِتْنَةً هِيَ أَضَرُّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ)) ”میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں کے فتنہ سے بڑھ کر نقصان دینے والا کوئی اور فتنہ نہیں چھوڑا ہے۔“ [صحیح بخاری:۵۰۹۶، صحیح مسلم:۲۷۴۰]

❷ دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس حدیث کا ایک شانِ ورود اور پسِ منظر ہے اور وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک شخص نے اُم قیس نامی ایک عورت سے شادی کرنی چاہی تو اس نے ہجرت کی شرط رکھ دی اور اس نے اس شرط کی وجہ سے شادی کرنے کے لیے ہجرت کر لی، جس کی وجہ سے انھیں مہاجر اُم قیس کہا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں بطور خاص عورت کا تذکرہ کیا گیا ہے، لیکن اس حدیث کی شانِ ورود کے طور پر یہ قصہ صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔ حافظ ابن رجب حنبلی اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہما اللہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”ليس فيه أن حديث الأعمال سيق بسبب ذلك،

ولم أر في شيء من الطرق ما يقتضي التصريح بذلك" "اس واقعہ میں ایسی کوئی بات مذکور نہیں ہے، جو اس پر دلالت کرے کہ ((**إنما الأعمال.....**)) والی حدیث اس کی وجہ سے بیان ہوئی ہے اور میں نے احادیث کی مختلف طرق میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جس میں اس کی صراحت ہو۔" [فتح الباری ۱/۱۶]

اللہ ہمیں حسنِ عمل اور حسنِ نیت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

راویِ حدیث کا تعارف:

سیدنا عمر بن خطاب بن نفیل بن عبد العزیٰ بن ریاح قرشی عدوی رضی اللہ عنہ بڑے مشہور فقیہ صحابی اور نادر ونایاب شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی کنیت ابو حفص اور لقب "فاروق" ہے۔ والدہ ابو جہل کی بہن حنتمہ بنت ہشام بن مغیرہ مخزومیہ ہیں۔ عام الفیل سے ۱۳ سال بعد مکہ میں پیدا ہوئے اور ۲۷ سال کی عمر میں نبوی دعا کی برکت سے ۵ یا ۶ ہجری میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان کے مسلمان ہونے سے اسلام اور مسلمانوں کو کافی تقویت ملی۔ زمانۂ جاہلیت میں قبیلۂ قریش کے سفیر تھے۔ عشرۂ مبشرہ بالجنۃ میں سے ایک ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ نہایت دور اندیش، عالی دماغ، عادل، نڈر اور بہادر تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔ وفاتِ نبوی کے وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔ خلیفۂ اول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے خلیفہ منتخب ہوئے اور تاریخ میں سب سے پہلے امیر المؤمنین کے لقب سے ملقب ہوئے۔ ان کی مدتِ خلافت ۱۰ سال ہے۔ خلیفہ ہونے کے باوجود بڑی سادہ زندگی بسر کرتے تھے، رعایا کی برابر خبر گیری کرتے اور ہمیشہ خوفِ الٰہی سے لرزاں رہتے، انھوں نے روئے زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیا۔ ان کے عہدِ خلافت میں حدودِ اسلامیہ کو خوب وسعت ملی گویا فتوحات کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ ۲۶/ ذی الحجہ ۲۳ ہجری بروز بدھ نمازِ فجر کی امامت کے دوران مغیرہ رضی اللہ عنہ کے مجوسی غلام ابولؤلؤ نے زہر آلود دودھاری تلوار سے حملہ کیا، جس سے آنت کٹ گئی اور ۶۳ برس کی عمر میں شہادت نصیب ہوئی۔ یکم محرم ۲۴ ہجری بروز اتوار نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کی قبر کے ساتھ حجرۂ عائشہ میں مدفون ہوئے اور نمازِ جنازہ سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ ان سے مروی حدیثوں کی تعداد (۵۳۹) ہے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

آئے جبریل سکھانے دین

(۲) عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَيْضًا قَالَ : بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ، إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ، شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعْرِ، لَا يُرَى عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ، وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ. حَتَّى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى فَخِذَيْهِ، وَقَالَ : يَامُحَمَّدُ! أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللَّهِ وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا**)) قَالَ : صَدَقْتَ. فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ! قَالَ : فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيْمَانِ؟ قَالَ : ((**أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ**)) قَالَ : صَدَقْتَ. قَالَ : فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ؟ قَالَ : ((**أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ**)) قَالَ : فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ؟ قَالَ : ((**مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ**)) قَالَ : فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا؟

عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ ایک روز ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ اچانک ایک آدمی نمودار ہوا، جس کے کپڑے بہت ہی سفید اور بال انتہائی سیاہ تھے، اس پر سفر کے آثار نظر نہیں آتے تھے اور نہ ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا تھا، حتیٰ کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا اور اس نے اپنے دونوں گھٹنے آپ کے گھٹنوں سے ملائے اور اپنے دونوں ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھ لیے اور کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ مجھے اسلام کے متعلق بتائیں؟ آپ نے فرمایا: ”اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرو، زکاۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔“ اس نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔ ہمیں اس سے تعجب ہوا کہ وہ آپ سے پوچھتا ہے اور آپ کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ اس نے کہا: آپ مجھے ایمان کے بارے میں بتائیں؟ آپ نے فرمایا: ”تم اللہ پر، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور یومِ آخرت پر ایمان لاؤ اور تم اچھی و بری تقدیر پر ایمان لاؤ۔“ اس نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔ اس نے کہا: آپ ہمیں احسان کے بارے میں بتائیں؟ آپ نے فرمایا: ”تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو وہ یقیناً تمھیں دیکھ رہا ہے۔“ اس نے کہا: آپ مجھے قیامت کے بارے میں بتائیں؟ آپ نے فرمایا: ”جس سے سوال کیا جارہا ہے وہ اس کے متعلق سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔“ اس نے کہا مجھے اس کی نشانیوں کے

قَالَ : ((أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا، وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُنْيَانِ)) ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا، ثُمَّ قَالَ : ((يَا عُمَرُ! أَتَدْرِي مَنِ السَّائِلُ؟)) قُلْتُ : اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ. قَالَ : ((فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ (صحيح مسلم : ٨)

بارے میں بتائیں؟ آپ نے فرمایا: ”لونڈی اپنی مالکن کو جنم دے گی اور تم ننگے پاؤں، ننگے بدن، تنگ دست، بکریوں کے چرواہوں کو بلند وبالا عمارتوں کی تعمیر اور ان پر فخر کرتے ہوئے دیکھو گے۔“ [عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:] پھر وہ شخص چلا گیا، میں کچھ دیر تک ٹھہرا رہا، پھر آپ نے مجھ سے پوچھا: ”اے عمر! کیا تم جانتے ہو سائل کون تھا؟“ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ”بے شک وہ جبریل تھے، وہ تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے۔“

شرح و فوائد :

أَمَارَات : علامات، نشانیاں مراد قیامت کی نشانیاں یہ **أَمَارَةٌ** کی جمع ہے۔ **اَلْحُفَاةَ** : ننگے پیروں والے، یہ **حَفِيَ يَحْفَي حَفاً** (برہنہ پا ہونا) سے **حَافِي** یا **حَافٍ** کی جمع ہے۔ **اَلْعُرَاةَ** : **عَارِيٌ** کی جمع ہے، ننگے جسم والا۔ **اَلْعَالَةَ** : **عَائِلٌ** کی جمع ہے، غریب و مفلس، کثیر العیال۔ **رِعَاءَ**: چرواہے، یہ **راعٍ** کی جمع ہے اور اس کی جمع **رُعاة** بھی آتی ہے۔ **اَلشَّاءِ** : یہ **شَاةٌ** کی جمع ہے، بھیڑ، بکری۔ **يَتَطَاوَلُونَ** : لمبا کرنا، اونچا کرنا، (تفاعل) یہاں اس کا مرادی مفہوم فخر کرنا مراد ہے۔ **فَلَبِثْتُ مَلِيًّا** : ”میں کچھ دیر تک ٹھہرا رہا“ سنن وغیرہ کی روایت میں ہے کہ ”**فَلَبِثْتُ ثَلَاثًا**“ ”میں تین (راتوں) تک رکا رہا۔“ [صحیح / سنن أبو داود: ۴۶۹۵، سنن ترمذی: ۲۶۱۰] یہ بات بظاہر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت کے معارض ہے، جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مجلس میں خبر دی تھی۔ [دیکھیے: صحیح مسلم:۹]

دونوں طرح کی احادیث کے درمیان جمع و تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کے مجلس سے چلے جانے کے بعد وہاں موجود صحابہ کے درمیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی اور پھر تین دن کے بعد جب کہ دیگر صحابہ موجود نہیں تھے تب عمر رضی اللہ عنہ کو خبر دی، اس طرح ان کے مابین کوئی تضاد نہیں رہا۔

یہ عظیم الشان حدیث ”حدیثِ جبریل“ ”**أُم الأحاديث**“ اور ”**أُم السنه**“ کے نام سے معروف ہے۔ اس میں اجمالی طور پر دینِ اسلام کی بنیادی باتوں کا بیان بہت مختصر اور جامع انداز میں آگیا ہے، اسی

لیے نبی ﷺ نے جبریل علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ وہ تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے۔

امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''اس حدیث میں ایمان، اسلام اور احسان سبھوں کو دین کا نام دیا گیا ہے اور جان لیجیے! کہ یقیناً یہ حدیث علوم و معارف اور آداب و لطائف کی بہت سی انواع پر مشتمل ہے، بلکہ یہ حدیث اصلِ اسلام ہے۔'' [المنہاج فی شرح صحیح مسلم ص: ۸۳] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ارکانِ اسلام پانچ ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

❶ **شہادتین یعنی کلمۂ توحید و رسالت کی گواہی:** اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی زبان سے توحید و رسالت کا اعتراف و اقرار کرے اور دل سے اس کی تصدیق کرے اور ان دونوں کے مفہوم کا اعتقاد رکھے اور ان کے مقتضیات پر عمل کرے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے اس بات کی بھی تصدیق کرے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبودِ برحق نہیں ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرتے ہوئے آپ ﷺ کو خاتم النبیین والمرسلین مانے اور آپ کے احکام کی اتباع و پیروی کرے۔ آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا اور آپ کی اتباع کرنا تمام لوگوں پر واجب ہے۔

❷ **اقامتِ صلاۃ:** اس کا مطلب یہ ہے کہ پنج وقتہ نمازوں کو ان کے شروط و ارکان اور واجبات کی رعایت کرتے ہوئے ان کے اوقات میں ادا کی جائے۔

❸ **ادائیگیٔ زکاۃ:** یہ مالی عبادت ہے، جو مال دار مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے نقدی مال و دولت اور سونا و چاندی میں سے مخصوص حصہ (ڈھائی فیصد / چالیسواں حصہ) ہجری سال گزرنے کے بعد نکالیں اور ان کے مستحقین میں خرچ کر دیں، نیز زرعی پیداوار میں دسواں یا بیسواں حصہ اور جانور و مویشی میں سے بھی مخصوص حصہ بطور زکاۃ نکالنا واجب ہے۔

❹ **صیامِ رمضان:** رمضان کے مہینے میں طلوعِ فجر سے لے کر غروبِ شمس تک عبادت کی نیت سے کھانے پینے، جماع کرنے اور دیگر مفطراتِ صوم سے رکے رہنے کا نام صوم ہے، جو کہ ہر عاقل و بالغ، صحت مند اور باشعور مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

❺ **استطاعت کی صورت میں حج بیت اللہ:** اس کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کی نیت سے حج کے مہینوں میں خانۂ کعبہ کا قصد کرنا اور وہاں جا کر حج کے شعائر کو بجالانا۔ یہ زندگی میں صرف ایک بار مال دار

مسلمانوں پر فرض ہے۔

نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ارکانِ ایمان یعنی اسلام کے بنیادی عقائد درج ذیل چھ ہیں:

① **اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنا:** اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود وذات کو تسلیم کیا جائے اور اس کی ربوبیت والوہیت واسماء وصفات پر ایمان لایا جائے اور اس کے اسماء وصفات میں تاویل وتحریف، تعطیل اور تکییف وتمثیل کا طریقہ نہ اپنایا جائے۔

② **فرشتوں پر ایمان رکھنا:** اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی تصدیق کی جائے کہ اللہ نے فرشتوں کو پیدا کیا ہے، ان کا وجود ہے اور وہ لوگ اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے ہیں، ان کی صحیح تعداد کا علم اللہ ہی کو ہے البتہ چند فرشتوں کا نام کتاب وسنت میں بیان ہوا ہے۔

③ **اللہ کی نازل کردہ کتابوں پر ایمان رکھنا:** اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیاء ورسل پر مختلف کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے ہیں، جن میں سے کچھ کے نام کتاب وسنت میں وارد ہوئے ہیں اور بہت سی کتابوں کے نام بیان نہیں ہوئے ہیں، وہ سب کی سب اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں اور حقیقت میں اللہ کا کلام ہیں، جو کچھ ان میں بیان ہوا تھا وہ سب سچ وبرحق تھیں۔ سب سے آخری اور پچھلی کتابوں کو منسوخ کرنے والی کتاب قرآن کریم ہے، اب اسی کے احکام وفرامین پر عمل ہوگا۔

④ **اللہ کے رسولوں پر ایمان رکھنا:** اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی تصدیق کی جائے کہ اللہ نے ہر امت میں رسول بھیجا جو لوگوں کو اللہ کی عبادت کی طرف بلاتے تھے، وہ سب کے سب برحق اور سچے نبی ورسول ہیں، کتاب وسنت میں جن نبیوں کے نام آئے ہیں ہم ان پر نام بنام ایمان لائیں گے اور جن کے نام نہیں آئے ہیں ان پر اجمالی ایمان لائیں گے۔ سب سے آخری نبی سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، دیگر انبیاء ورسل پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ان پر ایمان لانا واجب ہے، ان پر ایمان لائے بغیر انسان مسلمان نہیں ہو سکتا ہے۔

⑤ **قیامت کے دن پر ایمان رکھنا:** اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حساب وکتاب کے لیے لوگوں کو دوبارہ زندہ کرے گا اور پھر آخرت میں ان کے کیے ہوئے اعمال کا بدلہ جنت یا جہنم کی صورت میں دے گا۔ اس ضمن میں قبر کی برزخی زندگی اور اس میں عذاب یا راحت دیے جانے پر ایمان لانا بھی واجب ہے۔

⑥ **اچھی اور بُری تقدیر پر ایمان رکھنا:** اس کا مطلب یہ ہے کہ مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو ساری چیزوں کا علم تھا اور اس نے اچھی وبُری تقدیر کو مقدر کر دیا تھا، اس نے سب کچھ لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے، اس کی مشیئت و ارادے کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا ہے، تقدیر ایک الٰہی راز ہے، جسے مخلوق میں سے کوئی نہیں جانتا حتیٰ کہ انبیاء ورسل اور اس کے مقرب فرشتے بھی نہیں جانتے ہیں۔ تقدیر کے بارے میں تفصیلی گفتگو آئندہ صفحات میں حدیث نمبر: ۴ کے تحت آرہی ہے۔ اِن شاء اللہ

"إیمان" باب افعال کا مصدر ہے اور اس کا لغوی معنیٰ کسی چیز کی تصدیق کرتے ہوئے اس کا اقرار کرنے کے ہیں اور راجح قول کے مطابق اس کا شرعی مفہوم: **"إقرار باللسان، تصديق بالجنان، عمل بالجوارح والأركان"** ہے۔ یعنی زبان سے اقرار کرنے، دل سے تصدیق کرنے اور اعضاء وجوارح کے ذریعہ عمل کرنے کا نام ایمان ہے۔ نیز کتاب و سنت کے واضح دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اطاعتِ الٰہی سے بڑھتا ہے اور معصیتِ الٰہی سے گھٹتا ہے، گویا اعمال ایمان کا حصہ ہیں۔ آدمی کے عمل میں کمی ہوگی تو ایمان میں بھی کمی پائی جائے گی اور عمل میں پختگی ہوگی تو ایمان میں بھی اضافہ ہوگا، اس لیے اُخروی کامیابی کے لیے عمل کی بھی ضرورت ہے۔

جب کہ گمراہ فرقہ مرجئہ کے نزدیک مجرد تصدیق کا نام ایمان ہے۔ ان کے یہاں تصدیق کے ساتھ معصیت چنداں مضر نہیں ہے، یعنی نجاتِ اُخروی کے لیے صرف تصدیق کافی ہے اور اعمال ایمان کا حصہ نہیں ہیں۔ اسی طرح خوارج اور معتزلہ کے نزدیک مرتکبِ کبیرہ ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنمی ہے۔ ان کے نزدیک ایمان اقرار و تصدیق کا نام ہے اور اعمالِ صالحہ کا تارک ایمان سے خارج ہوگا، کیوں کہ اجزائے ایمان مرکب اور متساوی ہیں۔ جب کہ حقیقت میں ایمان قول و عمل کے مجموعے کا نام ہے اور اعمال ایمان کا حصہ ہیں اور لوگوں کا ایمان ان کے اعمال اور دلوں کے حالات کے حساب سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ جیسا کہ بہتیری قرآنی آیات و احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ واضح رہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ایمان قول و عمل کا نام ہے تو تصدیق عمل میں آجاتی ہے، کیوں کہ وہ دل کا عمل ہے۔

کتاب و سنت کے اندر عموماً ایمان اور اسلام ایک ہی معنیٰ میں استعمال ہوئے ہیں، جس میں تصدیقِ قلبی اور ظاہری فرماں برداری دونوں شامل ہیں، البتہ بسا اوقات ان دونوں کے لغوی معنیٰ کی رعایت سے

ان کے درمیان فرق بھی کیا گیا ہے، جیسا کہ زیرِ مطالعہ حدیثِ جبریل میں ایمان و اسلام کے درمیان تفریق موجود ہے۔ یہاں ایمان سے مراد قلبی یقین اور اسلام سے مراد ظاہری احکام کی پابندی ہے اور کبھی ایمان سے مراد دل سے مان لینا اور اسلام سے مراد زبان سے کلمہ توحید پڑھنا ہوتا ہے۔

زیرِ بحث حدیث میں ایمان و اسلام کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ کتاب و سنت میں اسلام اور ایمان کا لفظ اگر الگ الگ ذکر ہوں تو دونوں کا ایک ہی مفہوم ہوتا ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے یعنی ان کا مطلب پورا دینِ اسلام ہوتا ہے، لہٰذا اگر کہیں صرف ایمان کا ذکر ہو تو اسلام اس میں شامل ہوگا، اسی طرح اگر کہیں صرف اسلام کا ذکر ہو تو ایمان اس میں داخل ہوگا۔ مثلاً: فرمانِ الٰہی : ﴿وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [المائدۃ:۴] اور ﴿فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ [آل عمران: ۲۰] وغیرہ میں صرف اسلام کا ذکر ہے، لہذا یہ ایمان کو شامل ہوگا اور فرمانِ الٰہی: ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [البقرۃ: ۲۲۳] نیز ﴿تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ [الصف: ۱۱] وغیرہ میں صرف ایمان کا ذکر ہے، لہذا یہ اسلام کو شامل ہوگا۔ اور اگر یہ دونوں الفاظ ایک ہی سیاق اور جملے میں اکٹھے مذکور ہوں، جیسا کہ یہاں حدیثِ جبریل میں استعمال ہوا ہے تو پھر ایمان سے باطنی یا روحانی اعمال مراد لیے جاتے ہیں کہ جن کا تعلق قلبی اعمال و اعتقادات سے ہو، جیسے کہ قلبی عبادات، مثلاً: اللہ تعالیٰ پر ایمان، اللہ تعالیٰ سے محبت، خوف، امید، اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص اور دیگر ارکانِ ایمان وغیرہ۔ جب کہ اسلام سے مراد ظاہری اعمال ہوتے ہیں کہ جن کا تعلق زبان اور دیگر اعضاء سے ہو اور اس کے ساتھ قلبی ایمان کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا ہے اور قلبی ایمان نہ ہونے کی صورت میں ان ظاہری اعمال کو کرنے والا یا تو منافق ہوتا ہے یا پھر منافق تو نہیں ہوتا، لیکن اس کا ایمان حد درجہ کمزور ہوتا ہے۔ حدیثِ جبریل اسی تغایر و تفریق کی دلیل ہے۔ اسی طرح فرمانِ الٰہی: ﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا ۖ قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾ ”بدویوں نے کہا ہم ایمان لے آئے، کہہ دے تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لائے اور ابھی تک ایمان تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔“ [الحجرات: ۱۴] میں ایمان اور اسلام ایک سیاق کے تحت اکٹھے مذکور ہیں لہذا دونوں میں فرق ہوگا۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں :

”لفظِ ایمان کو بسا اوقات اسلام یا عملِ صالح کے ساتھ ملا کر ذکر نہیں کیا جاتا، بلکہ وہ بالکل الگ تھلگ ہوتا ہے اور بسا اوقات لفظِ ایمان کو اسلام کے ساتھ ملا کر ذکر کیا جاتا ہے، جیسے کہ حدیثِ جبریل علیہ السلام میں ہے کہ: (اسلام کیا ہے؟.... اور ایمان کیا ہے؟....) نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾ ”بے شک مسلمان مرد اور مسلمان خواتین اور مومن مرد اور مومن خواتین“ [الأحزاب: ۳۵] اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا: ﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾ [الحجرات: ۱۴] نیز فرمایا: ﴿فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ ”تو ہم نے ان میں سے جو بھی مومن تھے انھیں وہاں سے نکال دیا، تو ہمیں اس میں مسلمانوں کے ایک گھرانے کے علاوہ کچھ نہ ملا۔“ [الذاریات: ۳۵-۳۶] ان آیات میں جب ایمان کو اسلام کے ساتھ ذکر فرمایا تو اسلام سے مراد ظاہری اعمال لیے، مثلاً: شہادتین کا اقرار، نماز، زکاۃ، روزہ، حج وغیرہ اور ایمان سے مراد قلبی امور لیے، مثلاً: اللہ تعالیٰ پر ایمان، فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور آخرت کے دن پر ایمان۔ تاہم جب ایمان کا لفظ اکیلا ذکر کیا جائے تو اس میں اسلام اور اعمالِ صالحہ سب شامل ہوتے ہیں، جیسے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایمان کے درجات بیان کرنے والی حدیث میں فرمان ہے: ”ایمان کے ستر سے زائد درجات ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ درجہ **”لا الٰہ الا اللہ“** کہنا اور سب سے چھوٹا درجہ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا ہے۔“ تو یہی طریقۂ کار دیگر تمام احادیث کے ساتھ اپنایا جائے گا، جن میں نیکی کے کاموں کو ایمان کا حصہ بتلایا گیا ہے۔“ [مجموع الفتاوی: ۷/ ۱۳-۱۵ مختصراً]

جبریل علیہ السلام کا تیسرا سوال احسان کے بارے میں تھا۔ حدیث کے مطابق عبادت میں احسان کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ کے حضور اس طرح عبادت بجالائے کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، یہ احسان کا پہلا مرتبہ ہے اور اگر یہ کیفیت نہ پیدا ہو تو یہ شعور واحساس رکھے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ رہا ہے، یہ احسان کا دوسرا مرتبہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی ومراقبے کا پختہ یقین رکھتے ہوئے انتہائی خشوع وخضوع، عاجزی وفروتنی، خلوص وللّٰہیت، محبت وچاہت اور شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عبادت کو انجام دیا جائے۔ لغوی اعتبار سے احسان، اَحْسَنَ يُحسِنُ سے باب افعال کا مصدر ہے، جس کے معنیٰ نیکی کرنا، کسی کام کو عمدہ وخوب صورت بنانا،

حق دار کو اس کے حق سے زیادہ دینا اور کسی کے ساتھ بھلائی اور اچھا برتاؤ کرنا ہیں۔ اس حدیث میں احسان اخلاص کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ [احسان سے متعلق مزید تفصیل و وضاحت حدیث نمبر: ۱۷ کے تحت ص: ۱۲۵ پر آرہی ہے۔]

جبریل علیہ السلام کا چوتھا اور پانچواں سوال قیامت اور علاماتِ قیامت سے متعلق تھا۔ وقوعِ قیامت کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں ہے، نہ کسی رسول کو اور نہ کسی مقرب فرشتے کو، یہ ان پانچ غیبی امور میں سے ہے جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ [دیکھیے: سورہ لقمان: ۳۴، صحیح بخاری: ۵۰، ۴۷۷۷، صحیح مسلم: ۹، ۱۰] اللہ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت تمام مخلوق سے اس کا علم مخفی رکھا ہے، تاہم کتاب و سنت میں اس کی بہت سی چھوٹی و بڑی اور عام و خاص نشانیاں بیان ہوئی ہیں یعنی قیامت قائم ہونے سے پہلے کچھ نشانیاں رونما ہوں گی، جن میں سے بہت سی نشانیاں واقع بھی ہو چکی ہیں مثلاً زیرِ مطالعہ حدیث میں بیان ہوئی علامتیں وغیرہ اور بہت سی خاص علاماتِ کبریٰ ایسی ہیں جو قُربِ قیامت کے وقت ظاہر ہوں گی مثلاً دجال ودابہ کا ظہور، یاجوج ماجوج کا خروج، سورج کا پچھم سے نکلنا اور عیسیٰ علیہ السلام کا نزول وغیرہ، مگر ان سب کے باوجود یہ جان لیں کہ قیامت اچانک قائم ہو گی اور اس کے اصل وقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

اس حدیث میں قیامت کی پہلی نشانی یہ بیان ہوئی ہے: ((أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا)) یعنی: لونڈی اپنی مالکن کو جنے گی۔ [وفي الرواية الأخرىٰ "رَبَّهَا"، وفي الرواية الأخرىٰ "بَعْلَهَا"] اور ایک روایت میں ہے کہ وہ اپنے مالک کو جنے گی۔ علماء نے اس جملے کے کئی مفہوم بیان کیے ہیں:

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ قُربِ قیامت کے وقت احوال بڑی تیزی سے بدلیں گے اور اولاد اپنے ماں باپ کی نافرمان بنتی جائے گی اور نافرمانی اس حد تک بڑھ جائے گی کہ اولاد والدین کے ساتھ غلاموں اور لونڈیوں کا سا برتاؤ کرے گی گویا کہ اولاد والدین کے آقا ہیں۔ یعنی کثرتِ نافرمانی کی وجہ سے اولاد اپنے والدین پر حکم چلائے گی۔ بالخصوص بیٹی ماں کی نافرمانی کرے گی اور اس کے ساتھ باندی جیسا برتاؤ کرے گی۔ اس مفہوم کو حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ وغیرہ نے راجح قرار دیا ہے۔

اس کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے کثرتِ فتوحات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ قُربِ قیامت کے وقت فتوحات بہ کثرت ہوں گی، جس کی وجہ سے لونڈیاں بڑھ جائیں گی اور ان

لونڈیوں کی اولاد میں بھی اضافہ ہو جائے گا اور وہ اولاد آقا کی اولاد ہونے کی وجہ سے آقا کے حکم میں ہو گی اور ان کی ماں لونڈی ہی کہلائے گی، اسی طرح بیٹی اپنی ماں کی مالک سمجھی جائے گی۔

اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قُربِ قیامت کے وقت لونڈیوں اور غلاموں کی اتنی کثرت ہو گی کہ جب کوئی کسی عورت کو بطور لونڈی خریدے گا تو در حقیقت وہ اس کی ماں ہو گی اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بے خبر ہوں گے۔

اسی طرح جدید دور کی حیاباختہ ایجاد کہ والدین کے منی کو کسی کرائے کی عورت کے رحم میں ڈال کر وہاں بچے کی پرورش کا مرحلہ طے کرایا جاتا ہے یہ بھی اس مفہوم میں شامل ہو سکتا ہے کہ جس کے بطن سے بچے کی پیدائش ہو رہی ہے وہ بچے کی نگاہ میں نوکر ہی رہتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ شیخ عطاء اللہ ساجد حفظہ اللہ کہتے ہیں: "ایک رائے یہ بھی سامنے آئی ہے کہ اس حدیث میں جدید دور میں پیدا ہونے والے بعض مسائل کی طرف اشارہ ہے، مثلاً: ایسے تجربات کیے گئے ہیں، جن میں مذکر اور مؤنث کے مادۂ تولید کو مؤنث کے جسم سے باہر ملا کر تجربہ گاہ میں جنین وجود میں لایا گیا، جسے بعد میں کسی اور مؤنث کے جسم میں رکھ کر تخلیقی مراحل کی تکمیل ہوئی۔ اس طرح مولود جس کے جسم میں پیدا ہوا، اس کے مادۂ تولید سے پیدا نہیں ہوا۔ ان تجربات کے نتیجے میں یہ عین ممکن ہے کہ کوئی دولت مند میاں بیوی اپنا جنین کسی غریب عورت کے جسم میں پروان چڑھائیں جو تھوڑی اُجرت کے بدلے مشقت برداشت کرنے پر تیار ہو سکتی ہے، جب بچہ پیدا ہو گا تو دولت مند میاں بیوی ہی اس کے ماں باپ مانے جائیں گے اور جس عورت نے اس کی پیدائش کی تکلیف اٹھائی ہو گی، وہ اجیر یا مملوک ہی رہے گی اور پیدا ہونے والا بچہ اسے اپنی ماں نہیں بلکہ نوکرانی ہی تصور کرے گا اور خود وہ عورت بھی اپنی یہی حیثیت سمجھے گی۔ موجودہ دور میں اخلاقی اقدار جس تیزی سے روبہ زوال ہیں، اس کے مد نظر یہ کچھ بعید نہیں کہ عملاً یہ صورت رواج پا جائے۔ واللہ اعلم یورپ میں، جہاں عفت و پاک دامنی کا تصور ختم ہو گیا ہے، اب اس قسم کی صورتیں اختیار کی جانے لگی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسلامی معاشروں کو اس اخلاقی پستی سے محفوظ رکھے۔" آمین! [دیکھیے: ترجمہ وفوائد سنن ابن ماجہ ۱/ ۱۲۴ عطاء اللہ ساجد]

اس حدیث میں قیامت کی دوسری نشانی یہ بیان کی گئی ہے کہ لوگوں کے حالات یکسر بدل جائیں گے۔ ننگے پاؤں، ننگے جسم والوں، فقیروں اور بکریوں کے چرواہوں کو تو دیکھے گا کہ وہ لوگ بڑی بڑی

عمارتوں کے بنانے میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے یعنی وہ لوگ عمارتوں کی بلندی اور کثرت نیز ان کے حسن وزیبائش پر تکبر کریں گے اور اس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے۔

زیرِ مطالعہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں، ان کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی ہے اور اعمال میں کمی و بیشی کے حساب سے ایمان میں بھی کمی و بیشی لازمی طور پر ہوگی۔ قرآن کریم میں کئی مقامات پر ﴿اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کہہ کر ایمان کے بالمقابل عملِ صالح کا بھی ذکر ہوا ہے، جس سے بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اعمال ایمان کا حصہ نہیں ہیں دونوں الگ الگ ہیں۔ مگر یہ بات درست نہیں ہے، کیوں کہ کتاب و سنت کے نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان دل، زبان اور جوارح تینوں کے اعمال کا نام ہے۔ دراصل اعمالِ صالحہ کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر عمل صالح کو ایمان کے معاً بعد الگ ذکر کیا گیا ہے، تاکہ ایمان کے اس جزو کو کوئی شخص معمولی سمجھ کر اس سے بے اعتنائی نہ کر بیٹھے بلکہ یہ حقیقت جان لے کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

دینی مسائل کی تفہیم و وضاحت کے لیے سوال و جواب کے طریقے کو اپنانا اور اس طرح کی مجلس قائم کرنا انتہائی مفید و مؤثر ہے اور یہ پسندیدہ عمل ہے کہ انسان اہلِ علم کی مجالس میں صاف ستھرے لباس اور اچھی حالت و ہیئت میں آئے تاکہ لوگوں کی توجہ اس کی جانب برقرار رہے نیز طلبہ کو بھی چاہیے کہ نہایت صفائی و ستھرائی کے ساتھ مشائخ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کریں، جیسا کہ جبریل علیہ السلام کی ظاہری حالت انتہائی صاف ستھری تھی۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتے انسانی شکل وصورت میں دنیا میں آتے رہے ہیں، جس کا مشاہدہ انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں اور ان کی باتیں بھی سن سکتے ہیں۔

جن چیزوں کے بارے میں صحیح علم نہ ہو، ان کے جواب میں صاف صاف یہ کہہ دینا کہ "مجھے نہیں معلوم ہے۔" نبوی طریقہ ہے، جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اس سے کسی عالم کے مقام و مرتبے میں کوئی کمی نہیں آئے گی، بلکہ اپنی عقل و رائے سے جواب دینے میں غلطی اور گمراہی کا صد فیصد امکان رہے گا اور اس طرح جواب دینے والا شخص گناہ گار بھی ہوگا۔ ✿ ✿ ❁ ✿ ✿

اسلام کے پانچ بنیادی ستون

(۳) عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : ((**بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ : شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللَّهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَحَجِّ الْبَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ**))رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

ابو عبد الرحمان عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ”اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ (برحق) نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکاۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔“ (صحیح بخاری:۸، صحیح مسلم:۱۶)

شرح و فوائد :

دین اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے اور ان میں سب سے افضل رکن ”لا الٰہ الا اللہ، محمد رسول اللہ“ کی گواہی دینا ہے، کیوں کہ اس کا بیان سب سے پہلے ہوا ہے اور اس کی شہادت کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا ہے، جنت میں داخلہ پانا تو بہت دور کی بات ہے۔ شہادتین کے اقرار کے بعد بقیہ دیگر ارکان کو بجالانا بھی ضروری ہے۔

نماز مرد و عورت اور امیر و غریب سبھی بالغ مسلمانوں پر فرض ہے، جب کہ زکاۃ کا ادا کرنا صرف مال دار مسلمانوں پر فرض ہے اور حج ہر اس مسلمان شخص پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے، جو ایامِ حج میں خانۂ کعبہ تک پہنچنے کی طاقت رکھے نیز ماہِ رمضان کے روزے رکھنا بھی ہر عاقل و بالغ، صحت مند اور باشعور مسلمان پر فرض ہے، البتہ عذر کی صورت میں قضا کرنا اور روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہونے کی صورت میں فدیہ دینا واجب ہے۔ ارکانِ دین کی مزید تفصیل گذشتہ صفحات میں دوسری حدیث کے تحت آپ پڑھ آئے ہیں، اس لیے یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

حدیث میں مذکور پانچوں ارکان میں سے کسی ایک رکن کا انکار کرتے ہوئے اسے ترک کرنا کفر کا باعث ہے، البتہ شرک کے سوا بقیہ ارکان کی ادائیگی میں سستی و کاہلی کرنے کی صورت میں آدمی ملت سے خارج تو نہیں ہوتا ہے، مگر یہ سخت گناہ کا باعث ہوتا ہے، تاہم جان بوجھ کر نماز کا ترک کرنا بھی کفر کا

باعث ہے۔ جان لیجیے! نماز ایمان اور کفر کے درمیان تفریق کرنے والی عبادت ہے، اسے ادا کرنا ایمان اور مومن ہونے کی پہچان ہے اور اسے ترک کرنا کفر کی پہچان ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

((بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ)) ”(مومن) آدمی کے درمیان اور شرک و کفر کے درمیان صرف نماز چھوڑنے کا فرق ہے۔“ [صحیح مسلم: ۸۲]

امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو کوئی شخص نماز کو اس کے وجوب کا انکار کرتے ہوئے یا استہزا و استخفاف کرتے ہوئے ترک کر دے تو وہ کافر ہے اور جو شخص محض اپنی سستی و کاہلی کی بنیاد پر نماز کو ترک کر دے، مگر اس کے دل میں اس کا احترام ہو اور وہ اس کے وجوب کا اعتقاد بھی رکھے تو ایسے شخص کے بارے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں راجح بات یہی ہے کہ جان بوجھ کر نماز ترک کرنا کافروں والا کام ہے اور ایسا شخص کفر کا ارتکاب کرنے والا ہوتا ہے اگرچہ وہ وجوب کا منکر نہ ہو، کیوں کہ صحیح احادیث میں ایسے شخص پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، مگر چوں کہ وہ شہادتین کا اقرار کرنے والا ہوتا ہے اور دیگر اسلامی شعائر پر عمل پیرا ہوتا ہے، اس لیے اس کا کفر ”كُفْرٌ دُوْنَ كُفْرٍ“ ہے یعنی بڑے کفر سے کم درجے کا کفر ہے، جو ہمیشہ کے لیے جہنمی ہونے اور بخشش نہ ہونے کا موجب نہیں ہوتا ہے اور ایسا شخص دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوگا۔ جس طرح ایمان کے کئی مراتب ہیں اور ان میں سے بعض انتہائی برتر اور بعض اس سے کم تر ہیں، اسی طرح کفر کے بھی کئی مراتب ہیں اور ان میں سے بعض اخف ہیں اور بعض انتہائی اعلیٰ اور ہمیشہ کے لیے جہنمی ہونے کا باعث ہیں۔ امام احمد، اسحاق بن راہویہ، بعض مالکیہ اور بعض شوافع نے احادیث کے ظاہرِ الفاظ کے پیش نظر ایسے شخص کو صریح طور پر کافر کہا ہے اور کفر کی وجہ سے اسے قتل کرنے کا حکم دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں اسے دفن کیا جائے گا۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک ایسا شخص کافر تو نہیں ہوگا، مگر فاسق ہوگا اگر وہ توبہ کرلے تو ٹھیک، نہیں تو اسے بطور حد تلوار سے قتل کر دیا جائے گا اور احناف کے نزدیک ایسا شخص نہ تو کافر ہوگا اور نہ اسے قتل کیا جائے گا، بلکہ بطور تعزیر اسے قید کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ نماز پڑھنے لگے۔ بعض اہلِ علم نے مذکورہ حدیث کے الفاظ کو تہدید و تغلیظ پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا یہ عمل کفار کے عمل کے مشابہ ہے۔ [دیکھیے: مرعاۃ المفاتیح ۲/ ۲۷۵]

حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"تارک الصلوٰۃ کی تکفیر میں سلفِ صالحین میں اختلاف ہے، جمہور اس کی تکفیر کے قائل ہیں، نصوصِ شرعیہ کو مد نظر رکھتے ہوئے صحیح تحقیق یہ ہے کہ جو شخص مطلقاً نماز ترک کر دے، بالکل نہ پڑھے وہ کافر ہے اور جو شخص کبھی پڑھے اور کبھی نہ پڑھے تو ایسا شخص کافر نہیں ہے، مگر پکا مجرم اور فاسق ہے، اس کا فعل کفریہ ہے، خلیفۃ المسلمین اس پر تعزیر نافذ کر سکتا ہے، اس پر اجماع ہے کہ نماز، زکوٰۃ، رمضان کے روزے اور حج کا انکار کرنے والا کافر اور ملتِ اسلامیہ سے خارج ہے۔" [أضواء المصابیح ص:۳۰]

معلوم ہوا کہ وجوبِ زکاۃ کی شرطیں پائی جانے کی صورت میں زکاۃ نہ دینا اور اس کے وجوب کا انکار کرنا یا زکاۃ دینے کے باوجود اس کے وجوب کا انکار کرنا کفر کا باعث ہے، تاہم اگر کوئی شخص اپنی غفلت یا بخل کی وجہ سے زکاۃ نہ دے تو وہ فاسق اور کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو گا، اسی طرح استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے اور ماہِ رمضان کے روزے نہ رکھنے کا مسئلہ بھی ہے کہ اگر آدمی ان کی فرضیت کا منکر ہے تو وہ کافر ہو گا، لیکن اگر وہ ان کی فرضیت کا منکر نہ ہو بلکہ محض اپنی سستی اور کاہلی کی بنا پر استطاعت کے باوجود ان فرائض کی ادائیگی نہ کرے تو وہ کافر تو نہیں قرار دیا جائے گا، مگر وہ فاسق اور کبیرہ گناہ کا مرتکب شمار ہو گا۔ ان فرائض کی ادائیگی میں تاخیر کرنے والے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ خالص توبہ کرے اور مافات کی تلافی اس طرح کرے کہ جتنے سالوں کی زکاۃ نہیں نکالی ہے ان کی زکاۃ نکالے، فوری طور پر حج کرے اور اکثر اہلِ علم کے نزدیک شرعی عذر کے بغیر چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا دینا اور اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرنا بھی واجب ہے، تاہم بعض اہلِ علم کا موقف یہ ہے کہ جان بوجھ کر چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا دینا لازم نہیں ہے اور ایسے شخص کی قضا صحیح نہیں ہو گی، کیوں کہ اس عبادت کا وقت گزر چکا ہے، لیکن جمہور اہلِ علم کا موقف ہی راجح ہے، کیوں کہ روزے رکھنا انسان کے ذمہ فرض ہے اور اسے ادا کیے بغیر وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا ہے اور جب تک وہ اسے ادا نہیں کرے گا وہ اس کے ذمہ باقی رہے گا۔

زیرِ مطالعہ حدیث میں جہاد کا ذکر نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے واجب نہیں ہے اور بعض حالات میں یہ ساقط بھی ہو جاتا ہے، جب کہ مذکورہ پانچوں ارکان دائمی طور پر فرضِ عین ہیں۔ اس حدیث میں فرضیتِ حج کے ذکر کو فرضیتِ صیامِ رمضان پر مقدم کیا گیا ہے تو یہ ترتیب حکم کے

اعتبار سے نہیں ہے، بس ذکر کے اعتبار سے ہے، کیوں کہ ماہِ رمضان کے روزوں کی فرضیت حج کی فرضیت سے پہلے سن دو ہجری میں ہوئی۔ صحیح مسلم میں سعد بن عبیدہ عن ابن عمر سے جو روایت آئی ہے اس میں صیامِ رمضان کو حج پر مقدم کیا گیا ہے، بلکہ اس میں یہ بھی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے تاکید سے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یوں ہی سنا ہے۔

نیز زیرِ بحث حدیثِ نبوی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعمال ایمان کا حصہ ہیں اور عمل کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوگا، اس لیے اُخروی کامیابی کے لیے عمل کرنا انتہائی ضروری ہے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

راویِ حدیث کا تعارف:

سیدنا عبد اللہ بن عمر بن خطاب قرشی عدوی رضی اللہ عنہما بڑے عابد وزاہد، تہجد گزار، اتباعِ سنّت کے بے حد حریص وشیدائی اور وسیع علم رکھنے والے صحابی ہیں۔ ان کی کنیت ابو عبد الرحمان ہے اور یہ "ابن عمر" سے مشہور ہیں۔ جہاں کہیں بھی مطلق ابن عمر کہا اور لکھا جاتا ہے تو اس سے مراد عبد اللہ بن عمر ہی ہوتے ہیں۔ ان کی والدہ کا نام زینب بنت مظعون ہے۔ بعثت کے تیسرے سال پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں اسلام قبول کیا، مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کا شرف حاصل ہوا اور پہلی مرتبہ غزوۂ خندق میں شریک ہوئے جب کہ ان کی عمر محض پندرہ سال تھی۔ ۸۶/ سال کی عمر پاکر ۷۳ ہجری میں مکہ کے اندر وفات ہوئی اور ذی طویٰ نامی جگہ میں دفن ہوئے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے زیادہ حدیثیں انھیں سے مروی ہیں۔ ان سے مروی احادیث کی تعداد تقریباً (۲۶۳۰) ہے۔

تخلیقِ انسانی کے مراحل، تقدیرِ عمری اور خاتمے کا بیان

(٤) عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ- :

((إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يُرْسَلُ إِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ، وَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ : بِكَتْبِ رِزْقِهِ، وَأَجَلِهِ، وَعَمَلِهِ، وَشَقِيٌّ أَوْ سَعِيدٌ؛ فَوَاللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ غَيْرُهُ إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا. وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا))

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

ابو عبد الرحمان عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صادق و مصدوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان فرمایا: ”بے شک تم میں سے ہر ایک کے مادۂ تخلیق کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفے کی شکل میں جمع کیا جاتا ہے، پھر وہ اتنے ہی دن جمے ہوئے خون کی شکل میں رہتا ہے، پھر اتنے ہی دن گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں رہتا ہے، پھر اس کی طرف فرشتے کو بھیجا جاتا ہے، جو اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے چار باتیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے: اس کا رزق، اس کی مدتِ عمر، اس کا عمل اور یہ کہ وہ بدبخت ہے یا نیک بخت ہے۔ پس اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، بے شک تم میں سے کوئی ایک شخص جنتیوں والا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر کتاب (نوشتۂ تقدیر) غالب آجاتی ہے اور وہ دوزخیوں والے عمل کرنے لگتا ہے اور وہ دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص دوزخیوں والا عمل کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر کتاب (نوشتۂ تقدیر) غالب آجاتی ہے اور وہ جنتیوں والے کام کرنے لگتا ہے اور پھر جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔“
(صحیح بخاری: ۳۲۰۸، صحیح مسلم: ۲۶۴۳)

شرح و فوائد :

اس حدیث میں شکمِ مادر کے اندر انسان کی تقدیر لکھے جانے کی بات کہی گئی ہے اور انسانی تخلیق کے مراحل کو بیان کیا گیا ہے۔ شکمِ مادر میں انسان ابتدائی چالیس دنوں تک نطفے کی شکل میں رہتا ہے، اس کے بعد خون کے لوتھڑے کی شکل اختیار کرتا ہے اور چالیس دن تک اسی حالت میں رہتا ہے، اس کے بعد چالیس دنوں تک گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں رہتا ہے، اس طرح ایک سو بیس دن گزرنے کے بعد اللہ کی طرف سے مقرر فرشتہ اس کی تقدیر لکھنے کے لیے حاضر ہوتا ہے۔ رحمِ مادر میں انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کی تفصیل قرآن کریم میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ۖ ...﴾

”اے لوگو! اگر تم اٹھائے جانے کے بارے میں کسی شک میں ہو تو بے شک ہم نے تمھیں حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک قطرے سے، پھر کچھ جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کی ایک بوٹی سے، جس کی پوری شکل بنائی ہوئی ہے اور جس کی پوری شکل نہیں بنائی ہوئی، تاکہ ہم تمھارے لیے واضح کریں اور ہم جسے چاہتے ہیں ایک مقررہ مدت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر ہم تمھیں ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں۔“ [الحج:۵]

دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ ”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو حقیر مٹی کے ایک خلاصے سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے ایک قطرہ بنا کر ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے اس قطرے کو ایک جما ہوا خون بنایا، پھر ہم نے اس جمے ہوئے خون کو ایک بوٹی بنایا، پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنایا، پھر ہم نے ان ہڈیوں کو کچھ گوشت پہنایا، پھر ہم نے اسے ایک اور صورت میں پیدا کر دیا، سو بہت برکت والا ہے اللہ جو پیدا کرنے

والوں میں سب سے اچھا ہے۔" [المؤمنون:۱۲ – ۱۴]

اللہ تعالیٰ نے ابو الانسان سیدنا آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا، پھر حوا علیہا السلام کو پیدا کیا اور پھر انھیں دونوں سے انسانی ذریت بڑھائی۔ مطلب یہ کہ انسانی زندگی کی ابتدا معمولی مٹی کے خلاصے سے ہوئی ہے، جسے اللہ نے روئے زمین کے تمام حصوں سے جمع فرمایا تھا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ((إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيعِ الْأَرْضِ...)) "اللہ نے آدم کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا فرمایا، جسے اس نے تمام روئے زمین سے جمع کیا تھا۔..." [صحیح / أبو داود:۴۶۹۳، ترمذی:۲۹۵۵]

اور پھر میاں بیوی کے باہمی نطفے سے نسل در نسل انسانی آبادی آگے بڑھتی جا رہی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کے تخلیقی مرحلے کی ابتدا نطفہ یعنی پانی کے معمولی قطرے سے ہوتی ہے جو بطنِ مادر کے انتہائی محفوظ مقام رحم کے اندر عورت کے مبیض میں قرار پاتا ہے، گویا مرد و عورت دونوں کے ملے جلے نطفہ سے تخلیقِ انسانی کا مرحلہ طے پاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے: ﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ...﴾ "بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے قطرے سے پیدا کیا۔" [الدھر:۲] اللہ تعالیٰ پھر اسی ملے جلے نطفے کو "عَلَقَةً" کی شکل دے دیتا ہے۔ "عَلَقَةً" کے معنی جمے ہوئے خون کا ٹکڑا بھی ہے اور جونک بھی ہے یعنی چالیس دنوں کے بعد وہی نطفہ سرخ جمے ہوئے خون کے جامد ٹکڑے کی حالت میں ہو جاتا ہے جو جونک کی شکل کا ہوتا ہے اور جونک ہی کی طرح رحم کی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا ہوتا ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ اسے "مُضْغَةً" کی حالت میں تبدیل کر دیتا ہے، جس میں ابتدائی طور پر کوئی نقش اور شکل و صورت نہیں ہوتا ہے۔ "مُضْغَةً" کے معنیٰ ہیں گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا جو چبانے کے لیے منہ میں ڈالا جا سکے۔ پھر اسی گوشت کے ٹکڑے کو اللہ تعالیٰ مضبوطی عطا کرتا ہے اور ایک سو بیس دن گزرنے کے بعد اس میں روح پھونکتا ہے اور اسی معمولی نطفے کو مذکورہ مختلف مراحل سے گزار کر انسانی صورت عطا کرتا ہے جس میں دیکھنے، سننے، سمجھنے اور حرکت کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے اور یکایک ایک بے جان لوتھڑا جان دار جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے، جس میں ساری انسانی رعنائیاں نمودار ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں اسے ﴿ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ﴾ "پھر ہم نے اسے ایک اور صورت میں پیدا کر دیا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کا یہ تخلیقی

مرحلہ انتہائی باریک بینی سے چلتا ہے اور اللہ اپنی حکمت و قدرتِ کاملہ کے ذریعہ اس کی حفاظت کرتے ہوئے جملہ مراحل کی تکمیل فرماتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو محض لفظِ کن کے ذریعہ انسان کو پیدا کر سکتا تھا، مگر اللہ نے اپنی حکمت و مصلحت کے تحت تدریجی طور پر انسان کی تخلیق فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورۂ سجدہ میں اس تخلیقی مرحلے کی کاری گری کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۖ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ ۞ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ ۞ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ ۖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ﴾ ”جس نے اچھا بنایا ہر چیز کو جو اس نے پیدا کی اور انسان کی پیدائش تھوڑی سی مٹی سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے خلاصے سے بنائی۔ پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی ایک روح پھونکی اور تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت کم شکر کرتے ہو۔“ [السجدۃ:۷-۹]

بسا اوقات شکل و صورت بنانے سے پہلے ہی رحم سے اسقاط ہو جاتا ہے اور کبھی شکل و صورت بننے کے بعد اسقاط ہو جاتا ہے اور کبھی خلقت کے اعتبار سے کسی طرح کے نقص و عیب کی حالت ہی میں اللہ چھوڑ دیتا ہے، جس کی وجہ سے ناتمام بچے کی پیدائش ہوتی ہے، جیسا کہ اسقاطِ حمل کی صورت میں یا ناتمام بچوں کی پیدائش کی صورت میں ہم قدرتِ الٰہی کی کاری گری کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کا بیان اوپر سورۂ حج کی آیتِ کریمہ کے اس ٹکڑے میں ہوا ہے: ﴿ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ﴾ ”پھر گوشت کی ایک بوٹی سے، جس کی پوری شکل بنائی ہوئی ہے اور جس کی پوری شکل نہیں بنائی ہوئی، تاکہ ہم تمھارے لیے واضح کریں۔“یعنی کبھی مکمل ہوتا ہے اور کبھی نامکمل ہوتا ہے۔

غافل انسان اپنے اسی تخلیقی مرحلے پر غور کر لے کہ اس ذاتِ باری تعالیٰ نے کس قدر ہم پر احسان فرمایا اور مختلف اندھیروں میں رکھ کر کس طرح عدم سے وجود بخش کر ہماری پرورش فرمائی اور شکمِ مادر میں ہر طرح سے ہمارا خیال رکھا تو وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت و وحدانیت اور الوہیت کا انکار نہیں کر سکتا ہے۔ غور کریں کہ جب اللہ تعالیٰ عدم سے وجود بخشنے پر قادر ہے تو دوبارہ زندہ کرنا اس کے لیے کیوں کر مشکل ہوگا، بلکہ یہ تو اور ہی آسان ہوگا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَهُوَ ٱلَّذِي يَبْدَؤُاْ ٱلْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُۥ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِۚ وَلَهُ ٱلْمَثَلُ ٱلْأَعْلَىٰ فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِۚ وَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ﴾ ”اور وہی ہے جو خلق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور وہ اسے زیادہ آسان ہے اور آسمان و زمین میں سب سے اونچی شان اسی کی ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔“ [الروم:۲۷]

اللہ نے انسانی عقل و ذہن اور ان کے قول و فعل کے لحاظ سے سمجھایا کہ جب وہ پہلی مرتبہ پیدا کرنے پر قادر ہے تو پھر اسی مخلوق کو دوبارہ پیدا کرنا نسبتاً انتہائی آسان ہو گا، حالاں کہ اللہ کے لیے پہلی دفعہ پیدا کرنا اور پھر موت دے کر دوبارہ زندہ کرنا برابر ہے، وہ ہر طرح سے قادر ہے۔ نطفے سے انسانی تخلیق سے متعلق مذکورہ تفصیلی بیانات کے علاوہ درج ذیل حقائق پر بھی غور کریں اور اپنی حیثیت کا اندازہ لگائیں!! اور فیصلہ کریں کہ کیا اللہ دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا ہے؟

”پہلی قابلِ غور بات یہ ہے کہ انسان کا نطفہ بذات خود کیا چیز ہے؟ وہ کن چیزوں سے بنتا ہے؟ جن چیزوں سے نطفہ بنتا ہے وہ زندہ تھیں یا مردہ؟ اور اس نطفہ کے بننے میں یا بنانے میں تمھارا بھی کچھ عمل دخل یا اختیار تھا؟ پھر اس نطفہ کو رحمِ مادر میں ٹپکانے کی حد تک تو اختیار انسان کو ہے۔ اس کے بعد پھر اس کا اختیار کلی طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ نطفہ کا ایک قطرہ لاکھوں جراثیم یا کیڑوں پر مشتمل ہوتا ہے، جو صرف طاقت ور خوردبین سے نظر آسکتے ہیں۔ اسی طرح رحمِ مادر میں نسوانی بیضہ کا وجود بھی خوردبین کے بغیر نظر نہیں آسکتا۔ نطفہ کا ایک جرثومہ جب نسوانی بیضہ میں داخل ہوتا ہے۔ پھر ان دونوں کے ملنے سے ایک چھوٹا سا زندہ خلیہ (Cell) بن جاتا ہے۔ یہی انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز ہے اور اسی کا نام استقرارِ حمل ہے۔ نطفہ ٹپکانے کی حد تک تو مرد کو اختیار ہے، مگر یہ طاقت نہ مرد میں ہے نہ عورت میں اور نہ دنیا کی کسی اور طاقت میں کہ وہ نطفہ سے حمل کا استقرار کرا دے۔ پھر اس نقطۂ آغاز سے ماں کے پیٹ میں بچے کی درجہ بدرجہ پرورش، ہر بچے کی الگ الگ صورت گری، ہر بچے کے اندر مختلف ذہنی و جسمانی قوتوں کو ایک خاص تناسب کے ساتھ رکھنا، جس سے وہ ایک امتیازی انسان بن کر اٹھے۔ کیا یہ ایک خالق کے سوا کسی اور کا کام ہو سکتا ہے؟ یا اس میں ذرہ برابر بھی کسی دوسرے کا کوئی دخل ہے؟ پھر یہ فیصلہ کرنا بھی اللہ کے اختیار میں ہے کہ بچہ لڑکی ہو یا لڑکا۔ خوش شکل ہو یا بد شکل، اس کے نقوش تیکھے ہوں یا بھدے؟ طاقت ور اور قد کاٹھ والا ہو یا

کمزور نحیف اور تھوڑے وزن والا، تندرست ہو یا اندھا، بہرا، لنگڑا، ذہین ہو یا کند ذہن۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جو خالصتاً اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات کے اختیار میں ہیں۔ کیا ان سب باتوں کو سمجھ لینے کے بعد بھی انسان یہ تصدیق نہیں کر سکتا کہ اسے پیدا کرنے والا اللہ رب العالمین ہی ہو سکتا ہے اور جو مردہ غذاؤں سے ہر روز لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں انسان اور دوسرے جان دار پیدا کر رہا ہے، وہ مردہ انسانوں کے بے جان ذرات سے پھر انھیں دوبارہ زندگی نہیں بخش سکتا؟" [ماخوذ از: تیسیر القرآن ۴/ ۳۶۲-۳۶۳]

زیرِ مطالعہ حدیث سے ایک اہم نکتے کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ ایک سو بیس دنوں کے بعد شکمِ مادر میں جنین کے اندر روح پھونک دی جاتی ہے، لہٰذا اگر اتنی مدت کے بعد کوئی ناتمام بچہ ہوتا ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ فرشتے کے روح پھونکنے کے بعد اس کی موت ہوئی ہے، اس لیے بہتر و مناسب یہی ہے کہ جس طرح عام مردوں کی تجہیز و تکفین کی جاتی ہے اور نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے، وہی معاملہ اس ناتمام بچے کے ساتھ بھی کیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

ساتھ ہی حدیث کے دوسرے ٹکڑے میں اس بات کی بھی صراحت کی گئی ہے کہ انسان کے اعمال کا دار و مدار اس کے خاتمے پر ہے اور وہ اپنے بارے میں اللہ کی جانب سے لکھی تقدیر کے مطابق جنتیوں یا جہنمیوں والا عمل کرتا ہے، اس لیے اللہ رب العالمین کے حضور اپنے حسنِ خاتمہ کے لیے خصوصی دعا کرتے رہنا چاہیے۔ اسی طرح اس حدیثِ نبوی سے ہمیں یہ رہنمائی بھی ملتی ہے کہ کسی بھی شخص کے ظاہری اعمال کو دیکھ کر اس کے متعلق قطعی طور پر جنتی ہونے یا قطعی طور پر جہنمی ہونے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے یعنی کسی کے متعلق جنتی یا جہنمی ہونے کی سرٹیفکیٹ نہیں دینی چاہیے، جیسا کہ ہمارے اس دور میں بہت سے لوگوں کا یہ معمول بن چکا ہے کہ کسی کے کسی اچھے یا بُرے عمل کو دیکھ کر جھٹ اس کے بارے میں جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ صادر فرمادیتے ہیں، جب کہ یہ عین ممکن ہے کہ زندگی کے آخری لمحے میں کسی کو توبہ اور عملِ صالح کرنے کی توفیق مل جائے یا بظاہر نیک اعمال انجام دینے والا شخص گمراہی کا شکار ہو جائے۔ اسی لیے کتاب و سنت میں ہمیں یہ دعا سکھلائی گئی ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنتَ ٱلْوَهَّابُ﴾ "اے ہمارے رب! ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر، اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں

اپنے پاس سے رحمت عطا فرما، بے شک تو ہی بے حد عطا کرنے والا ہے۔" [آل عمران:۸]

((يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ! ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلَى دِيْنِكَ)) "اے دلوں کو الٹنے پلٹنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔" [صحیح / سنن ترمذی:۲۱۴۰، مسند احمد:۱۲۱۰۷]

((اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ! صَرِّفْ قُلُوبَنَا عَلَى طَاعَتِكَ)) "اے دلوں کے پھیرنے والے اللہ! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے۔" [صحیح مسلم:۲۶۵۴]

یہاں تقدیر کے مسئلے کو نا سمجھ پانے کی وجہ سے کوئی معترض یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ جب سب کچھ لکھا جا چکا ہے تو پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تقدیر سے متعلق قدرے تفصیلی گفتگو ہو جائے تا کہ اس مسئلے میں لوگ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

اللہ کی لکھی تقدیر پر ایمان لانا ایمانیات کا ایک اہم جزو اور اٹوٹ حصہ ہے، جیسا کہ حدیثِ جبریل میں یہ بات آچکی ہے۔ تقدیر کا مطلب ہے کہ ساری مخلوقات کے متعلق اللہ تعالیٰ کو ازل سے علم ہے اور جملہ مخلوقات اللہ تعالیٰ کے ارادے سے معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ اس نے سب کی تقدیر لوحِ محفوظ میں لکھ دی ہے، لہذا ہر حادث چیز کا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے ارادے سے حادث ہوئی ہے اور ہر چیز کو اس نے ایک مقررہ اندازے پر پیدا فرمایا ہے۔ تقدیر ایک الٰہی راز ہے، کسی کو اس کا علم نہیں ہے۔ **تقدیر پر ایمان لانے کے درج ذیل چار مراتب ہیں، جو ایمان بالقدر میں شامل ہیں اور جن پر ایمان لانا واجب ہے:**

❶ اس بات پر ایمان رکھنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ازلی وابدی علم کے ذریعہ کائنات کی ساری چیزوں کا جاننے والا ہے، خواہ اس کا تعلق اللہ کے اپنے فعل سے ہو یا مخلوق کے فعل سے ہو اور زمین و آسمان کی کوئی بھی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے نیز مخلوقات کے انجام کا بھی اسے علم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿.....وَأَنَّ ٱللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَىْءٍ عِلْمًا﴾ "اور یقیناً اللہ نے ہر چیز کو اپنے علم سے گھیر رکھا ہے۔" [الطلاق:۱۲]

❷ اس بات پر ایمان رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نے ماضی و مستقبل میں ہونے والی تمام چھوٹی بڑی چیزوں کو لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿.....وَكُلَّ شَىْءٍ أَحْصَيْنَٰهُ فِىٓ إِمَامٍ مُّبِينٍ﴾ "اور ہر چیز کو ہم نے ایک واضح کتاب (لوحِ محفوظ) میں ضبط کر رکھا ہے۔" [یٰس: ۱۲] **تقدیر لکھے جانے میں**

مندرجہ ذیل پانچ تقدیریں داخل ہیں اور سب کی سب علم کی طرف لوٹتی ہیں:

۱ - **تقدیر ازلی:** وہ تقدیر جسے اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے اور جو چھوٹی بڑی تمام چیزوں کو شامل ہے۔ جیسا کہ کتاب و سنت کے بہتیرے نصوص اس پر دلالت کرتے ہیں۔

۲ - **تقدیر عہدی:** یومِ میثاق کے وقت اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم سے جو یہ ﴿...أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ...﴾ [الأعراف:۱۷۲] عہد و پیمان لیا تھا اس وقت یہ تقدیر طے کی گئی تھی۔ اسے تقدیرِ عمری کہتے ہیں۔

۳ - **تقدیر عمری:** شکمِ مادر میں تخلیقِ نطفہ کے وقت بندہ کی روزی، اس کی موت، اس کا عمل اور وہ نیک ہو گا یا بد وغیرہ کی تقدیر، جیسا کہ زیرِ مطالعہ حدیث میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اسے بھی تقدیرِ عمری کہتے ہیں۔

۴ - **تقدیر سنوی:** ہر سال لیلۃ القدر کے اندر سال بھر میں ہونے والے امور لکھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾ ”اس رات (شبِ قدر) میں ہر محکم کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔“ [الدخان:۴] یعنی اس رات میں سال بھر کے فیصلے لوحِ محفوظ سے فرشتے کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ اسے تقدیر حولی بھی کہتے ہیں۔

۵ - **تقدیر یومی:** اس کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کا پہلے فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ لکھی جا چکی ہیں، انھیں روزانہ اپنے اپنے متعینہ وقت پر لے جایا جاتا ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ ہر روز کسی کی مغفرت فرماتا ہے، کسی کی پریشانی دور کرتا ہے، کچھ لوگوں کو بلند کرتا ہے اور کچھ لوگوں کو پست کرتا ہے وغیرہ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿....كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ ”ہر روز وہ ایک نئی شان میں ہے۔“ [الرحمٰن:۲۹]

تقدیرِ یومی دراصل سنوی تقدیر کی تفصیل ہے اور سنوی تقدیر، عمری تقدیر کی تفصیل ہے، جو شکم مادر کے اندر بچہ میں روح پھونکنے کے وقت طے ہوتی ہے اور عمری تقدیر اُس پہلی عہد و پیمان والی تقدیر کی تفصیل ہے، جو عہد و پیمان کے دن طے ہوئی ہے اور تقدیر عہدی عمری اُس ازلی تقدیر کی تفصیل ہے، جسے قلم نے لوحِ محفوظ میں ضبط و تحریر کر رکھا ہے۔

❸ اس بات پر ایمان رکھنا کہ ساری کائنات میں ہر چیز کا وجود و وقوع اللہ تعالیٰ کے ارادہ و مشیئت سے ہوتا ہے، وہ جو چاہے وہی ہوتا ہے اور جو نہ چاہے نہیں ہو سکتا، اس نے جو چاہا وہ ہوا اور جو نہیں چاہا تو وہ

نہیں ہوا، وہ کرنے اور نہ کرنے دونوں پر قادر ہے، کوئی اسے عاجز نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿....وَلَوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَا ٱقْتَتَلُواْ وَلَـٰكِنَّ ٱللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ﴾ "اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے اور لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" [البقرۃ:۲۵۳] ﴿...وَيَفْعَلُ ٱللَّهُ مَا يَشَآءُ﴾ "اور وہ (اللہ) جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" [ابراہیم:۲۷] واضح رہے کہ **اللہ کے ارادہ ومشیئت کی دو قسمیں ہیں :**

① **ارادۂ کونی وقدری:** اسے مشیئت بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ کتاب و سنت میں مشیئت کا ذکر کونی اور قدری طور پر ہی آیا ہے۔ اس ارادے میں تمام وہ چیزیں شامل ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ کرنا اور وجود میں لانا چاہتا ہے اس میں خیر وشر، کفر وشرک، پسند وناپسند اور طاعت ومعصیت وغیرہ سب شامل ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا ایسا وصف ہے کہ کوئی بھی اس سے خارج نہیں ہے، چناں چہ وہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ "کر گزرنے والا ہے جو چاہتا ہے۔" [البروج:۱۶] ﴿إِنَّما أَمرُهُ إِذا أَرادَ شَيـًٔا أَنْ يَّقُوْلَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ "اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔" [یٰسٓ:۸۲]

② **ارادۂ شرعی ودینی:** یہ ارادہ اللہ تعالیٰ کی مرضی وپسند کے ساتھ خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارادہ کا تعلق ان افعالِ خیر اور اعمالِ صالحہ سے ہے، جن کو وہ پسند فرماتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَاللَّهُ يُرِيْدُ أَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ.....﴾ "اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی فرمائے۔" [النساء:۲۷]

چناں چہ کفر ومعصیت کے کام اللہ تعالیٰ کے کونی ارادے کے ماتحت انجام پاتے ہیں جب کہ ان کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کا شرعی ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انجام نہ پائیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اطاعت شعار بندوں کے حق میں ارادہ کی دونوں قسمیں اکٹھا ہو جاتی ہیں یعنی کونی اور شرعی ہر دو اعتبار سے اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو چاہتا ہے اور گناہ گاروں کے حق میں ارادہ کی صرف ایک قسم ارادۂ کونی پائی جاتی ہے اور ارادۂ شرعی نہیں پائی جاتی یعنی گناہوں کے وقوع پذیر ہونے کو کونی اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، مگر شرعی اعتبار سے نہیں چاہتا ہے یعنی کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت اور ارادۂ کونی کے تحت ہو رہا ہے اور تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے اور اس کا کیا ارادہ ہے اسے کوئی نہیں جانتا ہے، البتہ ارادۂ شرعی کے طور پر وہ جن چیزوں کو پسند فرماتا ہے اور جن سے راضی ہے ان کو بتلانے کے لیے اللہ تعالیٰ

نے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور کتابیں نازل کیں، اس سلسلے کی آخری کڑی نبینا محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور آخری کتاب قرآن کریم ہے، اس لیے ہم شریعت پر عمل کے پابند ہیں۔ ارادے کی مذکورہ دونوں قسمیں لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنْ تَكْفُرُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَ لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَ إِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ .....﴾ [الزمر:۷] ”اگر تم ناشکری کرو تو یقیناً اللہ تم سے بہت بے پرواہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمھارے لیے پسند کرے گا۔“ یعنی کفر اور ناشکری اللہ کے ارادے کے بغیر نہیں ہو سکتی، مگر وہ نہ اس پر راضی ہے نہ اسے پسند کرتا ہے۔

4 اس بات پر ایمان رکھنا کہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی ہے، وہ ہر چیز کا خالق ہے اور سب اس کی مخلوق ہیں، اسی نے ساری مخلوق کی ذات وصفات اور حرکات و افعال کو پیدا کیا ہے، وہی ساری مخلوقات کا معبودِ حقیقی اور رب و خالق ہے اور کائنات کی کوئی بھی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ﴾ ”اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔“ [الزمر:٦٢]

جبریہ اور قدریہ وغیرہ گمراہ فرقوں نے تقدیر سے متعلق افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ جبریہ کا کہنا ہے کہ بندے اپنے افعال کو انجام دینے کے لیے مجبور محض ہیں اور انھیں اپنے افعال پر کوئی اختیار نہیں حاصل ہے، جب کہ حقیقت میں بندے خود اپنے افعال کے فاعل ہیں اور اللہ نے ان کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے جو چاہیں کریں۔ اور قدریہ تقدیر کا انکار کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ نہیں ہے، بلکہ بندے خود اپنے افعال کے خالق ہیں اور اللہ کے ارادہ و مشیئت کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ حالاں کہ یہ عقیدہ بھی باطل ہے، کیوں کہ جہاں بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے افعال پر اختیار حاصل ہے وہیں یہ سارے افعال اللہ کے ارادہ و مشیئت سے وجود پذیر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بندوں اور ان کے افعال کا خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ ”حالاں کہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔“ [الصافات : ٩٦] دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ

الْعَالَمِينَ﴾ ”اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے۔“ [التکویر:۲۹]

مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ سے تقدیر کے باب میں گمراہ فرقے جبریہ اور قدریہ دونوں کی تردید ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ دنیا میں وقوع پذیر ساری چیزیں تقدیرِ الٰہی کے مطابق ہوتی ہیں، اللہ کو پہلے ہی سے اس کا علم ہے اور خیر و شر کو بھی اللہ نے پہلے ہی سے مقرر کر رکھا ہے، اسی کے مطابق وہ وجود میں آتی ہیں، ہر ایک چیز اسی کے حکم اور ارادہ ومشیئت کے تحت انجام پاتی ہیں، وہ بندوں کا اور ان کے افعال و حرکات اور دیگر ساری چیزوں کا خالق ہے۔ اسی کے ساتھ اللہ نے حق و باطل کو واضح کر کے بندوں کو اچھا یا برا کام کرنے کا اختیار دے رکھا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے چاہیں خیر کی راہ کو چنیں یا شر کی راہ پر چل نکلیں، البتہ یہ سب اس کے ارادہ ومشیئت کے تحت ہوتی ہیں اور اسے ان سب چیزوں کا علم ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ ”بے شک ہم نے اسے (ہدایت و گمراہی کا) راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ کفر کرنے والا۔“ [الانسان:۳] ﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ .....﴾ ”اور کہہ دے یہ حق تمھارے رب کی طرف سے ہے، پھر جو چاہے سو ایمان لے آئے اور جو چاہے سو کفر کرے۔“ [الکھف:۲۹]

حدیث میں صراحت کے ساتھ اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ لوگوں کی تقدیریں اور جنت و جہنم میں ان کے ٹھکانے لکھ دیے گئے ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! جب ہر چیز مقدر کر دی گئی ہے اور لکھ دی گئی ہے تو کیوں نہ ہم تقدیر پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعمال انجام دینے کی تلقین فرمائی کہ جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اسے انجام دو اور جن سے روکا گیا ہے ان سے باز رہو، کیوں کہ اچھے یا برے عمل ہی کی وجہ سے جنت یا جہنم حاصل ہو گی۔ [صحیح بخاری: ۱۳۶۲، ۴۹۴۵..تا..۴۹۴۹، ۶۲۱۷، ۶۶۰۵، ۷۵۵۲ و صحیح مسلم: ۲۶۴۷] اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان اللہ کی جانب سے کوئی کام کرنے یا نہ کرنے اور اپنے ارادہ واختیار میں خود مختار ہوتا ہے، مجبورِ محض نہیں ہوتا ہے اور انسان جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اور جو کچھ کر گزرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت وارادے کے مطابق ہوتا ہے۔ چناں چہ ہر فرد کو تقدیر ہی کے مطابق نیکی اور بھلائی کرنے کی توفیق ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ نیک بختوں کے لیے نیک

بختی کے کام کو آسان فرما دیتا ہے اور بد بختوں کے لیے بد بختی کے کام کو آسان فرما دیتا ہے۔ لہٰذا تقدیر کا سہارا لے کر نیک اعمال نہ کرنا، گناہوں کے کام انجام دینا اور معصیات پر تقدیر سے حجت پکڑنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ کوئی بھی عمل کرنے سے پہلے انسان اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کی لکھی تقدیر کے مطابق نیک یا بُرے افعال کے کرنے میں بااختیار ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شعور کی دولتِ بے بہا سے نواز رکھا ہے اور پھر رسولوں کو مبعوث فرما کر اور کتابیں نازل کر کے نیکی و بدی کی راہوں کو واضح کر دیا ہے۔ اب یہ انسان کی اپنی مرضی پر منحصر ہے چاہے تو اطاعتِ الٰہی کی راہ اپنا کر شکر گزار اور مومن بندہ بن جائے اور چاہے تو بدی کی راہوں کو اپنا کر کفر کرنے والا کافر بن جائے۔ اللہ رب العالمین نے اپنی واضح ہدایات کے ذریعہ جنت و جہنم میں لے جانی والی راہوں کے بیچ واضح لکیر کھینچ دی ہے اور یہ بالکل واضح کر دیا ہے کہ لوگ اپنے اعمالِ صالحہ یا اعمالِ بد کی وجہ سے جنت یا جہنم میں جائیں گے اگرچہ اللہ کے فضل و اکرام ہی کی وجہ سے آدمی کو نعمتوں والی جنت میسر ہوگی۔ مزید یہ کہ مخلوق میں سے کسی کو بھی تقدیرِ الٰہی کا راز معلوم نہیں ہے، اس لیے تقدیر کو حجت بنا کر اعمال کو ترک کرنا عقلاً و شرعاً کسی بھی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ انسان کا واجبی فریضہ یہ ہے کہ وہ حتی الامکان اوامر اور واجباتِ الٰہی کو بجا لائے اور محرمات و منہیات سے اجتناب کرے، کیوں کہ اللہ نے نیکی و بدی کو اسباب کے ساتھ مربوط کر رکھا ہے۔ یہ جائز و درست نہیں ہے کہ آدمی اپنی مرضی و اختیار سے گناہوں کو انجام دے اور نیک اعمال سے دوری اختیار کر لے اور پھر یہ حجت پکڑے کہ تقدیر میں ایسے ہی لکھا تھا، کیوں کہ انسان کو کوئی کام انجام دینے سے پہلے یہ پتا ہی نہیں ہوتا ہے کہ اس کی تقدیر میں کیا لکھا ہوا ہے؟ اس لیے گناہوں کے صدور کے بعد اللہ سے توبہ و استغفار کرنا چاہیے اور اپنے کیے پر نادم و پشیمان ہونا چاہیے۔

اسی طرح بعض وہ چیزیں جنھیں اللہ رب العزت نے انسان کی مقدر میں لکھ دیا ہے اور اس میں بندے کو کوئی اختیار نہیں حاصل ہے اس پر بھی ایمان لانا اور اللہ کی لکھی تقدیر پر رضامندی و صبر کا اظہار کرنا ضروری ہے۔ مثلاً انسان کے خوب صورت اور بد صورت ہونے میں، دراز قد اور پست قد ہونے میں، بیماریوں اور تکالیف میں مبتلا ہونے میں، آفاتِ ارضی و سماوی کے نزول میں اور موت و زندگی کے واقع

ہونے میں بندوں کے ارداہ و اختیار کو دخل نہیں ہے، البتہ مختلف طرح کے مصائب و تکالیف اور آفاتِ ارضی و سماوی کا نزول کبھی بطور سزا ہوتی ہیں یعنی مکافاتِ اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں اور کبھی بطور امتحان اور آزمائش ہوتی ہیں اور اس کے ذریعہ اللہ بندوں کے درجات کو بلند فرماتا ہے۔ اللہ رب العالمین نے فرمایا :

﴿مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ ”کوئی مصیبت نہ زمین پر پہنچتی ہے اور نہ تمھاری جانوں پر مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔ یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے تاکہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمھیں عطا فرمائے اور اللہ کسی تکبر کرنے والے، بہت فخر کرنے والے سے محبت نہیں رکھتا۔“ [الحدید:۲۲-۲۳]

البتہ مصائب و تکالیف اور آفات وغیرہ پر تقدیر کو حجت بنانا جائز ہے، یعنی آدمی پر جب مصیبتیں آئیں، جو اس کے اختیار میں نہیں ہیں تو انھیں تقدیر کے حوالے کرکے ان پر صبر و شکر سے کام لے اور جزع فزع کرنے کے بجائے یہ کہے: ”قَدَرُ اللَّهِ وَمَا شَاءَ فَعَلَ“ ”اللہ نے تقدیر میں اسی طرح لکھا تھا اور جو اس نے چاہا کر دیا۔“ جیسا کہ آدم اور موسیٰ علیہما السلام کے درمیان جب بحث و مباحثہ ہوا تو آدم علیہ السلام نے مصیبت پر تقدیر سے حجت پکڑی۔ اسی طرح گناہوں کے صدور کے بعد جب بندہ توبہ و استغفار کرلے اور دوبارہ اسے نہ کرنے کا عزم مصمم کرلے تو ایسے شخص کے لیے تقدیر سے حجت پکڑنا درست ہوگا، کیوں کہ توبۂ نصوح کے بعد آدمی اس طرح ہو جاتا ہے گویا اس نے وہ گناہ کیا ہی نہیں ہے، لہٰذا کسی کو توبہ و استغفار کے بعد اس کے گناہوں کی وجہ سے لعنت ملامت کرنا اور پچھلی زندگی کا حوالہ دے کر اسے بُرا بھلا کہنا درست نہیں ہوگا۔

گناہوں اور کفر و شرک پر توبہ و استغفار کرنے کے بجائے ہٹ دھرمی اختیار کرتے ہوئے تقدیر سے استدلال کرنا اور تقدیر کا سہارا لے کر یہ کہنا کہ ایسا ہماری تقدیر میں لکھا ہے، قطعی طور پر درست نہیں ہے، بلکہ یہ کفار و مشرکین کا طریقہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا

وَلَا حَرَّمْنَا مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ ”اور جن لوگوں نے (اللہ کے ساتھ) شریک بنائے انھوں نے کہا کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی کی عبادت کرتے اور نہ ہم اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے کیا جو ان سے پہلے تھے تو رسولوں کے ذمے صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا اور کیا ہے؟“ [النحل:۳۵]

تقدیر سے متعلق کتاب و سنت میں بہت سے دلائل وارد ہوئے ہیں، جو اس پر ایمان لانے کی فرضیت و وجوبیت اور اس کی قطعیت پر دلالت کرتے ہیں، مگر بعض ثابت شدہ نصوصِ کتاب و سنت آپس میں بظاہر متعارض معلوم ہوتی ہیں، اس لیے ان نصوص کے معانی و مفاہیم کو سمجھنا بھی ضروری ہے تا کہ تقدیر سے متعلق ہم کسی طرح کی غلط فہمی یا گمراہی کا شکار نہ ہوں اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والے اشکال کو رفع کیا جا سکے۔ چناں چہ تقدیر کے بارے میں سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كَتَبَ اللَّهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ، قَالَ: وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ)) ”اللہ نے تمام مخلوقات کی تقدیریں آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیں۔“ فرمایا: ”اور (اس وقت) اس کا عرش پانی پر تھا۔“ [صحیح مسلم:۲۶۵۳]

اسی طرح سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ: ((رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجُفَّتِ الصُّحُفُ)) ”قلم اٹھا لیے گئے اور صحیفے خشک ہو چکے۔“ [صحیح / سنن ترمذی:۲۵۱۶] نیز سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((يَا أَبَا هُرَيْرَةَ! جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا أَنْتَ لَاقٍ)) ”اے ابو ہریرہ! جس حال یا چیز کو تم ملنے والے ہو، قلم اس کے ساتھ خشک ہو چکا ہے۔“ [صحیح بخاری : ۵۰۷۶]

مذکورہ احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوا کہ مخلوقات کی تقدیر لکھی جا چکی ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو قلم سے جو کچھ لکھوانا تھا وہ لکھ دیا گیا اور قلم لکھ کر خشک ہو چکا ہے اور صحیفۂ تقدیر بھی خشک ہو گیا۔ اب مزید اس میں کچھ لکھا نہیں جائے گا، دنیا میں جو کچھ واقع ہو گا یا مخلوقات کو جو کچھ بھی ملے گا وہ نوشتۂ تقدیر کے مطابق ہو گا اور اس میں کمی بیشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس مفہوم میں احادیثِ نبویہ کے علاوہ

بہت سی قرآنی آیات بھی موجود ہیں۔

جب کہ ان نصوص کے بالمقابل کچھ ایسے نصوص بھی وارد ہوئے ہیں، جن سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر میں ردوبدل کی گنجائش ہے، جیسا کہ اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿يَمْحُواْ اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ ”اللہ جو چاہے مٹا دے اور جو چاہے ثابت رکھے، اسی کے پاس لوحِ محفوظ ہے۔“ [الرعد:٣٩] دوسری جگہ فرمایا:﴿مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ”جو بھی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں، اس سے بہتر یا اس جیسی (اور) لے آتے ہیں، کیا تو نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“ [البقرۃ:١٠٦]

یہ دونوں آیاتِ کریمہ اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ رب العزت اپنے احکام میں محو و اثبات اور منسوخ و ناسخ کرتا ہے۔ جب کہ یہود اپنے کفر اور محض اپنے خواہشِ نفس کی پیروی میں نسخ کا انکار کرتے تھے حالاں کہ توریت میں بھی نسخ موجود ہے۔ چناں چہ سیدِ ولد آدم، خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو دی گئی ہماری اس شریعت میں پہلی شریعتوں کے بہت سے احکام منسوخ اور محو کر دیے گئے ہیں، جو اللہ رب العالمین کی حکمتِ بالغہ اور علم و قدرتِ کاملہ کی واضح دلیل ہیں اور یہ ہم پر اس کا فضلِ خاص ہے اور یہ ساری تبدیلیاں پہلے ہی سے اللہ کے علم میں تھیں۔

سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((لاَ يَرُدُّ الْقَضَاءَ إِلاَّ الدُّعَاءُ وَلَا يَزِيْدُ فِي الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرُّ)) ”قضاوقدر کو صرف دعا ٹال سکتی ہے اور عمر میں صرف نیکی سے اضافہ ہوتا ہے۔“ [حسن/ترمذی : ٢١٣٩، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ:١٥٤] اسی طرح سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِيْ رِزْقِهِ وَيُنْسَأَ لَهُ فِيْ أَثَرِهِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ)) ”جو پسند کرتا ہے کہ اس کے رزق میں اور اس کی عمر میں اضافہ و برکت ہو، اسے چاہیے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔“ [صحیح بخاری : ٢٠٦٧، ٥٩٨٦، صحیح مسلم : ٢٥٥٧]

اوپر کی دونوں آیاتِ کریمہ اور احادیثِ صحیحہ سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر میں ردو بدل ہوتا رہتا ہے۔ مفسرین و محدثینِ کرام رحمہم اللہ نے اس کا جواب دو طرح سے دیا ہے:

❶ **ایک جواب تو اس طرح دیا ہے کہ ام الکتاب** یعنی لوحِ محفوظ اللہ کے پاس ہے، اس میں کسی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ کسی حکم کو باقی رکھنا اور کسی حکم کو منسوخ کرنا اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وقت اور حالات کے اعتبار سے وہی احکام و شرائع میں تبدیلی و تنسیخ کرتا ہے اور یہ سب کچھ اس کے علم اور مقرر کیے ہوئے تقدیر و اندازے کے مطابق ہوتا ہے، اس کا علم ازلی ہے اور اس نے ام الکتاب میں ساری چیزیں لکھ دی ہیں، اسی تقدیر کا حصہ یہ بھی ہے کہ کون سا حکم کب تک باقی رکھنا ہے اور اسے کب منسوخ کرنا ہے، کون سے اسباب کی وجہ سے مسببات میں تبدیلی ہوگی اور کب ہوگی؟ یہ ساری چیزیں اسے معلوم ہیں اور ایک اندازے کے مطابق انھیں طے کر دیا ہے اور اسی کے اعتبار سے یہ وجود میں آتی ہیں۔ چناں چہ یہ محو و اثبات، رزق میں کمی و کشادگی، عمروں میں اضافہ و کمی اور نامۂ اعمال میں اچھے و برے عمل میں سے کسی کو مٹانا یا کسی کو بڑھانا وغیرہ قضا و قدر کا حصہ ہیں۔ ماضی قریب کے نامور مفسرِ قرآن شیخ عبد الرحمان السعدی رحمہ اللہ سورۂ رعد کی مذکورہ بالا آیتِ کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"﴿يَمْحُواْ اللَّـهُ مَا يَشَاءُ...﴾ "اللہ جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے۔" یعنی وہ اپنی مقرر کردہ تقدیر میں سے جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے۔ ﴿وَيُثْبِتُ﴾ "اور قائم رکھتا ہے۔" یعنی اس تقدیر میں سے جو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور یہ تغیر اور محو کرنا ان امور کے علاوہ ہے، جن کو اس کا قلم تقدیر لکھ چکا ہے۔ پس ان امور میں تغیر و تبدیل نہیں ہوتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ محال ہے کہ اس کے علم میں کوئی نقص یا خلل ہو۔ اس لیے فرمایا: ﴿وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ "اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔" یعنی اس کے پاس لوحِ محفوظ ہے۔ جس کی طرف تمام اشیاء لوٹتی ہیں یہ اصل ہے اور باقی تمام اشیاء اس کی فروع ہیں۔ پس تغیر و تبدل فروع میں واقع ہوتا ہے، مثلاً روز و شب کے اعمال جن کو فرشتے لکھ لیتے ہیں اور ان اعمال کو قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ اسباب فراہم کرتا ہے اور ان کو محو کرنے کے لیے بھی اسباب مہیا کرتا ہے اور یہ اسباب اس نوشتۂ تقدیر سے تجاوز نہیں کرتے جو لوح محفوظ میں مرقوم ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے نیکی، صلہ رحمی اور احسان کو لمبی عمر اور کشائشِ رزق کے لیے اسباب بنایا ہے، جیسے گناہوں کو رزق اور عمر میں بے برکتی کا سبب بنایا ہے اور جیسے ہلاکت سے نجات کے اسباب کو سلامتی کا سبب

بنایا اور جیسے ہلاکت کے مواقع میں پڑنے کو ہلاکت کا سبب بنایا۔ پس اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور ارادے کے مطابق تمام امور کی تدبیر کرتا ہے، اس کی تدبیر اس کے مخالف نہیں ہوتی جسے اس نے اپنے علم کے مطابق لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے۔" [تفسیر سعدی، ص:۱۳۳۰-۱۳۳۱]

❷ اس کا دوسرا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ دراصل تقدیر کی دو قسمیں ہیں :

① ایک تقدیر مُبرَم یا تقدیر ثابت ہے، جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ اوپر پہلی قسم کے تحت جو احادیث بیان ہوئی ہیں اس سے مراد یہی تقدیرِ مبرم ہے کہ قلم خشک ہو چکا اور صحیفہ ٔتقدیر میں جو کچھ لکھا جانا تھا لکھا جا چکا ہے۔

② اور دوسری قسم تقدیرِ معلق ہے، جو اسباب کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے یعنی اسباب کے تحت بدلتی رہتی ہے، جیسا کہ اوپر دوسری قسم کے تحت تقدیر کے ردوبدل کے ضمن میں جو احادیث اور دونوں آیتیں نقل کی گئی ہیں ان کا تعلق اسی تقدیر سے ہے اور یہ بھی اللہ کے علم میں ہے نیز اسباب اور تبدیلی وغیرہ سب کچھ لوحِ محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً کسی مصیبت میں گرفتار شخص اللہ سے دعا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اس مصیبت سے آزاد کر دیتا ہے تو مصیبت میں گرفتار ہونا اور اس سے چھٹکارے کے لیے دعا کا سہارا لینا اور پھر دعا کی وجہ سے مصیبت کا ٹلنا یہ ساری چیزیں لوحِ محفوظ میں پہلے ہی سے لکھی جا چکی ہیں، ایسا نہیں ہے کہ اس کی تقدیر میں مصیبت میں گرفتار ہونا لکھا تھا اور پھر دعا سے تقدیر بدل گئی اور معاذ اللہ یہ دعا تقدیر کا حصہ نہیں تھی، بلکہ یہ دونوں تقدیر کا حصہ تھیں اور اللہ کے علم کے مطابق تھیں۔ ہمیں چوں کہ آیندہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہے، اس لیے حصولِ جنت کے لیے جو اسباب ووسائل بیان کیے گئے ہیں، انھیں بروئے کار لانا اور جہنم میں پہنچانے والے اسباب و وسائل سے بچنا ضروری ہے اور یہی شرعی مطالبہ ہے، جیسا کہ ہم اپنے مختلف دنیاوی امور سے متعلق تقدیر کا سہارا لے کر بیٹھ نہیں رہتے ہیں بلکہ رزق کی کشادگی کے لیے، آفات و مصائب اور موت و بیماری سے بچنے کے لے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور یہ سوچ کر بیٹھ نہیں جاتے ہیں کہ جو ہماری تقدیر میں لکھا ہوگا وہ مل کر رہے گا جب کہ ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ موت کا ایک دن متعین ہے، بیماری اور حوادث کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ٹال نہیں سکتا ہے اور جتنی رزق ہماری قسمت میں لکھی ہے وہ مل کر رہے گی، لیکن اس کے باوجود بھی خوب کوشش کرتے ہیں،

اس لیے اپنے اُخروی انجام کو بہتر بنانے کے لیے شرعی احکام کی پیروی لازم ہے اور بہتر انجام کے حصول کے لیے کتاب و سنت کے احکام و فرامین پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے، کیوں کہ ہمیں نہیں معلوم ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے یہاں ہمارا انجام کیا ہو گا اور ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟

مذکورہ تفصیل سے اللہ تعالیٰ کی قضاو قدر اور فیصلے کے نہ بدل سکنے کے عقیدے اور ان تمام آیات و احادیث اور اس ضمن میں وارد بعض صحابۂ کرام کی دعاؤں کے متعلق کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات تقدیر بدل سکتی ہے، کے درمیان پیدا ہونے والا اشکال ختم ہو جاتا ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ کی لکھی تقدیر بدل نہیں سکتی ہے۔

خیر و شر اور دیگر تمام امور اللہ تعالیٰ کی لکھی تقدیر کا حصہ ہیں اور یہ سب اللہ کی قضاو قدر اور ارادے سے ہوتی ہیں اور اللہ ان سب کا خالق ہے۔ لیکن صحیح مسلم وغیرہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لمبی دعا میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

((وَالْخَيْرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ)) ''ہر طرح کی بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے اور شر تیری طرف منسوب نہیں ہے۔'' [صحیح مسلم: ۷۷۱]

اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شر اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر سے واقع نہیں ہوتا، حالاں کہ اس کا یہ مفہوم درست نہیں ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی مدح و ثنا بیان کرنے میں ادب اختیار کرنے کی رہنمائی پائی جاتی ہے کہ محاسن و اچھے امور کی نسبت اللہ کی طرف کی جائے اور جملہ بُرے امور کو بطور ادب اس کی جانب منسوب نہ کی جائیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شر کی نسبت جو تقدیر کی طرف کی جاتی ہے وہ مقدور لہ کے اعتبار سے شر ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے فاعل ہونے کے اعتبار سے شر نہیں ہوتی ہے اور یہ عام مشاہدہ ہے کہ بعض امور کسی کے لیے بہتر معلوم ہوتی ہیں تو کسی کے لیے پریشانی کا باعث ہوتی ہیں۔

امام نووی رحمہ اللہ نے ''وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ'' کے مفہوم کے متعلق علماء و محدثین کے حوالے سے درج ذیل پانچ اقوال ذکر کیے ہیں:

1. اس کا مفہوم یہ ہے کہ شر کے ذریعہ تیری قربت و نزدیکی نہیں حاصل کی جا سکتی ہے۔
2. اس کا مفہوم یہ ہے کہ انفرادی طور پر صرف شر کی نسبت تیری طرف نہیں کی جا سکتی۔ چناں چہ ''یا

خالق القردة"، "**يا خالق الخنازير**" اور "**يا رب الشر**" وغیرہ نہیں کہا جاتا ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ ساری چیزوں کا خالق اور رب ہے۔ ایسی صورت میں شر عام شرعی دلائل کے عموم میں داخل ہے۔

3. اس کا مفہوم یہ ہے کہ شر تیری طرف نہیں چڑھتا، یقینی طور پر تیری طرف پاکیزہ کلمات اور عمل صالح چڑھتے ہیں اور انھیں کو اللہ قبول فرماتا ہے۔

4. اس کا مفہوم یہ ہے کہ شر تیری طرف منسوب ہونے کے لحاظ سے شر نہیں ہے، کیوں کہ تو نے اسے حکمتِ بالغہ کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ ہاں! البتہ مخلوقات کے لحاظ سے وہ شر ہے۔

5. عربی میں إلی کے استعمال کے ساتھ ایک جملہ بولا جاتا ہے کہ "**فلان إلى بني فلان**" جب کہ وہ اسی میں شمار کیا جاتا ہے اور انھیں کے ساتھ ہوتا ہے ایسے ہی یہ جملہ بھی ہے۔ [المنہاج فی شرح صحیح مسلم، ص:۵۲۵]

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

تعارف راویِ حدیث:

سیدنا ابو عبد الرحمان عبد اللہ بن مسعود بن غافل بن حبیب ہذلی رضی اللہ عنہ معروف فقیہ صحابی ہیں۔ ان کی ماں بھی بنو ہذیل سے تھیں، جن کا نام ام عبد بنت عبد ود بن سوداء تھا۔ اسی وجہ سے یہ ابن ام عبد کی کنیت سے بھی مشہور ہیں۔ قدیم الاسلام ہونے کی وجہ سے انھیں طویل عرصہ تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نصیب ہوئی اور دو ہجرتوں کا شرف حاصل ہوا۔ یہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ غزوۂ بدر اور دیگر غزوات میں شریک رہے نیز ابو جہل کا سر اس کے جسم سے جدا کرنے والے یہی ہیں جب کہ اس دشمنِ اسلام کا کام تمام کرنے والے دو نو عمر صحابی معاذ اور معوذ رضی اللہ عنہما ہیں۔ خلیفۂ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اور پھر خلیفۂ سوم عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے شروع دورِ خلافت میں کوفہ کے گورنر و قاضی مقرر ہوئے اور پھر مدینہ واپس آ گئے۔ ساٹھ سال کی عمر میں ۳۲ ہجری میں مدینہ کے اندر آپ کی وفات ہوئی اور بقیع غرقد میں دفن کیے گئے۔ ان سے (۸۴۸) حدیثیں مروی ہیں۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

اتباعِ سنت کی اہمیت اور بدعت کی مذمت

(۵) عَنْ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ أُمِّ عَبْدِ اللَّهِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ: ((**مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ**))

ام المؤمنین ام عبد اللہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسا کام جاری کیا جو کہ اس میں نہیں ہے تو وہ (عمل) مردود ہے۔“ (صحیح بخاری: ۲۶۹۷، صحیح مسلم: ۱۷۱۸) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے: ”جو شخص کوئی ایسا عمل کرے جس پر ہمارا حکم نہیں ہے (یعنی وہ ہمارے دین کے مطابق نہ ہو) تو وہ مردود ہے۔“

شرح و فوائد :

فِي أَمْرِنَا : امر سے مراد دین ہے، جیسا کہ ایک روایت میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ((**مَنْ أَحْدَثَ فِي دِيْنِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ**)) ”جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو اس میں موجود نہیں تو وہ مردود ہے۔“ [جزء من حديث لوين : ٦٩، شرح السنة للبغوي : ١٠٣، حدیثِ لوین کی سند صحیح ہے اور شرح السنہ کی سند حسن ہے۔ دیکھیں: أضواء المصابیح في تحقیق مشکوٰۃ المصابیح ص:۱۹۲]

فَهُوَ رَدٌّ : پس وہ مردود ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ دین میں ایجاد شدہ نیا کام باطل و مردود ہے اور اس کے بطلان کی وجہ سے مسلمانوں کو بھی وہ کام قبول نہیں کرنا چاہیے۔ یہ مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ نیا کام باطل و مردود ہونے کی وجہ سے کرنے والے پر لوٹا دیا جائے گا یعنی اس پر عمل کرنے والا بھی مردود اور قابلِ نفریں ہے۔ مسلمانوں کے ظاہری اعمال اگر سنت کے مطابق ہوئے تب تو وہ مقبول ہیں اور اگر سنت کے مطابق نہیں ہیں تو مردود ہوں گے یعنی کسی بھی عمل کے قبول ہونے کے لیے جہاں باطنی طور پر خلوص وللّٰہیت کا ہونا ضروری ہے وہیں ظاہری طور پر اتباعِ سنت کا ہونا بھی لازمی شرط ہے۔

یہ جامع ترین حدیثِ نبوی انسان کے ظاہر اعمال کو پرکھنے کا یہ عظیم اصول فراہم کرتی ہے کہ ظاہرِ اعمال کی قبولیت کے لیے اتباعِ سنت کا ہونا ضروری ہے، جس طرح کہ اعمال کی قبولیت کے لیے نیت کا خالص ہونا یعنی اللہ کی رضا و خوشنودی کا پایا جانا ضروری ہے، چناں چہ ہر وہ قول و عمل جو شریعت کے

مطابق نہ ہو اور کتاب و سنت کے نصوص، صراحتاً یا اشارۃً یا استنباطاً اس پر دلالت نہ کرتے ہوں یا وہ اجماع اور آثارِ صحابہ سے ثابت نہ ہوں، وہ اللہ کے نزدیک ناقابلِ قبول، باطل اور مردود ہیں اور مسلمانوں کو بھی ایسے بدعی اعمال قبول نہیں کرنا چاہیے۔ شرعی دلائل سے عاری دین میں ہر نئی چیز بدعت ہے خواہ اس کا تعلق اعتقادی امور سے ہو یا وہ اعمال وعبادات کے قبیل سے ہوں۔ البتہ جن دنیاوی ایجادات کا تعلق دین وشرع سے نہ ہو وہ شرعی بدعت نہیں ہیں، بلکہ حدیثِ رسول: ((أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ)) "تم اپنی دنیا کے معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔" [صحیح مسلم: ۲۳۶۳] کی رُو سے تمام دنیاوی ایجادات جائز ہوں گی بشرط یہ کہ ان سے شریعت کے اصولوں کی مخالفت نہ ہوتی ہو اور اگر دنیاوی امور و ایجادات شرعی اصولوں اور کتاب و سنت کی تعلیمات کے خلاف ہوں تو وہ ممنوع ہوں گی۔

دین میں نئی نئی چیزوں کو ایجاد کرنے سے بچنا اور ان ایجاد شدہ بدعتوں کو چھوڑنا واجب ہے اور کسی کے لیے اس نئے کام کی اتباع اور تقلید کرنا جائز نہیں ہے، خواہ کرنے والے نے خود اس کی ایجاد کی ہو یا کسی اور کی طرف سے وہ ایجاد کی گئی ہو یعنی دین میں نئی نئی چیزوں کا ایجاد کرنا بھی مردود ہے اور محدثات و بدعات پر عمل کرنا بھی مردود ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے اور اس حدیث سے یہ عظیم قاعدہ معلوم ہوتا ہے کہ عبادات میں اصل ممنوع اور حرام ہونا ہے، لہٰذا کسی بھی عبادت کی مشروعیت کے لیے شرعی دلیل کا ہونا ضروری ہے۔

یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ دین کامل و مکمل ہے اور اب اس میں اپنی عقل و رائے کی بنیاد پر کسی طرح کی کمی و بیشی کی گنجائش باقی نہیں ہے۔ لہٰذا دین میں شریعت سے ہٹ کر کوئی نیا امر ایجاد کرنا محض شریعت سازی ہے اور ایسا شخص زبانِ قال سے نہ سہی زبانِ حال سے دین میں کمی و بیشی کرنے کا دعوے دار ہوتا ہے۔ گویا بدعت خلافِ شریعت عمل ہونے کے ساتھ ساتھ گمراہی، دین سے دوری، آپسی اختلاف و انتشار، فرقہ بندی اور دخولِ جہنم کا سبب بنتی ہے۔

کتاب و سنت کو چھوڑ کر اپنی جانب سے دین میں ایجاد کیا ہوا ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی کا باعث اور باطل و مردود ہے، خواہ لوگ اسے اچھا سمجھیں اور خلوصِ نیت سے ادا کریں، کیوں کہ کسی بھی عمل کی قبولیت کے لیے عقیدے کی درستی اور اخلاصِ نیت کے ساتھ ساتھ اس کا سنت و

شریعت کے موافق ہونا بھی ضروری ہے۔ معلوم ہوا کہ بدعت کی تقسیم حسنہ اور سیئہ کی طرف کرنا بھی باطل ہے، کیوں کہ شریعت میں بدعتِ حسنہ نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں اور حدیث میں کہا گیا ہے: ((وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ، وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ)) ''دین میں ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔'' [صحیح / سنن نسائی : ۱۵۷۸] یعنی بدعت اپنے ایجاد کرنے والے اور اس پر عمل کرنے والے دونوں کو جہنم میں لے جانے والی ہے۔ البتہ کسی مشروع کارِ خیر کی ابتدا کرنا یا اگر کوئی مسنون اور ثابت شدہ سنت، جہالت و نادانی یا سستی و کاہلی کی بنا پر عوام الناس سے او جھل ہو جائے یا لوگوں کے یہاں وہ معروف اور جاری نہ ہو تو اس سنت کی ابتدا کرنا یا اسے جاری کرنا بڑے اجر و ثواب کا کام ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْءٌ، وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ)) ''جس نے اسلام میں [کتاب و سنت سے ثابت] کوئی اچھا طریقہ رائج کیا تو اس کے لیے اس کے عمل کا اجر ہے اور ان کا اجر بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کریں، ان کے اجر میں کوئی کمی کیے بغیر اور جس نے اسلام میں کسی بُرے طریقے کو رائج کیا تو اس پر اس عمل کا بوجھ و گناہ ہے اور ان کا بوجھ بھی جنھوں نے اس کے بعد اس پر عمل کیا، ان کے بوجھ و گناہ میں کوئی کمی کیے بغیر۔'' [صحیح مسلم: ۱۰۱۷]

چناں چہ کسی بھی متروک سنت کو معاشرے میں رواج دینے یا کسی مشروع کام کی ابتدا کرنے کو لغوی اعتبار سے بدعت تو کہا جا سکتا ہے، مگر شرعاً وہ بدعت نہیں ہے، جیسا کہ باجماعت نمازِ تراویح کا اہتمام دیکھ کر امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ((نِعْمَ الْبِدْعَةُ هَذِهِ)) ''یہ اچھی بدعت ہے۔'' [صحیح بخاری: ۲۰۱۰] صحابیِ رسول اور دوسرے خلیفۂ راشد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس قول میں بدعت کو اس کے لغوی معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس طرح کی غلط فہمی سے بچنے کے لیے بدعت کی صحیح معرفت حاصل کرنا ہمارے لیے ضروری ہے، لہٰذا اس کی مختصر تفصیل درج ذیل سطور میں پیش کی جاتی ہے:

بدعت کے لغوی معنی ہیں: نیا کام، یا ایسا نیا کام جس کی پہلے سے کوئی نظیر نہ ہو اور **شرعی اصطلاح**

میں ثواب سمجھ کر کوئی ایسا اختراعی عمل انجام دینا جو شریعت سے مشابہت تو رکھتا ہو، مگر کتاب و سنت سے ثابت نہ ہو بدعت کہلاتا ہے۔ مثلاً: نصوصِ کتاب و سنت کا ایسا مطلب و مفہوم بیان کرنا جو نصوص کے خلاف ہو اور منہجِ فہمِ سلفِ صالحین سے مختلف ہو، جیسے: ایمان وصفاتِ باری تعالیٰ سے متعلق جہمیہ و معتزلہ وغیرہ گمراہ فرقوں کے باطل آراء واقوال وغیرہ، یا ایسی غیر مشروع عبادتوں کو انجام دینا جس کی اصل تو شریعت میں موجود ہو، مگر ایجاد کردہ نئے عبادت کی کوئی دلیل شریعت کے نصوص میں موجود نہ ہو، جیسے صلاۃِ الفیہ، صلاۃ الرغائب اور عید میلاد النبی وغیرہ، یا شریعت سے ثابت شدہ مشروع اعمال کو غیر مشروع طریقے سے انجام دینا، جیسے: مخصوص حلقہ تشکیل دے کر اَوراد و وظائف کا وِرد کرنا اور بطور زہد و ورع عبادات کی ادائیگی میں نفس پر بے جا سختی کرتے ہوئے نبوی طریقے کو ترک کر دینا وغیرہ، یا مشروع عبادتوں کی ادائیگی کے لیے ایسے اوقات اور جگہیں متعین کر لینا جو شریعت سے ثابت ہی نہ ہو، جیسے صلاۃِ عیدین وجنازہ کے موقع پر اذان دینا اور قبروں کا طواف کرنا وغیرہ۔

یہاں یہ بات جان لینا از حد ضروری ہے کہ زیرِ مطالعہ حدیث کی بنیاد پر کسی بھی عمل کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے شریعت کی متابعت و مطابقت ضروری ہے، کیوں کہ اگر وہ عمل شریعت کے مطابق نہیں ہے تو مردود ہو گا۔ نیز متابعتِ شریعت کے لیے درج ذیل چھ امور میں عمل کا شریعت کے موافق و مطابق ہونا ضروری ہے:

اوّل: عمل سبب میں شریعت کے موافق ہو، لہٰذا کسی مشروع عبادت کو اپنی طرف سے کسی ایسے سبب کے تحت انجام دینا جسے شریعت نے سبب نہ بنایا ہو مردود ہو گا۔ مثلاً: کوئی شخص جب بھی اپنے گھر میں داخل ہو تو بطور استحباب و سنت دو رکعت نماز پڑھے تو یہ مردود ہو گا، اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے چند ممنوع مقامات و اوقات کو چھوڑ کر کہیں بھی اور کسی بھی وقت نفل نماز پڑھنا جائز ہے، لیکن جب اسے کسی ایسے سبب کے ساتھ خاص کر لیا جائے جو شریعت سے ثابت نہیں ہے، تو وہ دین میں بدعت ہونے کی وجہ سے مردود ہو گا۔

دوم: عمل جنس میں شریعت کے موافق ہو، لہٰذا اللہ کے لیے کسی ایسی عبادت کو انجام دینا جس کی جنس کو مشروع نہیں قرار دیا گیا ہے مقبول ہونے کے بجائے مردود ہو گا۔ مثلاً: کوئی گھوڑے کی قربانی

کرے تو وہ مردود ہو گا اور اس کی قربانی مقبول نہیں ہو گی، اس لیے کہ اس صورت میں جنسِ قربانی کے تعلق سے شریعت کی مخالفت پائی جاتی ہے۔ شریعت نے "بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ" یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری [تمام کی نر و مادہ سمیت] کی قربانی کو مشروع قرار دیا ہے۔ البتہ گھوڑے کے گوشت کو عمومی صدقہ کرنے کے لیے ذبح کیا جائے تو یہ جائز ہو گا۔

سوم: عمل مقدار میں شریعت کے موافق ہو، لہٰذا شریعت کی بتائی ہوئی مقدار سے زیادہ تعداد میں عبادت انجام دینا باطل و مردود ہو گا۔ مثلاً: پانچ وقت کے بجائے چھ وقت کی نماز پڑھنا، نمازِ فجر دو رکعت کے بجائے تین رکعت پڑھنا اور اعضائے وضو تین کے بجائے چار مرتبہ دھونا وغیرہ، کیوں کہ ان میں تعداد کے تعلق سے شریعت کی مخالفت پائی جاتی ہے، اس لیے یہ مردود ہو گا۔

چہارم: عمل کیفیت میں شریعت کے موافق ہو، لہٰذا کسی بھی مشروع عبادت کو اس طرح انجام دینا جو کیفیت میں شریعت کے مخالف ہو مردود ہو گا قبول نہیں کیا جائے گا۔ مثلاً کوئی نمازی رکوع سے پہلے سجدہ کرے یا اسی طرح اعضائے وضو کو الٹی ترتیب سے دھوئے تو اس کی یہ نماز اور وضو کیفیت میں شریعت کے مخالف ہونے کی وجہ سے مردود اور باطل ہو گی۔

پنجم: عمل وقت میں شریعت کے موافق ہو، لہٰذا نمازِ عیدین سے پہلے قربانی کرنے یا نماز کا وقت ہونے سے پہلے ہی نماز پڑھ لینے کی صورت میں عبادت مقبول نہیں ہو گی، اس لیے کہ شریعت نے ان کے لیے جو وقت متعین کیا ہے اس کے موافق نہیں ہے۔

ششم: عمل جگہ میں شریعت کے موافق ہو، لہٰذا مسجدوں کے علاوہ کسی اور جگہ اعتکاف کرنا مثلاً: مدرسے یا گھر وغیرہ میں اعتکاف درست نہیں ہو گا، اس لیے کہ شریعت میں اعتکاف کے لیے مساجد کو متعین کیا گیا ہے اور مسجدوں کو چھوڑ کر کہیں اور اعتکاف کرنے کی صورت میں شریعت کی موافقت نہیں پائی جاتی ہے۔

اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے واسطے کوئی بھی عمل انجام دینے کے لیے مذکورہ چھ امور پر توجہ دینا اور انھیں دھیان میں رکھنا بے حد ضروری ہے، اس لیے کہ اگر ان امور میں شریعت کی موافقت نہیں پائی جائے گی تو وہ عمل بدعی ہونے کی وجہ سے باطل و مردود ہو گا۔

راویِ حدیث کا تعارف :

زہد وورع اور عفت و عصمت کی پیکر ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ بنت ابو بکر عبد اللہ بن ابو قحافہ عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تمیم بن مرہ قرشیہ تیمیہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چہیتی، باکرہ اور کم عمر بیوی ہیں۔ یہ ام المؤمنین اور حمیراء کے لقب سے مشہور ہیں اور ان کی کنیت ام عبد اللہ ہے، جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھانجے عبد اللہ بن زبیر کے نام پر تجویز فرمایا تھا۔ بعثتِ نبوی کے تقریباً چار یا پانچ سال بعد مکہ مکرمہ کے اندر پیدا ہوئیں۔ ان کی والدہ کا نام ام رومان بنت عامر بن عمیر کنانیہ ہے۔ ان کے والد والدہ اور دادا تینوں کو شرفِ صحابیت حاصل ہے رضی اللہ عنہم۔ ہجرت سے تین سال پہلے نبوت کے دسویں سال ماہ شوال میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نکاح ہوا اور ایک روایت کے مطابق ہجرت سے دو سال پہلے نکاح ہوا، جب کہ اس وقت ان کی عمر چھ سال مکمل ہو چکی تھی اور وہ ساتویں سال میں داخل ہو چکی تھیں اور نو سال کی عمر میں شوال یکم ہجری میں ان کی رخصتی ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں نو سال رہیں تمام ازواج مطہرات میں باکرہ ہونے کا امتیاز صرف انھیں کو حاصل ہے۔ یہ بڑی ذہین و فطین، فصیحہ وبلیغہ، عالمہ وفاضلہ، طب واشعارِ عرب کی ماہر اور جود وسخا کی پیکر صحابیہ ہیں اور ان سے بہ کثرت حدیثیں بھی مروی ہیں۔ عورتوں میں سب سے زیادہ فقیہہ، فہم و فراست میں بالاتر اور سیدہ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بعد تمام امہات المؤمنین میں سب سے افضل خاتون ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جب کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تو ان سے دریافت فرماتے اور وہ اسے حل فرماتیں، غرض کہ ان کے علم وفقہ سے لوگوں نے خوب فیض اٹھایا۔ سات ہجری میں منافقین کی جانب سے ان پر تہمت لگائی گئی، جس کی براءت میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی آیات نازل فرمائیں۔ جناب مسروق رحمہ اللہ کی یہ عادت تھی کہ جب بھی سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کوئی روایت بیان کرتے تو فرماتے: مجھ سے صدیق کی بیٹی صدیقہ اور اللہ کے محبوب کی محبوبہ نے حدیث بیان کی ہے۔ وفاتِ نبوی کے وقت ان کی عمر ۱۸ سال کی تھی اور ۶۷ سال میں ۱۷ / یا ۱۸ رمضان المبارک ۵۷ یا ۵۸ ہجری میں منگل کے دن ان کی وفات ہوئی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور اپنی وصیت کے مطابق بقیع غرقد کے قبرستان میں نمازِ عشاء کے بعد دفن کی گئیں۔ ان سے مروی احادیث کی تعداد (۲۲۱۰) ہے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

حلال و حرام، مشتبہ امور اور اصلاحِ قلب

(٦) عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : ((**إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ، وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا أُمُورٌ مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنْ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ، كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى يُوشِكُ أَنْ يَرْتَعَ فِيهِ، أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، أَلَا وَإِنَّ حِمَى اللَّهِ مَحَارِمُهُ، أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

ابو عبد اللہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ”بے شک حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے بیچ کچھ شبہ والی چیزیں ہیں، جنھیں بہت سے لوگ نہیں جانتے ہیں۔ جو کوئی شبہ والی چیزوں سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لیا اور جو کوئی ان مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہو گیا اس کی مثال اس چرواہے جیسی ہے، جو چراگاہ کے ارد گرد بکریوں کو چرائے تو قریب ہے کہ اس میں واقع ہو جائے گا۔ خبر دار! ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے، خبر دار! اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ آگاہ رہو! جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا جسم درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے، جان لو! وہ دل ہے۔“ (صحیح بخاری: ۵۲، صحیح مسلم: ۱۵۹۹)

شرح و فوائد :

اَلحِمَى : محفوظ جگہ، وہ چراگاہ جس میں دوسرے لوگوں کو چرانے کی اجازت نہ ہو۔ یہ حَمَى يَحْمِي حَمْيًا وَحِمَايَةً (ض) سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ حفاظت کرنا اور بچانا کے ہیں اور ”حِمَى اللَّهِ“ سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ احکام و حدود ہیں، جن کی پاس داری ضروری اور خلاف ورزی جرم ہے۔

یہ ایک انتہائی جامع حدیث ہے۔ علماء نے اس کا شمار اُن چار احادیث میں کیا ہے، جن پر اسلام کا دارو مدار ہے یعنی یہ حدیث اصولِ اسلام میں شمار کی گئی ہے۔ چناں چہ اس حدیث میں یہ بنیادی بات بیان کی

گئی ہے کہ ایک مسلمان شخص کو ہمیشہ ورع اور پرہیز گاری اختیار کرنی چاہیے اور ایسے تمام امور سے بچنا چاہیے جو اس کی ورع اور پرہیز گاری کو ٹھیس پہنچائیں۔ پرہیز گاری اختیار کرنا دراصل ایسا عمل ہے، جس کی وجہ سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے اور یہ آدمی کے مضبوط عقیدے کی دلیل ہوتی ہے۔ اس سے اس شخص کی فضیلت معلوم ہوتی ہے جو خود کو گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے اور شک وشبہ یا ظن و تخمین کی بنیاد پر حرام امور کا ارتکاب نہیں کرتا ہے۔

دین میں حلال امور اور حرام امور دونوں بخوبی واضح ہیں، ہاں چند امور ایسے ہیں، جن کی حلت و حرمت کا پہلو واضح نہیں ہے، ان کے متعلق نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ ہدایت فرمائی ہے کہ مشتبہ امور سے دوری اختیار کی جائے، کیوں کہ مشتبہ امور میں پڑنے سے حرام امور میں واقع ہونے کا اندیشہ بر قرار رہتا ہے۔ خود نبی کریم ﷺ مشتبہ اشیاء سے خوب پرہیز کرتے تھے اور اگر آپ کو کہیں سے کوئی کھجور مل جاتی تو محض اس ڈر سے نہ کھاتے کہ کہیں صدقہ کی نہ ہو، اس لیے کہ صدقہ آپ ﷺ اور آپ کے آل کے لیے حرام ہے۔

نبی کریم ﷺ نے مذکورہ مسئلے کو ایک تشبیہ کے ذریعہ واضح کیا ہے کہ جس طرح کسی بادشاہ کی مخصوص چراگاہ ہو، جہاں دوسرے چرواہوں کا داخلہ ممنوع ہو، اب اگر کوئی چرواہا عین اس چراگاہ کے قریب اپنے جانوروں کو رکھے گا تو ظاہر سی بات ہے کہ اس کے جانور ممنوعہ مقام پر پہنچ سکتے ہیں اور وہاں پہنچنے کی صورت میں وہ سزا کا مستحق ہو گا، ایسے ہی جن امور کی حلت و حرمت واضح نہیں ہے یا آدمی ان کی حلت و حرمت سے ناواقف ہے، اگر ظن و تخمین کی بنیاد پر کوئی شخص اس پر عمل کرے گا تو ظاہر سی بات ہے کہ وہ حرام کام کا بھی مرتکب ہو سکتا ہے، اس لیے اپنے تمام معاملات بالخصوص تجارتی خرید و فروخت اور کاروبار وغیرہ میں مشتبہ امور و معاملات سے بچنا چاہیے اور موجودہ ترقی یافتہ دور کے اعتبار سے جو نئے پیش آمدہ فقہی مسائل و معاملات ہیں ان میں مستند کبار علمائے کرام سے مدد لینی چاہیے، اسی میں انسان کی عافیت ہے اور اسی احتیاط و پرہیز کے ذریعہ ہی اس کا دین و ایمان اور آبرو محفوظ رہے گا، ورنہ وہ یقینی طور پر حرام و ناجائز امور کا مرتکب ہو کر گناہ گار ہو گا۔

اللہ تعالیٰ نے محض اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت کچھ چیزوں یا کچھ امور کو مشتبہ رکھا ہے تا کہ وہ اپنے

بندوں کو آزمائے اور ان کے درمیان تمیز ہو جائے کہ ان میں سے کون شریعت کے اصولوں پر آمنا و صدقنا کہتا ہے اور سچا و پکا مومن ہے اور کون اپنی خواہشات اور ہویٰ وہوس کا شکار ہو کر شرعی اصولوں کو توڑتا ہے اور احکامِ الٰہی کی نافرمانی کرتا ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ کسی بات کی وضاحت اور تفہیم کے لیے تشبیہ و مثال دینا جائز و درست ہے، بلکہ مخاطب کو اپنی بات سمجھانے کا یہ ایک بہترین ذریعہ ہے، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اپنی بات کو ایک عمدہ تشبیہ کے ذریعہ واضح فرمائی۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کے پورے بدن کی اصلاح اور بگاڑ کا انحصار اس کے دل پر ہے، اگر انسان کا دل درست ہے تو اس کا بدن بھی درست ہو گا اور اس کے ذریعہ کیے جانے والے دیگر اعمال بھی درست ہوں گے، لیکن اگر دل کسی طرح کے فساد کا شکار ہے تو پورا جسم بھی بگاڑ کا شکار ہو گا اور اس کے ذریعہ کیا جانے والا عمل بھی درست نہیں ہو گا، گویا دل کی حیثیت ایک بادشاہ کی ہے اور وہ تمام اعضائے جسمانی کا مالک ہے۔ پہلے ذہن و دماغ میں کوئی نیا خیال یا ارادہ پیدا ہوتا ہے، مگر دل ہی اس پر مہر لگا کر اس خیال کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ اسی دل میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ و خوف ہوتا ہے اور یہیں سے تمام اعمال صادر ہوتے ہیں، اسی لیے اعمالِ صالحہ کی قبولیت کا دار و مدار اسی دل کی نیتِ خالصہ و صحیحہ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ بندوں کے ظاہری اعمال کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں کو بھی دیکھتا ہے کہ وہ کس نیت و جذبے کے تحت عمل کر رہے ہیں۔

شبہات میں پڑ کر محرمات میں واقع ہونا دل کے فساد ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا دل کو فساد و بگاڑ سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ اخلاص کو اپنا وظیفہ بنایا جائے، توحید و سنت کو لازم پکڑا جائے، شرک و بدعت سے دوری اختیار کی جائے نیز غفلت اور شہوت و خواہش پرستی سے بچا جائے تا کہ دنیا کے ساتھ دین داری بھی قائم رہے اور آخرت میں کامیابی سے ہم کنار ہوں۔

حلال روزی کے استعمال سے دلوں کو سکون و راحت ملتی ہے اور دل روشن و تابناک رہتا ہے، جس کی وجہ سے دیگر اعضائے جسم بھی درست رہتے ہیں اور حرام کھانے سے دل زنگ آلود ہو کر تاریک ہو جاتا ہے، انسان کے اندر سختی اور قساوتِ قلبی آجاتی ہے، بنابریں اس کے دیگر اعضا بھی درست نہیں رہ

پاتے ہیں اور فساد وخرابی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جسم کی درستی اور بگاڑ دل کے تابع ہوتی ہے، لہٰذا دل اور دیگر اعضا و جوارح کو درست رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ حلال روزی کا استعمال کریں اور دلوں میں اخلاص پیدا کریں۔

زیرِ مطالعہ حدیث سے معلوم ہوا کہ احکام تین طرح کے ہیں: ایک وہ جن کا حلال ہونا واضح شرعی نص سے ثابت ہے مثلاً: کھانے پینے کی عام چیزیں، چاول، دال، پھل، دودھ، شہد، خرید و فروخت اور دیگر معاملات کی چیزیں وغیرہ۔ دوسرے وہ جن کا حرام ہونا واضح شرعی نص سے ثابت ہے مثلاً: شراب، خنزیر کا گوشت، زنا، تہمت، غیبت، چغل خوری اور جھوٹ وفریب وغیرہ۔ اور تیسرے وہ جن کا حلال ہونا واضح شرعی نص سے ثابت نہ ہو اور نہ ان کا حرام ہونا شرعی نص سے واضح ہو اور یہی تیسری صورت مشتبہ امور کی ہے، جن سے بچنا ضروری ہے۔ یہ اشتباہ کبھی نفسِ دلیل کی صحت و ضعف کے بارے میں ہوتا ہے اور کبھی دلیل سے مسائل کے استنباط اور پھر احکام پر انطباق کے وقت ہوتا ہے کہ کوئی شرعی دلیل کسی خاص حکم پر دلالت کر رہی ہے یا نہیں کر رہی ہے اور کوئی حدیث کسی مسئلے یا حکم پر منطبق ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی ہے؟ اور یہ اشتباہ کبھی انسان کی قلتِ علم یا قلت فہم و تدبر کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی انسان کے مقصد و ارادے کی عدمِ درستی کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ آدمی پہلے ہی سے کسی خاص نظریے کو لے کر محض اپنی تائید کے لیے شرعی دلائل پر غور و فکر کرتا ہے، جس کی وجہ سے علم و بصیرت سے محرومی ہی اس کے ہاتھ لگتی ہے۔

جن چیزوں کا حلال ہونا ظاہر ہے، ان میں سے بعض کا تعلق کھانے پینے کی چیزوں سے ہے، بعض کا تعلق اعمال وعبادات سے ہے اور بعض کا تعلق لین دین اور روزمرہ کے معاملات سے ہے۔ اگر ان حلال امور کے متعلق جادۂ حق سے انحراف پایا جائے گا تو وہ بھی حرام قرار پائیں گے۔ مثلاً: کسبِ معاش کے حرام ذرائع کو اختیار کرنے سے پوری کمائی حرام ہو جائے گی، ظلم و تعدی، غصب وڈاکہ زنی اور چوری کے ذریعہ کھانے کی حلال چیزیں ہتھیانے سے وہ حلال نہیں ہوں گی، مستحب اعمال و عبادات کو غیر شرعی طریقے سے انجام دینے سے اجر و ثواب کے بجائے عقاب و سزا کے مستحق ہوں گے نیز ''بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ'' یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری [تمام کی نر و مادہ سمیت] کی قربانی دینے کے بجائے کسی بھی

حلال جانور مثلاً گھوڑے وغیرہ کی قربانی مقبول نہیں ہو گی۔

اس حدیث سے علم اور اہلِ علم کی اہمیت و فضیلت بھی ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ محض علم اور فہم و بصیرت حاصل ہونے ہی کی وجہ سے صاحبِ علم کو حلال و حرام اور مشتبہ امور کا بخوبی علم ہو گا اور ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ شریعت کا کوئی مسئلہ تمام لوگوں میں سے کسی کو معلوم ہی نہ ہو۔

اس حدیث سے فقہ کے مشہور قاعدہ "سد الذرائع" کی دلیل ملتی ہے، یعنی یہ حدیث محرمات کی طرف لے جانے والے ذرائع سے ممانعت اور محرمات کی طرف لے جانے والے وسائل کی حرمت کی دلیل قرار پاتی ہے تاکہ حرام میں واقع ہونے سے بچا جائے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

راویِ حدیث کا تعارف:

صحابیِ رسول سیدنا نعمان بن بشیر بن سعد بن ثعلبہ بن جلاس خزرجی انصاری مدنی رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو عبد اللہ ہے اور والدہ کا نام عمرہ بنت رواحہ ہے۔ یہ اور ان کے والد دونوں صحابی ہیں۔ ولادت ہجرت کے چودہ ماہ بعد ۲ ہجری میں مدینہ منورہ کے اندر ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر آٹھ برس کی تھی، جب کہ ۶۴ ہجری میں خالد بن خلی کلاعی کے ہاتھوں آپ کی شہادت ہوئی۔ مدینہ کے علاوہ کوفہ اور شام میں بھی آپ نے اقامت اختیار کی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے پہلے کوفہ کے گورنر منتخب ہوئے اور پھر اس کے بعد انھیں حمص کا گورنر منتخب کیا گیا۔ ان کا سماع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور ان سے مروی احادیث کی تعداد (۱۱۴) بتائی جاتی ہے۔

دین نام ہے خلوص و خیر خواہی کا

(٧) عَنْ أَبِي رُقَيَّةَ تَمِيْمِ بْنِ أَوْسٍ الدَّارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**اَلدِّينُ النَّصِيْحَةُ**)) قُلْنَا : لِمَنْ؟ قَالَ : ((**لِلَّهِ، وَلِكِتَابِهِ، وَلِرَسُوْلِهِ، وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

ابو رقیہ تمیم بن اوس داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”دین خلوص و خیر خواہی کا نام ہے۔“ ہم نے عرض کیا کہ کس کے لیے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ کے لیے، اس کی کتاب، اس کے رسول، مسلمانوں کے ائمہ اور عام لوگوں کے لیے۔“ (صحیح مسلم:٥٥)

شرح و فوائد :

یہ انتہائی جامع اور مہتم بالشان حدیث ہے۔ اکیلے اس ایک حدیث پر پورے دین کا دار و مدار ہے۔ اس مختصر سی جامع حدیث میں بتایا گیا ہے کہ دین نصیحت یعنی اخلاص و خیر خواہی کا نام ہے۔ یہ نصیحت و خیر خواہی کی عظمت و فضیلت کی دلیل ہے کہ اسے دین کہا گیا ہے، اس لیے اپنی استطاعت کے بقدر قول و عمل کے ذریعہ ہر ایک کے لیے نصیحت و خیر خواہی اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ حدیث تمام مسلمانوں کے ساتھ نصیحت کرنے کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

نصیحت بہت جامع لفظ ہے، اس میں خیر و بھلائی کے تمام امور آجاتے ہیں اور یہ لفظ حدیثِ جبریل میں مذکور اسلام و ایمان اور احسان کی جملہ خصلتوں پر مشتمل ہے، اسی لیے اسے دین کا نام دیا گیا ہے۔ کلامِ عرب میں اس مفہوم میں اس کا متبادل کوئی اور مفرد کلمہ اتنا جامع نہیں ہے، اردو زبان میں اس کا ترجمہ خیر خواہی سے کیا جاتا ہے، مگر یہ اس کی ناقص تعبیر ہے، اسی لیے اس کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے خلوص کو بھی خیر خواہی کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ اصل میں نصیحت ”**نَصَحَ يَنْصَحُ نَصْحًا وَنُصْحًا وَنَصَوحًا**“ سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنیٰ خالص ہونا اور بے غل و غش ہونا کے ہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں ﴿**تَوْبَةً نَصُوْحًا**﴾ کا استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ ”خالص توبہ“ کے ہیں، چناں چہ ”**نَصَحَ الشَّيْءُ**“ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی چیز خالص ہو اور اس میں کھوٹ نہ پائی جاتی ہو، اسی طرح خالص محبت کرنے کے لیے ”**نَصَحْتُ لَهُ الْوُدَّ**“ کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے اور جب شہد یا کوئی اور چیز خالص

ہو تو اسے ''اَلنُّصْحُ'' کہتے ہیں یعنی اس کی اصل ''اَلنُّصْحُ'' ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نصیحت ''نَصَحْتُ الثَّوبَ'' سے ماخوذ ہے اور اس کی اصل ''اَلنَّصْحُ'' ہے، جس کے معنٰی کپڑے وغیرہ کی عمدہ سلائی کرنا کے ہیں، جس طرح کپڑے کے مختلف ٹکڑے کو جوڑ کر ایک کر دیا جاتا ہے اور اس کے عیب کو ختم کر دیا جاتا ہے اسی طرح ہر ناصح منصوح لہ (جس کے لیے نصیحت اختیار کی جائے) کی خیر و بھلائی چاہتا ہے اور مسلمانوں کا باہمی اتحاد اسے مطلوب ہوتا ہے۔ نصیحت کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی دوسرے کے لیے مخلص ہو اور اپنے قول و عمل کے ذریعہ اس کی خیر و بھلائی کا متمنی ہو۔

❁ اللہ تعالیٰ کے لیے نصیحت یہ ہے کہ پورے خلوص کے ساتھ اللہ پر ایمان لایا جائے، ربوبیت و الوہیت اور اسماء و صفات میں اس کی وحدانیت کا اقرار کیا جائے، صرف اسی کی عبادت و پرستش کی جائے، اس کے سوا کسی اور کو نہ پکارا جائے، اسی پر اعتماد و بھروسہ رکھا جائے، صرف اسی سے ڈرا جائے، اس کی تعظیم کی جائے اور صرف اسی سے پناہ اور دیگر ساری ضروریات مانگی جائیں، اللہ کو جملہ عیوب و نقائص سے پاک و منزہ سمجھتے ہوئے اس کے اسماء وصفات میں الحاد کی راہ نہ اپنائی جائے اور اللہ کے مطیع و فرماں بردار بندوں سے دوستی رکھی جائے اور اس کے نافرمان بندوں سے دشمنی رکھی جائے۔

❁ کتاب کے لیے نصیحت و خیر خواہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب قرآن کریم کو منزل من اللہ مانتے ہوئے اسے دستورِ زندگی بنایا جائے، اس کی افضلیت کو تسلیم کیا جائے اور اس میں بیان ہوئی باتوں کی تصدیق کی جائے، اس کی تلاوت کے ساتھ اس کے معانی و مطالب پر بھی غور کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس کی تعلیمات پر عمل کو عملی جامہ پہنایا جائے، اس کے اوامر کی پابندی کی جائے اور منہیات سے بچا جائے، اس میں کسی طرح کا انحراف نہ کیا جائے، اس کی محکم و متشابہ سبھی آیات پر ایمان لایا جائے اور ان میں اپنی طرف سے بے جا تاویل نہ کی جائے۔

❁ رسول اللہ ﷺ کے لیے نصیحت و خیر خواہی یہ ہے کہ ان کو خاتم النبیین تسلیم کرتے ہوئے ان کی رسالت کی تصدیق کی جائے، ان کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان لایا جائے، ان کے احکام و فرامین کو حرزِ جاں بنایا جائے، ان کی پیروی کی جائے، ان کی مخالفت و نافرمانی سے بچا جائے، سنت کے طریق کو چھوڑ کر کوئی اور راہ نہ اپنائی جائے، ہر چیز سے بڑھ کر ان سے محبت کی جائے اور انھیں عبدیت کے مقام سے

اٹھا کر الوہیت کے مقام پر نہ رکھا جائے۔

❁ مسلمانوں کے ائمہ و حکام کے لیے نصیحت و خیر خواہی یہ ہے کہ نیکی کے کاموں میں ان کی پیروی کی جائے، شرعی حدود میں رہ کر ان کے ساتھ وفاداری کی جائے، ان کے احکام کو تسلیم کیا جائے اور ان کا تعاون کیا جائے اور برائی کی صورت میں بالمشافہہ ان کو ان کے اعمالِ بد سے ڈرایا جائے، ان کے غلط فیصلوں اور پالیسیوں کی خامیوں کو ان کے سامنے اجاگر کرتے ہوئے ان پر حق کو واضح کیا جائے اور ان کے اندر پائی جانے والی کسی برائی کی وجہ سے ان کے خلاف بغاوت اور ہتھیار بند خروج سے مکمل پرہیز کیا جائے اور ان کے لیے خیر و بھلائی کی دعا کی جائے۔ اگر وہ علانیہ کفر کریں اور اس پر واضح شرعی دلیل موجود ہو تو ایسی صورت میں ان کے خلاف خروج جائز ہے بشرطیکہ خروج پر قدرت حاصل ہو اور اس خروج سے کسی بڑی تباہی اور فتنہ و فساد کا خدشہ نہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

"مسلمانوں کے ائمہ" سے مراد حکام اور علماء دونوں ہیں اور علماء کے ساتھ نصیحت و خیر خواہی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے محبت کریں، حق کی راہ میں ان کی مدد کریں، قرآن و حدیث پر مشتمل جو باتیں وہ بتائیں ان کو مانیں اور ان کی عزت و توقیر کریں اور خود علماء کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے ساتھ نصیحت و خیر خواہی کے پہلو کو اپنائیں اور ان کی دینی رہنمائی کریں۔

❁ عام مسلمانوں کے لیے نصیحت و خیر خواہی یہ ہے کہ خیر و بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کی جائے، ایک دوسرے کا ہمدرد اور بہی خواہ بنا جائے، کسی کو دھوکا اور غلط مشورہ نہ دیا جائے، مصالحِ عامہ میں ایک دوسرے کی بہتر رہنمائی کی جائے، اپنی ذات سے کسی بھی مسلمان بھائی کو کسی طرح کی اذیت و تکلیف نہ دی جائے، ہر ایک کی عزت و آبرو کا خیال رکھا جائے۔ نیز جو اپنے لیے پسند کریں وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کریں اور جو اپنے لیے ناپسند کریں اسے دوسروں کے لیے بھی ناپسند کریں، آپس میں بھائی بھائی بن کر رہیں اور دین کے معاملے میں اگر کسی مسلمان بھائی سے کوئی چوک یا خطا ہو رہی ہو تو فوراً حکمت و موعظت کے انداز میں اس کی تنبیہ کریں۔

یاد رکھیں! جو لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے آپس میں چھوٹے بڑے تمام مسلمانوں کے ساتھ نصیحت یعنی اخلاص و خیر خواہی کا معاملہ رکھتے ہیں، خواہ وہ ان کے قریبی متعلق ہوں یا دور کے ہوں تو اللہ رب

العالمین ان سے محبت کرتا ہے۔[دیکھیے: صحیح / مسند احمد: ۲۲۷۸۲، صحیح الترغیب والترھیب:۳۰۱۹]

اس حدیث سے تعلیم وتربیت کا ایک اہم طریقہ معلوم ہوتا ہے کہ معلم ومربی کو اچھے ڈھنگ سے اپنی بات پیش کرنی چاہیے اور لوگوں کے شوق وجذبہ کو بڑھانے کے لیے سوال وجواب کے اسلوب کو بروئے کار لانا چاہیے تاکہ ہر ایک کی دل چسپی برقرار رہے۔ اپنی بات اس طرح رکھنی چاہیے کہ طالب و سامع کو مزید پوچھنے اور سیکھنے کا شوق وجذبہ پیدا ہو۔ نیز طالبانِ علوم اور سامعین کو بھی چاہیے کہ اگر کوئی بات وضاحت طلب ہو تو فوراً بلا جھجھک سوال کریں تاکہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ دیکھیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کس قدر طلبِ علم کے حریص تھے کہ وہ فوراً وضاحت طلب امور کی تفتیش کرتے تھے اور کسی بھی چیز کی انھیں ضرورت محسوس ہوتی فوراً اس کے متعلق سوال کرتے تھے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وعظ ونصیحت یا باہمی افہام وتفہیم کے لیے پہلے اہم ترین بات کا تذکرہ ہونا چاہیے، پھر اس کے بعد جو اہم ہو اس کا تذکرہ ہونا چاہیے اور کوئی بات اچھی طرح سمجھانے، اسے مؤکد کرنے اور اس کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے اسے کئی کئی بار بھی ادا کرنا چاہیے، جیسا کہ یہی حدیث مسند احمد[برقم: ۱۶۹۴۲، ۱۶۹۴۵، ۱۶۹۴۶، ۱۶۹۴۷]وغیرہ میں بھی موجود ہے، جس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "اَلدِّينُ النَّصِيحَةُ" کو تین مرتبہ دہرایا تاکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کی اہمیت و عظمت کو سمجھ جائیں، اسے ذہن نشین کرلیں اور اس کا بخوبی اہتمام کریں۔

راویِ حدیث کا تعارف :

سیدنا تمیم بن اوس بن خارجہ داری، شامی رضی اللہ عنہ کی کنیت ابورقیہ ہے۔ داری کی نسبت ان کے اجداد میں سے دار بن ہانی بن حبیب کی طرف منسوب ہے۔ یہ اہل کتاب میں سے تھے اور ۹ ہجری میں اسلام میں داخل ہوئے۔ یہ مدینہ کے رہائشی تھے، پھر شام چلے گئے اور عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بیت المقدس میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ انھوں نے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک جساسہ کی خبر پہنچائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ پہلے صحابی ہیں جنھوں نے مساجد میں دِیا روشن کیا۔ ۴۰ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔ ان سے مروی احادیث کی تعداد کم وبیش (۱۸) ہے۔ صحیح بخاری میں ان کی کوئی روایت نہیں ہے اور صحیح مسلم میں بھی اسی زیرِ مطالعہ ایک حدیث کے سوا ان کی کوئی روایت نہیں ہے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

جہاد اور مسلمانوں کے جان ومال کا تحفظ

(٨) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((**أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللَّهِ، وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ؛ فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، وہ نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں۔ جب وہ ایسا کرلیں تو انھوں نے حقِ اسلام کے سوا اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو مجھ سے بچا لیا اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔ (صحیح بخاری: ٢٥، صحیح مسلم: ٢٢)

شرح و فوائد :

یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ کی ہے، مگر امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں خط کشیدہ عبارت "**إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ**" کا ذکر نہیں کیا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ میں لوگوں سے قتال کرنے کی جو بات کہی گئی ہے، اس سے مراد کفار و مشرکین ہیں، جیسا کہ دوسری صحیح روایات اور سورۂ توبہ وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے فرمان سے اس کی تخصیص ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار و مشرکین سے اس وقت تک جنگ کیا جائے گا جب تک کہ وہ دینِ اسلام کو قبول نہ کرلیں یا پھر وہ جزیہ ادا کرنا شروع نہ کردیں۔ اس حدیث کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ کسی کو زبردستی مسلمان بنایا جائے اور اگر وہ اسلام نہ قبول کرے تو اس سے لڑائی کی جائے اور اسے قتل کیا جائے اور اس کے مال و اسباب کو چھین لیا جائے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں سے لڑائی شروع کریں تو ان سے اس وقت تک جہاد کیا جائے جب تک کہ وہ اسلام نہ قبول کرلیں یا پھر وہ جزیہ دے کر اسلامی مملکت میں ذمی کی حیثیت سے رہنا نہ قبول کریں۔ تاہم جو غیر مسلمین مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی حالت میں نہ ہوں اور اسلام کی بنیاد پر ان سے عداوت نہ رکھتے ہوں، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مطلوبِ شریعت ہے۔ [دیکھیے: الممتحنۃ:٨]

اسی طرح کوئی بھی شخص شہادتین کے اقرار کے بعد اگر ارکانِ اسلام میں سے کسی بھی ایک رکن کا انکار کرے گا تو اس سے جنگ کی جائے گی یہاں تک وہ اس سے باز آجائے، جیسا کہ خلیفۂ اوّل سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکاۃ کے خلاف جنگ کی تھی اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے ان کی نکیر نہیں کی تھی گویا منکرینِ زکاۃ سے کافروں کی طرح قتال کرنے پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو چکا ہے۔ اس موقع پر عمر رضی اللہ عنہ سے ابتدائی طور پر تھوڑی سے بحث ہوئی تھی، لیکن جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا: ”اللہ کی قسم! میں ان لوگوں سے ضرور قتال کروں گا جو نماز اور زکاۃ کے درمیان تفریق کریں گے، اس لیے کہ زکاۃ مال کا حق ہے۔ اللہ کی قسم! اگر وہ مجھے ایک رسی نہ دیں، جسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس کے روکنے پر بھی ان سے لڑائی کروں گا۔“ تو عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”اللہ کی قسم! میں نے دیکھا کہ اللہ نے قتال کے لیے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سینے کو کھول دیا ہے، پس میں نے جان لیا کہ یہی حق ہے۔“ [صحیح بخاری:١٣٩٩، صحیح مسلم:٢٠]

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی اسلامی حد کی پامالی کی صورت میں ایک مسلمان شخص کا جان ومال محفوظ نہیں رہے گا۔ اسلامی حق کے ساتھ قتل کرنے کی صورتیں یہ ہیں: قتل کے بدلے میں قصاصاً قاتل کو قتل کرنا، شادی شدہ زانیوں کو سنگ سار کرنا، مرتد کو قتل کرنا، اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے والے مسلم یا غیر مسلم محارب کو قتل کرنا یعنی اگر مسلمان بھی حدودِ اسلامی کی پامالی اور بغاوت کریں گے تو انھیں بھی بطور حد یا سزا قتل کرنا جائز ہو گا۔ اسی طرح جنگ میں کافر کو قتل کرنا وغیرہ، لیکن اگر کوئی کافر حالتِ جنگ میں بھی کلمۂ توحید کا اقرار کرنے لگے تو اسے قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اس حدیثِ نبوی میں ارکانِ اسلام میں سے صرف تین رکن کا ذکر ہوا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کا ثبوت یہ تینوں رکن ضروری ہیں: شہادتین کا اقرار، اقامتِ صلاۃ، ادائیگیِ زکاۃ۔ اور باقی دو ارکان یعنی روزہ اور حج کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، کیوں کہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مزاحم اقوام سے جنگ کرنے یا نہ کرنے کا تعلق اِن دو امور سے نہیں ہے، چناں چہ بیان نہ کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو مخفی اور پوشیدہ ہوتی ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص روزہ رکھے بنا خود کو روزہ دار باور کرانا چاہے تو اس کے لیے مشکل نہیں ہو گا بلکہ وہ بآسانی خود کو روزہ دار باور کرا سکتا ہے اور پھر ایک مخصوص مہینے میں اس کا رکھنا فرض ہے، اسی طرح حج صرف مال دار مسلمانوں پر فرض ہے اور وہ بھی زندگی میں صرف

ایک مرتبہ حج کے مخصوص مہینوں میں حج کرنا فرض ہے، لہٰذا ان دونوں کے اقرار کے باوجود ان کے عملی اظہار کے لیے ان خاص مہینوں کا انتظار کرنا پڑے گا جن میں ان کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ واللہ أعلم

"لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت سے مراد پورے کلمے کی شہادت و گواہی اور اقرار و تصدیق کرنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت، اس پر تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توحید کے اقرار کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرنا ضروری ہے اور رسالت کی گواہی شہادتِ توحید کے لیے لازم و مستلزم ہے، اس کے بغیر توحید کا اقرار نہ مکمل ہو گا اور نہ قابلِ قبول ہو گا، جیسا کہ اسی مفہوم کی دوسری روایات میں اس کی واضح صراحت موجود ہے۔ [دیکھیے: سنن ابو داود: ۲۶۴۱، سنن ترمذی: ۲۶۰۸، سنن نسائی: ۳۰۹۴ وغیرہ]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو لوگ دنیا میں بظاہر ارکانِ اسلام پر عمل پیرا ہوں تو انھیں اسلام کی تمام مراعات حاصل ہوں گی، ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی اور نہ ان کے جان و مال کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے گا، البتہ اندرونی کیفیت و حالات اللہ تعالیٰ کے حوالے ہوں گے، اگر وہ اپنے قول میں سچے ہوئے تو اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں داخل فرمائے گا اور اگر ان کے دل میں نفاق ہو گا تو دیگر منافقین کے ساتھ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں داخل فرمائے گا اور فاسق کے فسق کی سزا دے گا یا معاف فرما دے گا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص بظاہر شریعت کا پابند ہو تو اس کے خلاف قتال نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کی تکفیر کی جائے گی، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے منافقین کے بارے میں حتمی علم ہونے کے باوجود انھیں مسلمانوں کی جماعت سے خارج نہیں کیا اور نہ ان کے خلاف جنگ کی۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **((مَنْ صَلَّى صَلَاتَنَا، وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا، وَأَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا، فَذَلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِي لَهُ ذِمَّةُ اللَّهِ، وَذِمَّةُ رَسُولِهِ، فَلَا تُخْفِرُوا اللَّهَ فِي ذِمَّتِهِ))** "جس نے ہماری طرح نماز ادا کی، ہمارے قبلے کی طرف رخ کیا اور ہمارے ذبیحہ کو کھایا تو وہ مسلمان ہے، جس کے لیے اللہ کا ذمہ اور امان ہے اور اس کے رسول کا ذمہ اور امان ہے، لہٰذا تم اللہ کے عہد و امان کو نہ توڑو۔" [صحیح بخاری: ۳۹۱]

نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اعمال ایمان کا حصہ ہیں اور ایمان کے ساتھ اعمال بھی ضروری ہیں۔ اس سے گمراہ فرقے مرجئہ وغیرہ کی تردید ہوتی ہے، جن کا گمان ہے کہ ایمان فقط قول کا نام ہے اور اس کے لیے عمل کی ضرورت نہیں ہے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

اطاعتِ رسول کی فرضیت اور قوموں کی ہلاکت کا ایک سبب

(۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ صَخْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : **((مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوهُ، وَمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَثْرَةُ مَسَائِلِهِمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ))** رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

ابو ہریرہ عبد الرحمان بن صخر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ”میں تمھیں جس چیز سے روک دوں اس سے رک جاؤ اور جس چیز کا حکم دوں اپنی طاقت کے مطابق اسے بجالاؤ، اس لیے کہ جو لوگ تم سے پہلے تھے انھیں کثرتِ سوالات اور اپنے نبیوں سے اختلاف نے ہلاک کر ڈالا۔“ (صحیح بخاری: ۷۲۸۸، صحیح مسلم: ۱۳۳۷، الفاظ مسلم کے ہیں۔)

شرح و فوائد :

اس حدیث میں اہم ترین قواعدِ اسلام کا بیان ہوا ہے اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جوامع الکلم میں سے ہے۔ اس میں نماز، روزہ، حج، زکاۃ اور دیگر تمام احکام آجاتے ہیں کہ مقدور بھر انھیں ان کے ارکان و شرائط سمیت پورا کرنا چاہیے، لیکن اگر انسان کسی حکم کو مکمل طور پر بجالانے سے عاجز رہے تو اپنی وسعت و طاقت کے مطابق اسے اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اس بات کا پابند نہیں بنایا ہے کہ احکامِ اسلام کو ہر حالت میں اسی طرح بجالائیں، بلکہ ان کے لیے مختلف عوارض کے پائے جانے کی صورت میں تخفیف بھی رکھی ہے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی بات کہی ہے:
﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا...﴾ ”اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا، مگر اس کی گنجائش کے مطابق“ [البقرۃ:۲۸۶] اور دوسری جگہ فرمایا:﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ.....﴾ ”سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔“ [التغابن:۱۶]

جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان کے متعلق بھی یہ اصولی حکم ہے کہ مقدور بھر ان سے رکنا ضروری ہے، لیکن اگر کوئی عذر درپیش ہو تو بدرجۂ مجبوری انھیں بجالانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مثلاً اضطراری صورت میں مردار کا کھانا اور مجبور کیے جانے پر دل میں اللہ تعالیٰ پر مکمل ایمان و اعتقاد رکھتے ہوئے زبان سے کسی کلمۂ کفر کا ادا کرنا وغیرہ، تاہم اگر اس سے پرہیز کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ مطلب یہ کہ کسی

شرعی عذر کی بنا پر کسی شرعی حکم پر عمل نہ کرنا قابلِ گرفت نہیں ہے۔ تاہم کوئی شخص محض بہانہ بازی کے ذریعہ یہ چیز فرض کرلے کہ فلاں کام ہمارے بس کا نہیں ہے یا یہ کہ ہم یہ کام کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، جیسا کہ ماہِ رمضان میں بہت سے صحت مند لوگ بیمار بن جاتے ہیں وغیرہ، حالاں کہ حقیقت میں وہ اسے انجام دینے کی استطاعت وطاقت رکھتے ہیں، تو ایسی صورت میں ایسے بہانہ باز لوگوں کا ضرور مواخذہ ہوگا اور شدید مواخذہ ہوگا، کیوں کہ یہ اللہ کو دھوکا دینا ہے، جب کہ اللہ کو ہر چیز کا علم ہے اور کوئی بات اس سے مخفی نہیں ہے۔

سنتِ نبوی کی پیروی کرنا ضروری ہے اور آپ ﷺ کا ہر حکم واجب التعمیل ہے۔ آپ ﷺ نے جن چیزوں سے روکا ہے ان سے بچنا اور اور جن چیزوں کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرنا ضروری ہے، اسی میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی اور اپنے آخری رسول ﷺ کی اطاعت کرنے والوں کو ہمیشگی والی جنت میں داخل کرے گا جہاں انھیں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی معیت حاصل ہوگی یعنی ان کا ساتھ نصیب ہوگا اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا اور ان کی اطاعت سے روگردانی کرے گا وہ کھلی گمراہی میں پڑ کر جہنم میں داخل ہوگا اور اللہ اسے رسوا کن دردناک عذاب سے دوچار کرے گا۔ فرمانِ الٰہی ہے :

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾ ”اور جو اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین میں سے اور یہ لوگ اچھے ساتھی ہیں۔“ [النساء:٦٩]

﴿...وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَمَنْ يَتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيمًا﴾ ”اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے گا وہ اسے ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں اور جو پھر جائے گا وہ اسے سزا دے گا، دردناک سزا۔“ [الفتح:١٧]

﴿...وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا

خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾ ”اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے وہ اسے جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدوں سے تجاوز کرے وہ اسے آگ میں داخل کرے گا، ہمیشہ اس میں رہنے والا ہے اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔“ [النساء:۱۳-۱۴]

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا﴾ ”اور کبھی بھی نہ کسی مومن مرد کا حق ہے اور نہ کسی مومن عورت کا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں کہ ان کے لیے ان کے معاملے میں اختیار ہو اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے سو یقیناً وہ گمراہ ہو گیا، واضح گمراہ ہونا۔“ [الأحزاب:۳۶]

﴿...وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ ”اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو یقیناً اسی کے لیے جہنم کی آگ ہے، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں ہمیشہ۔“ [الجن:۲۳] اس آیتِ کریمہ میں نافرمانی سے کفریہ معصیت یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان نہ لانا مراد ہے، جیسا کہ دیگر شرعی نصوص سے اس کی تقیید ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اور نبی کریم ﷺ کی احادیثِ مبارکہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں اور اسلافِ امت وائمۂ کرام کا اس پر اجماع بھی ہے کہ ابدی جہنمی صرف کفر و شرک کرنے والے لوگ ہیں۔

اطاعت و اتباعِ رسول سے متعلق کسی طرح کی کٹ حجتی کرنا اور بال کی کھال اتارنا قطعاً درست نہیں ہے، کسی بھی چیز کے بارے میں نبوی حکم آجانے کے بعد اسے تسلیم کرنا ضروری ہے اور اس کے بارے میں قیل و قال کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے محض اس بنیاد پر بہت سی احادیث کو ترک کر دیا اور اس کی حجیت کا انکار کر بیٹھے کہ حدیث میں بیان کی گئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی اور ان کی عقل کچھ اور کہہ رہی ہے۔ یہ طرزِ فکر انتہائی غلط اور گمراہی کا سبب ہے، جیسا کہ زیرِ مطالعہ حدیث میں یہ خبر دی گئی ہے کہ پہلے کے لوگ محض اپنی کٹ حجتی، بے جا سوال اور انبیائے کرام علیہم السلام سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ مطلب یہ کہ شرعی احکام کو من و عن قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا

واجب ہے اور جو چیزیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں ان کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا بہتر ہے، کیوں کہ شریعت نے جو بھی چیزیں واجب کی ہیں یا جن سے روکا ہے ان میں ہمارے لیے بہتری ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے تابع ہے۔

نبی کریم ﷺ نے پچھلے لوگوں کی ہلاکت کا سبب بیان کرکے اپنی امت کو اس گمراہی سے بچنے کی ترغیب دی ہے اور اس کے ذریعہ آپ ﷺ کا مقصود ان کا طریقہ اختیار کرنے سے روکنا ہے، مگر افسوس کہ اس امت کے بہت سے لوگ وہی روِش اپنا کر گمراہ ہو رہے ہیں۔ چناں چہ ہمارے یہاں بہت سے لوگوں کی یہ عام عادت ہوتی ہے کہ وہ مسائل پر عمل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ محض علمی موشگافی پیدا کرنے اور بال کی کھال اتارنے کے لیے بے جا سوال کرتے ہیں یا محض فرضی مسائل سے متعلق سوالات کرتے ہیں اور بے جا طور پر گفتگو کو طول دیتے ہیں، جب کہ اس طرح کا رویہ اختیار کرنے سے پرہیز کرنا ضروری ہے، کیوں کہ یہ ہلاکت و گمراہی کا سبب ہے۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس ممانعت کا تعلق زمانۂ نبوی کے ساتھ خاص ہے اور اب اس کی پابندی ضروری نہیں ہے، حالاں کہ یہ ان کی غلط فہمی ہے، حقیقت یہ ہے کہ فضول قسم کے بے جا سوال کرنا ہمیشہ کے لیے ممنوع ہے۔ یہاں یہ غلط فہمی بھی نہیں ہونی چاہیے کہ مطلق طور پر سوال کرنا ممنوع ہے بلکہ عقائد و عبادات، اخلاق و معاملات اور دیگر شرعی مسائل و ضروریات سے متعلق سوال کرنا جائز ہی نہیں بلکہ یہ ایک شرعی تقاضا ہے جیسا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بوقتِ ضرورت آپ ﷺ سے سوالات کیا کرتے تھے اور کئی دفعہ ان کے جوابات اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ مقدس میں نازل فرمائی ہے، تاہم یہ بات یاد رہے کہ صرف سوال کرنا ہی کمال نہیں ہے بلکہ حسبِ استطاعت اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، جیسا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دین کی جانکاری اور اس پر عمل کرنے کے معاملے میں بڑے حریص تھے۔

زیرِ بحث حدیث صحیح مسلم کے کتاب الحج میں اور دیگر محدثین کے یہاں بھی مزید قدرے تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث دراصل ایک سوال کے جواب میں وارد ہوئی ہے اور وہی اس کا شانِ ورود ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا: "اے لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے، اس لیے تم حج کرو" تو ایک صحابی [جن کا نام اقرع بن حابس

رضی اللہ عنہ ہے] نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا ہر سال؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ انھوں نے تین مرتبہ دریافت فرمایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا اور تم ادا نہ کر سکتے۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم مجھے چھوڑے رہا کرو جب تک میں تمھیں چھوڑے رہوں، اس لیے کہ تم سے پہلے کے لوگ بہت زیادہ سوال کرنے اور اپنے انبیاء سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے، پس جب میں تمھیں کسی چیز کا حکم دوں تو اپنی طاقت کے مطابق اسے بجالاؤ اور جب میں تمھیں کسی چیز سے روک دوں تو اسے چھوڑ دو۔'' [صحیح مسلم: کتاب الحج، باب فرض الحج مرۃ فی العمر: ۱۳۳۷/ ۴۱۲]

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امر یعنی حکم ہر جگہ تکرار کا تقاضا نہیں کرتا ہے، جیسا کہ یہاں اس حدیث میں حج کی فرضیت کا حکم دیا گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوا کہ یہ ہر سال فرض ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ اسی طرح امر ہر جگہ عدمِ تکرار کا بھی تقاضا نہیں کرتا ہے، بلکہ موقع و محل اور دلائل و قرائن سے اس بات کا تعین کیا جائے گا کہ امر کہاں تکرار کا تقاضا کرتا ہے اور کہاں عدمِ تکرار کا تقاضا کرتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق طور پر حج کی فرضیت کا حکم دیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ حج زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے اور یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو احکام سے متعلق اجتہاد کا حق حاصل تھا، اس کے لیے وحی کا آنا شرط نہیں تھا اور یہ بھی قرآن کریم سے ثابت شدہ حتمی بات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کوئی حکم نہیں دیتے تھے۔

شریعت میں جن معاملات کے بارے میں سکوت و خاموشی اختیار کی گئی ہے وہ مسلمانوں کی آسانی و سہولت کے لیے ہے، اس لیے جن چیزوں کے بارے میں وسعت و آسانی ہے ان میں غلو اور تشدد نہیں اختیار کرنی چاہیے اور لایعنی تکلفات میں پڑ کر اپنی طرف سے بے جا پابندیاں عائد کر کے خود کو اور عام مسلمانوں کو کسی طرح کی تنگی میں نہیں ڈالنا چاہیے اور بلا ضرورت بحث و کرید میں پڑ کر دین کو مشکل نہیں بنانا چاہیے، کیوں کہ غلو اور تکلف کرنے والوں کی ہلاکت یقینی ہے، جیسا کہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((**هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ**)) ''غلو و تکلف کرنے اور حد سے بڑھنے والے ہلاک ہو گئے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے یہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا۔[صحیح مسلم:۲۶۷۰]

کتاب وسنت کی تعلیمات عام فہم اور قابلِ عمل ہیں، نہ تو ان میں بے جا سختی ہے اور نہ وہ انسانی فطرت کے خلاف ہیں، اسی لیے دینِ رحمت کی آسانی کو چھوڑ کر عام اقوال وافعال اور عبادات میں بلاضرورت حد سے تجاوز اختیار کرنا، بے جا تکلف وسختی سے کام لینا، ہندی کی چندی نکالنا اور صالحین کی تعظیم میں حد درجہ غلو سے کام لینا ہلاکت کا سبب ہے۔ مسلم معاشرے میں پھیلے شرک کے جو عام مظاہر نظر آرہے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ صالحین وبزرگانِ دین کی تعظیم میں حد درجہ غلو سے کام لینا ہے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

راویِ حدیث کا تعارف :

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا تعلق یمن کے قبیلہ دوس سے ہے۔ ان کے اور ان کے والد کے نام کے بارے میں تیس سے زائد اقوال پائے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ان کا نام عبد شمس یا عبد عمرو تھا اور کنیت ابو الأسود تھی۔ سن ۷ ہجری میں فتح خیبر کے سال اسلام لانے کے بعد عبد اللہ یا عبد الرحمان بن صخر الدوسی کے نام سے معروف ہوئے تاہم یہ اپنی کنیت ابو ہریرہ سے اس طرح مشہور ہیں گویا کہ یہی ان کا اصل نام ہے۔ یتیمی کی حالت میں ان کی پرورش ہوئی، لیکن سب سے بڑے حافظِ حدیث، مفتی اور علم کے مخزن قرار پائے اور نبوی دعا کی برکت سے محبوبِ خلائق ہوئے۔ یہی وہ جلیل القدر صحابی ہیں، جن سے سب سے زیادہ احادیثِ نبوی ہم تک پہنچی ہیں۔ تقریباً (۵۳۷۴) یا (۵۳۸۴) حدیثیں ان سے مروی ہیں اور آٹھ سو سے زائد لوگوں نے ان سے روایتیں لی ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نبوی باتیں بھولنے کا خدشہ ظاہر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی چادر بچھوائی اور اپنے ہاتھ کے اشارے سے جیسے اس میں کچھ ڈالا اور چادر سمیٹ کر خود سے لگانے کا حکم دیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس کے بعد میں کچھ نہیں بھولا۔ یہ حدیث وسنت کے بڑے شیدائی تھے، ہر وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ فرامینِ نبوی کو یاد کر سکیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مدینہ کے اندر مفتی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ۷۸ سال کی عمر پائی اور ۵۸ یا ۵۹ ہجری میں مدینہ کے اندر روفات ہوئی۔ اس وقت کے امیرِ مدینہ ولید بن عقبہ بن ابو سفیان نے نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع غرقد میں دفن ہوئے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

حلال روزی کی اہمیت و فضیلت اور کسبِ حرام کی مذمت

(١٠) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللَّهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا، وَإِنَّ اللَّهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ، فَقَالَ تَعَالَى : ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾** [المؤمنون : ٥١] **وَقَالَ تَعَالَى : ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾** [البقرة : ١٧٢] **ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ : أَشْعَثَ أَغْبَرَ، يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ : يَا رَبِّ! يَا رَبِّ! وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ، وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذَلِكَ؟**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے لوگو! بے شک اللہ طیب (پاک) ہے اور وہ صرف طیب (پاک و حلال) کو قبول فرماتا ہے اور اللہ نے مومنوں کو اسی بات کا حکم دیا ہے، جس کا حکم رسولوں کو دیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔“ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے آدمی کا ذکر کیا، جو لمبا سفر کرتا ہے اور وہ پریشان حال گرد و غبار سے اٹا ہوتا ہے، وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلاتا ہے (اور یہ دعا کرتا ہے:) ”اے میرے رب! اے میرے رب! حالاں کہ اس کا کھانا حرام کا، اس کا پینا حرام کا اور اس کا لباس حرام کا ہوتا ہے اور وہ حرام غذا سے پلا ہوا ہوتا ہے، پھر اس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟“ (صحیح مسلم:١٠١٥)

شرح و فوائد :

خط کشیدہ عبارت اربعین نووی کے نسخوں میں نہیں ہے، جب کہ صحیح مسلم میں موجود ہے۔

یہ حدیثِ مبارکہ اکلِ حلال کی اہمیت و فضیلت اور اکلِ حرام کی حرمت و مذمت پر دلالت کرتی ہے۔ ”طیب“ قدوس کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اور قدوس کی طرح ”طیب“ بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے، جو اسی کے شایانِ شان ہے اور اس کی ذات و صفات، اسماء و افعال اور احکام وغیرہ سبھی کو شامل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام عیوب و نقائص اور ہر طرح کی خامیوں

سے پاک ومنزہ ہے، اس کی ذات وصفات، اسماء وافعال اور احکام ہر طرح سے کامل ومکمل ہیں، ان میں ذرہ برابر بھی نقص وعیب نہیں پایا جاتا ہے۔ نیز طیب ہر اس پاکیزہ چیز کے لیے بولا جاتا ہے، جو ظاہری و باطنی گندگی اور اذیت سے پاک ہو۔

اس حدیث میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اللہ صرف "طیب" کو قبول فرماتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف صالح عمل اور پاک مال کو قبول فرماتا ہے۔ چناں چہ جس عمل میں خلوص وللّٰہیت اور شریعت کی موافقت کے بجائے ریا ونمود اور دکھاوا ہوگا یا اس میں شرک پایا جائے گا اللہ اسے قبول نہیں فرمائے گا، کیوں کہ وہ عمل طیب نہیں رہ جائے گا۔ اسی طرح حرام مال یا چوری وغصب کے مال کو اللہ قبول نہیں فرمائے گا، کیوں کہ وہ طیب نہیں ہوتا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ عمل مقبول بھی ہوتا ہے اور مردود بھی ہوتا ہے، اللہ جسے قبول فرمالے وہ طیب کے ساتھ مقبول بھی ہے اور جسے قبول نہ فرمائے وہ مردود ہوتا ہے اور پاک نہیں رہتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص کی پرورش پاک مال کے ذریعہ ہوتی ہے اللہ اسی کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ اس سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ دعا کی قبولیت کے لیے جہاں اور بہت ساری شرطیں ہیں، وہیں یہ شرط بھی ہے کہ انسان کا کھانا، پینا، لباس اور دیگر استعمال میں آنے والی چیزیں حلال کی ہوں اور اس کی پرورش حلال وپاکیزہ مال سے ہوئی ہو۔ علاوہ ازیں دعا کی قبولیت کے دیگر اسباب کی جانب بھی اس میں اشارہ موجود ہے وہ یہ کہ آدمی خوب انکساری اختیار کرے، تصنع سے کام نہ لے، اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی جانب بلند کرے اور پوری گریہ وزاری اور رو رو کر اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے حوالے سے اپنی ضرورت کا سوال کرے۔

معلوم یہ ہوا کہ شرعی طور پر جو چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں مثلاً: خنزیر، کتا اور پھاڑ کھانے والے جانوروں کا گوشت، خون اور شراب ونشہ آور اشیاء وغیرہ تو ان سے بچنا اور پرہیز کرنا بے حد ضروری ہے اور شرعی طور پر جو چیزیں حلال قرار دی گئی ہیں صرف اُنھیں کو استعمال میں لانا چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشے اور ہم گمراہی کا شکار نہ ہوں۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ خود اپنی ذات پر بھی حلال کمائی سے خرچ کریں اور دیگر امورِ خیر میں بھی

حلال کمائی سے خرچ کریں نیز حرام کمائی کرنے اور حرام مال خرچ کرنے سے بچیں۔ جس طرح حرام رزق کی وجہ سے دعارد کر دی جائے گی ایسے ہی حرام کمائی سے کیا جانے والا صدقہ و خیرات بھی رد کر دیا جائے گا اور یہ سب کچھ ضائع ہو جائے گا۔ [دیکھیے: صحیح مسلم:۲۲۴]

اللہ تعالیٰ کے احکام کی حفاظت کرنا ضروری ہے اور حفاظت کرنے کی صورت میں اللہ بھی بندوں کا خیال کرتا ہے۔ پیٹ کو حرام غذا کے استعمال سے محفوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے، اس لیے ہر شخص کو اس بات کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے کہ وہ کس طرح کی غذا استعمال کر رہا ہے؟ کھانے اور پینے کے تعلق سے صرف وہی چیزیں استعمال کرنی چاہیے، جنھیں اللہ نے حلال قرار دیا ہے اور جنھیں حلال طریقے سے کمایا گیا ہے، اس لیے کہ اللہ پاکیزگی کو پسند فرماتا ہے۔ ہمارے یہاں اس سلسلے میں بڑی بے احتیاطی پائی جاتی ہے، لوگ حرام چیزوں کو بھی استعمال کرتے رہتے ہیں اور حلال چیزوں کو بھی حرام ذرائع سے کما کر حرام کر لیتے ہیں، جب کہ جس جسم کی پرورش حرام کمائی اور حرام کھانے سے ہو گی، اس جسم کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے شخص کی لمبی لمبی دعائیں اور عبادات بھی اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء ورسل اور نیک و صالح بندوں کو جن چیزوں کا حکم دیا ہے، اُنھیں چیزوں کا حکم ان کے امتیوں اور عام مسلمانوں کو بھی دیا ہے یعنی دونوں طرح کے لوگوں کے لیے یکساں اصول و ضابطہ مقرر فرمایا ہے اور احکام کی بجا آوری میں دونوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں رکھی ہے، بلکہ جو جتنا اللہ کا مقرب بندہ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے اس کی آزمائش بھی اسی طرح سخت ہوتی ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے معزز و مقرب بندہ وہی ہوتا ہے، جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ﴾ ”بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔“ [الحجرات:۱۳]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: لوگوں میں سب سے زیادہ عزت والا کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لوگوں میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو ان میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔“ [صحیح بخاری:۳۳۷۴، ۴۶۸۹، صحیح مسلم:۲۳۷۸]

یہاں اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے ذریعہ قرآنی آیات کے حوالے سے جو بات کہی گئی ہے اس سے ایک تو بندوں کو عمل پر ابھارنا مقصود ہے، دوسرے اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ انبیاء ورسل بھی مامورات و منہیات کے پابند تھے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ آج کل بعض لوگ جو اپنے آپ کو بعض احکام کی پابندی سے بالاتر سمجھتے ہیں اور کھلے عام منہیات و محرمات کا ارتکاب کرتے ہیں، اجنبی عورتوں سے مصافحہ کرتے ہوئے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور پھر خود کو اللہ کا ولی و مقرب بندہ باور کراتے ہیں، وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں اور عام لوگوں کو بے وقوف بنا کر اُنھیں اپنا گرویدہ بنائے ہوئے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں رب العالمین کے کلام قرآن کریم سے استدلال و استشہاد کیا ہے، جب کہ آپ ﷺ کا قول و فعل و تقریر بذات خود حجتِ قطعی ہے، اس سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ ہمیں بھی قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ سے استدلال کرنا چاہیے اور اپنی بات دلیل کے بغیر نہیں رکھنی چاہیے اور نبی کریم ﷺ کی ذات کے سوا بلا دلیل کسی کی کوئی بات قبول بھی نہیں کرنی چاہیے، خواہ وہ کتنی بڑی شخصیت ہی کیوں نہ ہو۔

مشتبہ امور سے اجتناب ضروری ہے

(۱۱) عَنْ أَبِي مُحَمَّدٍ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ سِبْطِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَيْحَانَتِهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ : حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((**دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ**)) رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ : حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ.

رسول اللہ ﷺ کے نواسے اور آپ کے پھول سیدنا ابو محمد حسن بن علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان یاد کر رکھا ہے: ''وہ چیز چھوڑ دو جس میں تمھیں شک ہو اور وہ اختیار کرو جس میں شک نہ ہو۔'' (سنن ترمذی: ۲۵۱۸، سنن نسائی: ۵۷۱۱، امام ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

شرح و فوائد :

يَرِيبُكَ : يَرِيبُ کی یاء پر زبر پڑھا گیا جو رَابَ يَرِيبُ رَيْباً ورِيْبَةً (ضرب) سے مضارع معروف ہے، جس کے معنیٰ شک میں ڈالنا، شک میں مبتلا ہونا کے ہیں۔ اور يُرِيبُ یاء پر پیش کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، جو أَرَابَ يُرِيبُ (افعال) سے مضارع ہے، اس کے معنیٰ مشکوک ہونا، تہمت لگانا، مشکوک و متہم بنانا کے ہیں، مگر یہاں اس کی یاء پر فتحہ پڑھنا ہی زیادہ فصیح اور مشہور ہے، کیوں کہ یہ بات کہی گئی ہے کہ رَابَ میں یقینی طور پر شک کا معنیٰ ہوتا ہے اور أَرَابَ میں شک سے متہم ہونے کا معنیٰ ہوتا ہے۔

زہد و ورع سے متعلق یہ بڑی مہتم بالشان حدیث ہے اور چند الفاظ پر مشتمل اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بہت سی مفید باتوں کو ایک مختصر سے جملے میں سمیٹ دیا ہے اور یہ آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے کہ آپ کو جوامع الکلم عطا کی گئی تھی۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں شک وشبہ پیدا ہو جائے اور ان سے متعلق قلبی سکون نہ حاصل ہو اُنھیں چھوڑ دینا چاہیے، وہی چیز اختیار کرنی چاہیے جس کے بارے میں شک وتردد نہ پیدا ہو۔ اپنے جملہ امور ومعاملات اور اقوال وافعال کی بنیاد یقین اور دینی بصیرت پر رکھنی چاہیے اور جن اقوال واعمال کے سلسلے میں یہ شک وتردد پیدا ہو جائے کہ آیا یہ حلال ہے یا حرام ہے، اس سے روکا گیا ہے یا نہیں روکا گیا ہے اور یہ سنت ہے یا بدعت ہے تو ان کو ترک کر دینا چاہیے، اس سے دلی راحت و سکون اور

طمانیت حاصل ہوتی ہے اور انسان شیطانی راہوں پر جانے سے بچ جاتا ہے، کیوں کہ شیطان کا حملہ اسی طرح ہوتا ہے کہ وہ شک وتردد میں مبتلا کرتا ہے اور بالآخر انسان حرام کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

آدمی کو شک وشبہ عقائد وعبادات یا معاملات یا اور دیگر امور سے متعلق ہو سکتا ہے، لیکن آدمی کو ہمیشہ یقین پر بِنا کرنی چاہیے اور شبہات ووساوس وغیرہ کی طرف توجہ دینے سے بچنا چاہیے، لہٰذا عبادات وغیرہ سے متعلق اگر کسی کو شک ہو جائے تو اس بارے میں بھی اسے یقین پر اعتماد کرنا چاہیے، کیوں کہ یقین شک کو زائل کر دیتا ہے۔ مثلاً: اگر رکعات کی تعداد کے متعلق شک ہو جائے تو یقین پر بِنا کرنی چاہیے اور شک وشبہے کو ذہن سے جھٹک دینا چاہیے۔

زیرِ مطالعہ حدیث کو امام نووی رحمہ اللہ نے یہاں مختصراً نقل کیا ہے۔ چناں چہ اس حدیث کے آخر میں یہ جملہ بھی ہیں: ((فَإِنَّ الصِّدْقَ طُمَانِيْنَةٌ، وَإِنَّ الْكِذْبَ رِيْبَةٌ)) ''سچائی اطمینان کا باعث ہوتی ہے اور جھوٹ شک وشبہ میں مبتلا کرتی ہے۔'' جس سے سچ وجھوٹ کی شناخت کا یہ اہم ضابطہ معلوم ہوتا ہے کہ سچائی سے دل کو سکون ملتا ہے اور جھوٹ سے بے اطمینانی ہوتی ہے اور دل بے قرار رہتا ہے، لہٰذا سچائی اور صدق گوئی کو اپنا شعار بنائیں اور جھوٹ سے بچیں اور جن چیزوں سے حقیقی معنوں میں بے اطمینانی پیدا ہو اس کے قریب بھی نہ جائیں۔

اس حدیث کی شانِ ورود کے بارے میں مسند احمد وغیرہ میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ ثقہ تابعی جناب ابو حوراء ربیعہ بن شیبان سعدی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ میں نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کون سی خاص بات یاد ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک مرتبہ صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور لے کر اپنے منھ میں ڈال لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کھجور کو لعاب سمیت نکال لیا اور اسے کھجور کے ڈھیر میں واپس ڈال دیا۔ کسی نے کہا: اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کو کیا ہوتا اگر یہ بچہ کھجور کھا لیتا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم صدقہ نہیں کھاتے ہیں۔'' کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ''وہ چیز چھوڑ دو جس میں تمھیں شک ہو اور وہ اختیار کرو جس میں شک نہ ہو۔ سچائی اطمینان کا باعث ہوتی ہے اور جھوٹ شک وشبہ میں مبتلا کرتی ہے۔'' انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس دعا کی تعلیم بھی دیتے تھے: ((اللَّهُمَّ اهْدِنِي فِيْمَنْ هَدَيْتَ...)) ''اے اللہ! مجھے ہدایت دے

کر ان لوگوں میں شامل فرما جنھیں تو نے ہدایت دی ہے..." [اس کی اسناد صحیح ہے / مسند احمد:۱۷۲۳]

انسان اگر مشتبہ امور سے دوری اختیار کر لے تو اسے ہر طرح کا سکون و اطمینان اور زندگی میں ڈھیر ساری خیر وبرکت حاصل ہو گی اور وہ کسی طرح کی الجھن اور دوسرے بھائیوں کے بارے میں عداوت و دشمنی کا شکار نہیں ہو گا۔ آپ دیکھیں گے کہ آپسی ناچاقی کی زیادہ تر بنیاد کوئی مشتبہ معاملہ یا کسی طرح کی غلط فہمی ہوتی ہے، لہٰذا اس حدیث پر عمل کریں اور ہر طرح کے ذہنی الجھن سے چھٹکارا پائیں۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

راویِ حدیث کا تعارف :

سیدنا حسن بن علی بن ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی اور چہیتی لختِ جگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بڑے صاحب زادے ہیں۔ کنیت ابو محمد ہے اور ان کی پیدائش ۳ ہجری میں ہوئی۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے، دل کا سرور اور دنیا میں ان کے لیے خوشبو تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں دیکھ کر بے حد خوش ہوتے تھے اور ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دونوں دنیا میں میرے دو پھول ہیں نیز فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق حسن رضی اللہ عنہ نوجوانانِ جنت کے سرداروں میں سے ایک ہیں۔ ان کے والدِ گرامی امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انھیں مسلمانوں کا خلیفہ بنایا گیا، لیکن اپنی خلافت کے چھ ماہ بعد جُمادی الاُولیٰ ۴۱ ہجری کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں اپنی خلافت سے دست بردار ہو گئے تا کہ مسلمانوں کا خون آپس میں نہ بہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی: ((إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ، وَلَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ)) "یقیناً میرا یہ بیٹا سردار ہے اور امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرائے گا۔" [صحیح بخاری:۲۷۰۴] حرف بہ حرف صد فیصد برحق ثابت ہوئی۔ ۴۱ ہجری میں اس بطل جلیل کی وفات ہوئی اور قبرستانِ بقیع غرقد میں دفن ہوئے۔ ان سے (۱۳) حدیثیں مروی ہیں۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

جس معاملے سے کوئی سروکار نہ ہو اسے ترک کر دیں

(۱۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ**)) حَدِيثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَغَيْرُهُ هَكَذَا.

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اس چیز کو چھوڑ دے، جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' (یہ حدیث حسن ہے، اسے ترمذی: ۲۳۱۷، ۲۳۱۸، [اور ابن ماجہ: ۳۹۷۶] نے اسی طرح روایت کیا ہے۔)

شرح و فوائد :

یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم میں سے ہے۔ اس میں الفاظ تو بہت کم ہیں اور جملہ انتہائی مختصر ہے، مگر بہت زیادہ معانی و فوائد پر مشتمل ہے۔ یہ حدیث اصولِ ادب اور محاسنِ اسلام سے متعلق بنیادی ضابطہ فراہم کرتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام تمام طرح کے محاسن کو محیط ہے اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی خوبی ایسی نہیں ہے، جس کے متعلق اسلام میں رہنمائی نہ پائی جاتی ہو۔

انسان کے ''حسنِ اسلام'' میں سے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس کے اسلام کے مکمل اور درست ہونے کی علامتوں میں سے ہے۔ **يَعْنِيهِ : عَنِيَ يَعْنَى عَنًا وَعَنَاءً (الْأَمْر)** کے معنی ہیں کسی کام پر توجہ دینا اور اس میں مشغول ہونا، اس کا خاص اہتمام کرنا۔ اور ''**مَا لَا يَعْنِيهِ**'' کا مطلب ہے غیر متعلق اور لایعنی کام۔ ہر وہ کام جو صاحبِ ایمان انسان کو اس کی مقصدِ زندگی سے بھٹکا دے اور اس کا کوئی مقصد و فائدہ اور اہمیت بھی نہ ہو، اسے لایعنی اور بے کار کام کہیں گے نیز شریعت نے جن اعمال و افعال کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے ان میں اگرچہ بظاہر دُنیوی طور پر کچھ فوائد نظر آئیں، مگر وہ سب لایعنی امور کے زمرے میں آئیں گے۔ حدیثِ مبارکہ میں ایسے ہی بے کار و بے فائدہ اور لایعنی کاموں میں پڑنے سے روکا گیا ہے اور اس میں تمام طرح کے بے مقصد اور بے فائدہ اقوال و افعال کے ساتھ ساتھ شرک اور ہر طرح کا گناہ آجاتا ہے کہ ان سے دوری اختیار کی جائے۔ قرآن کریم میں بہت سی خوبیوں کے ساتھ ساتھ لغویات سے بچنے والوں کو بھی کامیاب ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ [المؤمنون: ۳] اور عباد الرحمان کی یہ خوبی بیان کی گئی ہے کہ وہ جب بے ہودہ کام سے گزرتے ہیں تو باعزت گزر جاتے ہیں۔ [الفرقان: ۷۲]

کسی بھی شخص کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ جن امور و معاملات کا تعلق براہ راست اس سے نہ ہو اور

ان میں پڑنے سے اس کا کوئی دینی یا دُنیوی فائدہ بھی نہ ہو تو وہ ان میں بے جا مداخلت نہ کرے، کیوں کہ بے مطلب کی مداخلت سے آپسی اختلافات بڑھتے ہیں، کوئی بھی معاملہ سرد ہونے کے بجائے اور گرم ہو جاتا ہے اور بے جا طور پر بات آگے بڑھ جاتی ہے، کبھی تو مداخلت کرنے کی وجہ سے نوبت گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے اور کبھی تو بے جا دخل اندازی کی وجہ سے آدمی بُرے لوگوں کی صحبت میں پڑ کر برائیوں اور بڑے بڑے گناہوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس کے دینی و دُنیوی فوائد و نقصانات کا بھی جائزہ لینا چاہیے، اگر اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں ہے تو اسے چھوڑ دینا چاہیے، یہ طریقۂ کار اگر ہم اپنالیں تو بہت سی لایعنی چیزوں سے ہم خود بخود بچ جائیں گے۔ اسلام کی خوب صورتی یہی ہے کی لایعنی قسم کی چیزوں سے بچا جائے، بے مقصد کی گفتگو اور آخرت کو برباد کرنے والے عمل سے دوری اختیار کی جائے، فرضی مسائل سے متعلق سوالات کرنے اور بال کی کھال اتارنے سے پرہیز کیا جائے اور عقائد و اعمال میں بھی بے جا قسم کی تاویل کرنے اور بے فائدہ کی گفتگو کرنے سے دوری اختیار کی جائے۔ اگر اس طرح کی لایعنی اور بے فائدہ چیزوں سے ہم دوری بنالیں تو بہت سی خرابیوں سے ہم خود بخود بچ جائیں گے، حرام و مشتبہ امور و معاملات کے بھی قریب نہیں جائیں گے اور غیر متعلق چیزوں سے بچنے کی وجہ سے ہمارا دین و ایمان بھی خوب صورت ہو جائے گا، لیکن اگر ہم غیر متعلق اور لایعنی چیزوں میں پڑنا اپنا مستقل وطیرہ و عادت بنالیں گے تو اس کی وجہ سے ہمارے دین و ایمان کی خوب صورتی ماند پڑ جائے گی۔ تاہم یہ بات یاد رہے کہ لوگوں کو بُرے کام سے روکنا اور برائیوں میں لت پت لوگوں کو ٹوکنا اور شریعت کے خلاف کوئی کام ہوتے ہوئے دیکھ کر برملا اس سے روکنا بے جا مداخلت اور لایعنی چیز میں دخل دینا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دینی اور شرعی فریضہ ہے، جسے ادا کرنا ضروری ہے۔

ہمارے یہاں عام طور پر لوگوں کی یہ بُری عادت ہوتی ہے کہ اگر دو لوگ کہیں الگ تھلگ ہو کر آپس میں بات کرتے ہیں تو فوراً دوسرے لوگ وہاں حاضر ہو جاتے ہیں اور دونوں کی آپسی گفتگو میں شریک ہونا ضروری سمجھتے ہیں، اسی طرح دو بات چیت کرنے والوں کی کوئی ایک بات یا کوئی ایک جملہ سن کر اس کے بارے میں تحقیق و تفتیش شروع کر دیتے ہیں اور اس بارے میں اپنی من مانی رائے پیش کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں اور آدھی ادھوری بات اِدھر اُدھر پھیلاتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح کسی مجلس

میں آپس میں لوگ گفتگو کر رہے ہوں اور پھر دورانِ گفتگو کوئی تیسرا فرد آجائے تو وہ نووارد آدمی مکمل بات سنے بغیر ہی اپنی رائے دینا شروع کر دیتا ہے اور بے وقت کی راگنی لے کر غیر متعلق باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ سب بُری عادتیں اور بے جا مداخلت کرنے کی صورتیں ہیں کہ براہ راست آدمی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے پھر بھی وہ اس میں شریک ہونا ضروری سمجھتا ہے اور شریک ہو کر دوسرے مسلمان بھائی کو تکلیف دیتا ہے، جب کہ حدیث میں کامل و حقیقی مسلمان کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان بھائی محفوظ رہیں۔ [دیکھیے: صحیح بخاری: ۱۰، صحیح مسلم: ۴۰]

موجودہ دور کی جدید ایجاد موبائل فون اور انٹرنیٹ نے مسلم نوجوانوں کو بہت زیادہ بے مقصد اور لایعنی کاموں میں مشغول کر دیا ہے، چناں چہ گھنٹوں موبائل میں مشغول رہنا، بے مطلب کی گفتگو کرنا، فحش مناظر دیکھنا، بے فائدہ چیزوں کو سننا اور اسے شیئر کرنا، فحش ناول و افسانے اور مخرب اخلاق کہانیوں اور بے فائدہ کتابوں کو پڑھنا، محض وقت گزاری کے لیے ویڈیو گیم اور دیگر لایعنی کھیلوں میں مصروف رہنا، بلاضرورت رات بھر جاگنا، یا ویسے ہی اپنے قیمتی وقت کو محض سونے میں صرف کر دینا، بے فائدہ کھانا پینا اور بلاضرورت ہمہ وقت بک بک لگائے رکھنا اس حدیث کی رو سے کسی بھی آدمی کے اسلام کی خوبی کے خلاف ہیں، یہ سب کے سب بے مقصد اور لایعنی کام ہیں، اس لیے ان سے اجتناب کرنا ضروری ہے تاکہ گناہ کے کاموں میں پڑنے سے بچا جا سکے۔

غور کریں اور اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہماری یہ مختصر سی زندگی اسی وقت بامقصد ہوگی جب ہم بے فائدہ اور لایعنی چیزوں سے پرہیز کریں گے اور اپنے آپ کو بامقصد اور فائدہ مند کاموں میں لگائیں گے۔ یاد رکھیں یہ زندگی اللہ رب العالمین کی طرف سے ایک امانت ہے، اس کے ایک ایک لمحے کے متعلق قیامت کے دن پوچھ گچھ ہوگی اس لیے اپنی زندگی کو لایعنی مشاغل میں ضائع نہ کریں اور اپنے اوقات کو کارآمد چیزوں میں صرف کریں، کیوں کہ بے کار بیٹھنا بھی انسان کو ناکارہ، بے حس اور بے عمل بنا دیتا ہے، اس لیے حرکت کیجیے، مگر بامقصد اور فائدہ مند حرکت کریں اور ایسی حرکت و جستجو کہ جس سے دنیا اور آخرت دونوں کا فائدہ ہو، نہ کہ ایسی بے کار اور فضول حرکت کہ جس سے خود بھی نقصان اٹھائیں اور دوسروں کو بھی تکلیف پہنچائیں۔ اللہ ہمیں اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

ایمانِ کامل کی علامت

(**۱۳**) عَنْ أَبِي حَمْزَةَ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ خَادِمِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((**لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

خادمِ رسول ابو حمزہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوتا، یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے۔" (صحیح بخاری:۱۳، صحیح مسلم:۴۵)

شرح و فوائد :

اس حدیثِ نبوی میں ایمان کی یہ خصلت بیان کی گئی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی کچھ پسند کرنا چاہیے جو کچھ اپنی ذات کے لیے پسند ہو۔ حدیث میں ایمان کی جو نفی کی گئی ہے، اس سے مراد کامل ایمان کی نفی ہے یعنی آدمی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوتا ہے، جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے خیر و بھلائی کی وہی چیز نہ پسند کرنے لگے، جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے، گویا یہ کمالِ ایمان کی شرط ہے۔ جیسا کہ صحیح ابن حبان کی روایت میں ہے:

((**لَا يَبْلُغُ عَبْدٌ حَقِيْقَةَ الْإِيْمَانِ حَتَّى يُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ مِنَ الْخَيْرِ**)) "کوئی بندہ ایمان کی حقیقت کو نہیں پا سکتا ہے یہاں تک کہ وہ لوگوں کے لیے وہی خیر پسند نہ کرنے لگے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔" [صحیح ابن حبان:۲۳۵]

حدیث میں مطلق طور پر بھائی کا ذکر آیا ہے، مگر یہاں بھائی سے مراد مسلمان بھائی ہے اور پسند کرنے سے مراد خیر و بھلائی کی بات پسند کرنا ہے، جیسا کہ اسی روایت کے دیگر طرق میں اس بات کی صراحت موجود ہے۔ مسند احمد وغیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے:

((**لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ الْمُسْلِمِ مَا يُحِبُّهُ لِنَفْسِهِ مِنَ الْخَيْرِ**)) "کوئی بندہ مومن نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو خیر و بھلائی وہ اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے۔" [اسنادہ صحیح علی شرط الشیخین / مسند احمد:۱۳۶۲۹]

خیر ایک ایسا جامع کلمہ ہے، جس میں احکامِ شریعت کی تعمیل کے ساتھ دنیا و آخرت کی ساری خیر و

بھلائی اور ہر طرح کے مباح امور آجاتے ہیں اور شرعی اعتبار سے ممنوع امور از خود خارج ہو جاتے ہیں اور وہی چیز یا وہی خیر پسند کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بعینہٖ وہی چیز پسند کی جائے جو اپنے پاس ہو، کیوں کہ ایسا کرنا مشکل اور ناممکن ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے پاس موجود چیز جیسی چیز دوسرے مسلمان بھائی کے لیے بھی پسند کی جائے، ایسا نہ ہو کہ اپنے لیے اعلیٰ چیزیں پسند کریں اور دوسروں کے لیے ردی و گھٹیا قسم کی چیزیں پسند کریں، جیسا کہ عام طور پر لوگوں کی یہی عادت ہوتی ہے۔

حدیث میں بیان ہوئے وصف کا متحمل وہی شخص ہو سکتا ہے، جس کا دل کینہ و کپٹ، تکبر و گھمنڈ اور حسد وعداوت سے پاک ہو گا، جو دوسروں کے بالمقابل خود کو بلند اور اونچا رکھنے کا خواہش مند نہ ہو گا اور جس کے اندر تواضع وخاکساری پائی جاتی ہو گی، ورنہ اسے نبھانا انتہائی مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گا۔

جس معاشرے میں حدیث میں بیان ہوئے وصف سے متصف افراد پائے جائیں گے وہ معاشرہ امن و سکون اور فلاح و بہبود کا گہوارہ ہو گا، لوگ ایک دوسرے کی عزت کریں گے اور ایک دوسرے کے ہمدرد و بہی خواہ ہوں گے، کسی فرد کو کسی دوسرے فرد سے خوف و خطرہ نہیں ہو گا، مسلم معیشت کو استحکام و مضبوطی حاصل ہو گی، مگر افسوس کہ آج بیش تر مسلمان اس نبوی تعلیم کو خیر باد کہہ چکے ہیں اور ان کے اندر یہ وصف اور خلوص و خیر خواہی کا جذبہ ناپید ہے۔ مسلمان آپس ہی میں ایک دوسرے کے دشمن بنے بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کوئی لمحہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، خود کے لیے تو برانڈڈ چیزیں پسند کرتے ہیں اور اگر کسی کو کچھ دینا ہو تو انتہائی کمتر چیزوں کا انتخاب کرتے ہیں اور بعض دل کے روگیوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اپنے سامنے اگر کسی کو اچھی حالت میں دیکھ لیتے ہیں تو یہ بھی ان سے برداشت نہیں ہوتا ہے اور سامنے والے کی تضحیک واستہزا پر آمادہ ہو جاتے ہیں، جب کہ اہلِ ایمان کی یہ صفت وخوبی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی ضرورت پر دوسرے مسلمان بھائیوں کی ضرورت کو ترجیح دیں اور ان کے ساتھ وہی سلوک کریں جیسا اپنے لیے پسند کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں حسد و جلن نہ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انصارِ مدینہ کی ایک خوبی کی تعریف میں فرمایا:

﴿...وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ...﴾ ”اور وہ اپنے آپ پر اُنھیں ترجیح دیتے ہیں، خواہ خود اُنھیں سخت حاجت ہو۔“ [الحشر:۹]

عام طور پر ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی عزت کی جائے اور لوگ اسے بری نگاہوں سے نہ دیکھیں، اسی طرح ہر کوئی اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے کوشاں رہتا ہے، لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے اوپر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اس حدیث میں اس کا شافی علاج موجود ہے اور اس میں معاشرے کے امن و امان کو بحال رکھنے اور دوطرفہ تعلقات کو بہتر بنائے رکھنے کا یہ اہم ضابطہ بیان ہوا ہے کہ معاشرے کا ہر فرد دوسرے کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے یعنی حقوق طلبی کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی پر بھی خصوصی دھیان دے اور اگر ایسا ہوگا تو آپس میں کسی طرح کا خلفشار نہیں ہوگا اور ہر ایک کے حقوق محفوظ رہیں گے۔

بنیادی طور پر اس حدیث میں مسلمانوں کو اپنے اخلاق و کرادر کو بہتر و عمدہ بنانے کی تعلیم و ترغیب دی گئی ہے، جس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اخلاق کی درستی ایمان کی تکمیل کا ذریعہ ہے اور اعمال ایمان کا حصہ ہیں، اگر عمل و کردار میں کمی و کوتاہی پائی جائے گی تو لازمی طور پر ایمان میں بھی کمی اور نقص آئے گا اور ایسا آدمی کامل الایمان نہیں رہ جائے گا۔

راویِ حدیث کا تعارف:

سیدنا ابوحمزہ انس بن مالک بن نضر انصاری خزرجی رضی اللہ عنہ معروف خادمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان کا لقب ذوالاُذنین ہے۔ والدہ کا نام اُم سُلیم بنت ملحان بن خالد رضی اللہ عنہا ہے اور یہ بھی معروف صحابیہ ہیں۔ بچپن ہی میں اسلام قبول کیا۔ دس سال کی عمر تھی جب ان کی والدہ نے انھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لیے خدمتِ نبوی میں پیش کیا تھا۔ پورے دس سال وفاتِ نبوی تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم رہے اور آٹھ غزوات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مال، اولاد اور عمر میں برکت کی دعا فرمائی تھی، جس کی برکت و تاثیر تھی کہ ان کا باغ سال میں دو مرتبہ پھل دیتا تھا۔ صحابہ میں سب سے زیادہ کثیر الاولاد تھے۔ ان کی صلبی اولاد میں ۸۰ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں اور ان کی وفات کے وقت ان کے لڑکوں اور پوتوں کی تعداد ۱۲۰ تھی، علاوہ ازیں سولڑکے وفات بھی پا چکے تھے۔ تقریباً سو سال کی لمبی عمر پا کر ۹۱ یا ۹۳ ہجری میں بصرہ کے اندر وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔ یہ بصرہ میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ہیں اور ان سے (۲۲۸۶) حدیثیں مروی ہیں۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

مسلم جانوں کی قدر و قیمت اور جوازِ قتل کی صورتیں

(١٤) عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ [يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ] إِلَّا بِإِحْدَى ثَلَاثٍ: اَلثَّيِّبُ الزَّانِي، وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالتَّارِكُ لِدِيْنِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی مسلمان آدمی کا خون [جو گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں] حلال نہیں ہے، سوائے تین صورتوں میں سے کسی ایک کے پائے جانے کی وجہ سے: شادی شدہ زانی، جان کے بدلے جان اور اپنے دین کو چھوڑ کر جماعت سے الگ ہونے والا۔"
(صحیح بخاری:٦٨٧٨، صحیح مسلم:١٦٧٦)

شرح و فوائد :

بین القوسین عبارت اربعین نووی کے نسخوں میں نہیں ہے، جب کہ یہ بخاری و مسلم وغیرہ میں موجود ہے، اس لیے اسے یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔

یہ حدیث مذہبِ اسلام کی حقانیت اور اس کی بیش بہا تعلیمات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام نے انسانی جانوں کی حفاظت فرمائی ہے اور ان کے امن و امان کا خیال رکھا ہے اور اگر کوئی سماج و معاشرے کے امن و امان کو نقصان پہنچاتا ہے اور اس سے انسانی جانوں اور ان کی عزت و آبرو کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو امن و امان کی بقا کے لیے ایسے لوگوں کو معاشرے سے ختم کرنے کا حکم بھی دیتا ہے اور اس حکم کی تنفیذ کے لیے عام لوگوں کے بجائے امام وقت کو ذمہ دار قرار دیتا ہے تاکہ معاشرے میں کسی طرح کا خلفشار اور افتراق و انتشار نہ پیدا ہونے پائے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی بھی شخص کلمہ پڑھ لینے کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے تو وہ اللہ اور اس کے رسول کی پناہ میں آجاتا ہے، اس لیے کسی بھی کلمہ گو مسلمان کا خون بہانا یعنی اسے قتل کرنا اور اس کی جان لینا حرام ہے، تاہم اگر کوئی حد سے تجاوز کرے تو "حقِ اسلام" کی رو سے صرف تین صورتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے کسی مسلمان شخص کو جان سے مارنا حلال ہو جاتا ہے۔ امام و حکمراں کے اوپر واجب ہے کہ مصالحِ عامہ اور دیگر لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی خاطر ایسے شخص کو موت کی سزا

دے، جس کے اندر درج ذیل اسباب میں سے کوئی سبب موجود ہو:

❶ ایسے آزاد شادی شدہ مرد یا عورت کا زنا کرنا، جن کا نکاح ہو چکا ہو اور ہم بستری بھی ثابت ہو چکی ہو۔ ایسوں کو بطور حد سنگ ساری کے ذریعہ قتل کیا جائے گا البتہ غیر شادی شدہ زانی کی سزا سو کوڑے ہیں۔ اس صورت میں وہ شخص بھی داخل ہے جو کسی محرم عورت کے ساتھ زنا کرے اور اس شخص کا حکم بھی اسی صورت میں داخل ہے جو لواطت کرے۔ یہ سزا عین فطرت کے موافق ہے، اگر ایسے شخص کو قتل نہیں کیا جائے گا تو معاشرے میں بہو بیٹیوں کی عزت بر قرار نہیں رہے گی اور زنا کاری عام ہونے کی وجہ سے معاشرے کا امن و امان درہم برہم ہو جائے گا، انسانی خوبیاں ناپید ہو جائیں گی اور معاشرے میں نت نئی بیماریاں جنم لیں گی اور جن کے یہاں اس سزا کا نفاذ نہیں ہے ان کی بدترین حالت دیکھی جا سکتی ہے۔ شادی شدہ زانی کو سنگ سار کرنے پر جمہور امت کا اجماع ہے، عہدِ رسالت میں اس سزا کا نفاذ ہو چکا ہے اور اس کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اس سزا کو بر قرار رکھا تھا، خود قرآن کریم میں بھی رجم کی سزا کا حکم تھا، مگر اُس آیت کی تلاوت منسوخ ہو چکی ہے اور حکم باقی ہے۔ پھر بھی منکرینِ حدیث نے محض اپنی نادانی اور دین بے زاری کی وجہ سے اس سزا کا انکار کیا ہے، جو کہ بالکل غلط ہے اور فطرت و شریعت دونوں کے خلاف ہے۔

❷ جان بوجھ کر کسی معصوم کلمہ گو مسلمان کو ظلم وزیادتی کے ساتھ ناحق قتل کرنا۔ بطور قصاص ایسے قاتل کو قتل کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡقِصَاصُ فِي ٱلۡقَتۡلَىۖ ٱلۡحُرُّ بِٱلۡحُرِّ وَٱلۡعَبۡدُ بِٱلۡعَبۡدِ وَٱلۡأُنثَىٰ بِٱلۡأُنثَىٰۚ...﴾ ”اے مومنو! مقتولوں کا قصاص لینا تم پر فرض کر دیا گیا ہے، آزاد (قاتل) کے بدلے وہی آزاد (قاتل) اور غلام (قاتل) کے بدلے وہی غلام (قاتل) اور (قاتلہ) عورت کے بدلے وہی (قاتلہ) عورت (قتل) ہو گی۔“ [البقرة:۱۷۸]

عدل کا تقاضا یہی ہے کہ قاتل کو اس کے قتل کے بدلے میں قتل کیا جائے تا کہ مظلومین کی اشک شوئی ہو سکے اور معاشرہ انارکی و بد امنی کا شکار نہ ہو اور لوگ قتل و خوں ریزی کرنے سے پہلے ہی اس بات سے متنبہ رہیں کہ قتل کے جرم میں وہ بھی قتل کیے جائیں گے، لیکن اگر کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے کسی مسلمان کی جان چلی جائے تو بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا صرف دیت دینا واجب ہو گا یا اسی

طرح اگر مقتول کے ورثاء قاتل کو معاف کر دیں تو صرف دیت دینا واجب ہو گا قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ناحق کسی پر قاتلانہ حملہ کرے اور جس پر حملہ ہو وہ اپنا دفاع کرے اور اسی دفاع کرنے میں حملہ آور کی جان چلی جائے تو ایسے شخص کو بھی بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

❸ دینِ اسلام سے پھر کر مسلمانوں کی جماعت سے علاحدگی اختیار کرنا۔ حق اور سچ بات کو جان لینے اور اسے قبول کر لینے کے بعد اس سے پھر جانا اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی کا دل ہر طرح کی خیر و بھلائی سے خالی ہے اور حق کو قبول کرنا اسے گوارا نہیں ہے، جو شخص اللہ کو دھوکا دے سکتا ہے وہ عام لوگوں کو بھی دھوکا دے گا اور پھر ایسا شخص باغی ہوتا ہے، اس لیے اس کا جرم ناقابلِ معافی ہوتا ہے اور وہ دنیا میں رہنے کا حق دار نہیں رہتا۔ دنیا کے ہر قانون میں بغاوت کی سزا موت ہے اور چوں کہ مرتد شخص بھی اللہ اور اس کے رسول کا باغی ہوتا ہے اس لیے وہ واجب القتل ہے، تاہم مرتد شخص کو توبہ کرنے کا موقع دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے کیے پر پشیمان ہو کر اسلام قبول کر لے اور اگر وہ اسلام قبول کر لے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی حکم خوارج کا بھی ہے اور جو کوئی بدعت یا بغاوت کی وجہ سے مسلمانوں کی جماعت سے خروج اختیار کرے اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اسی طرح مسلمان ہوتے ہوئے جو شخص جادوگری کرے تو اسے بھی دین سے نکلنے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا، کیوں کہ ایسا شخص دین سے خارج ہو جاتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی متاثر کرتا ہے، جادوگر اگر توبہ کا اظہار کرے تب بھی اسے قتل کیا جائے گا، کیوں کہ وہ دھوکا دینے والا ہوتا ہے۔

مذکورہ صورتوں کے علاوہ کسی اور صورت میں کہ جس کی صراحت کتاب و سنت میں موجود نہ ہو کسی بھی مسلمان کا خون بہانا اور اس کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ اس سے خونِ مسلم کی حرمت ثابت ہوتی ہے نیز مسلمانوں کو زخمی کر کے یا انھیں مار پیٹ کر ان کے جسم کو تکلیف پہنچانا بھی حرام ہے، کتاب و سنت کے دلائل اسی پر دلالت کرتے ہیں اور اس پر مسلمانوں کا اجماع بھی ہے۔ اسی طرح کسی معاہد و ذمی اور مستامن یعنی مسلمانوں کی جانب سے پروانۂ امن دیے گئے شخص کا خون بہانا بھی جائز نہیں ہے، کیوں کہ ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: **((مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ رِيحَهَا تُوجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ أَرْبَعِينَ عَامًا))** ”جس نے کسی معاہد کو قتل کیا وہ جنت کی بو نہیں پا سکتا جب کہ اس کی بو چالیس سال کی دوری سے محسوس کی جائے گی۔“ [صحیح بخاری:۳۱۶۶]

✿ ✿ ❁ ✿ ✿

اہلِ ایمان کے چند اوصاف

(١٥) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهُ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو کوئی شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اچھی بات بولے یا خاموش رہے، جو کوئی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور جو کوئی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔“ (صحیح بخاری:٦٠١٨، صحیح مسلم:٤٧)

شرح و فوائد :

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان کی ذمہ داری ہے اور یہ ان کا امتیازی وصف بھی ہے کہ وہ اپنی زبان سے خیر و بھلائی کی باتیں نکالیں اور لایعنی گفتگو کے لیے اپنی زبان نہ کھولیں، بلکہ ایسی صورت میں ان کے لیے خاموش رہنا ہی بہتر ہے، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور مہمانوں کی تکریم کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا فرمان کا مقصود یہی ہے کہ آپ نے خیر و بھلائی کی باتیں کرنے کا حکم دیا ہے اور خیر و بھلائی کی بات نہ کرنے کی صورت میں خاموش رہنے کا حکم دیا ہے نیز اپنے ہم سایہ پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے اور مہمان کی عزت و تکریم کرنے کا حکم دیا ہے۔

❁ زبان کی آفتوں سے بچنا اہلِ ایمان کا فریضہ ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لانے والوں کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ اپنی زبان سے اچھی باتیں نکالیں ورنہ خاموش رہیں۔ ایک دوسری حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے والوں کو جنت کی ضمانت دی ہے۔ [صحیح بخاری:٦٨٠٧، ٦٤٧٤ اور دیکھیے: سنن ترمذی:٢٤٠٩]

یہ معلوم بات ہے کہ جو بھی بات ہم زبان سے نکالتے ہیں اللہ کے معزز فرشتے اسے لکھ لیتے ہیں، اس لیے سوچ سمجھ کر بھلی بات زبان سے نکالیں ورنہ خاموش رہیں، کیوں کہ اسی میں بھلائی ہے۔ گویا زبان سے بات کرنا بھی ایک طرح کا عمل ہے، اس لیے سوچ سمجھ کر خیر و بھلائی کی بات زبان سے

نکالیں، اسے ذکر و اذکارِ الٰہی میں تر رکھیں، لایعنی گفتگو اور غیر ضروری گپ شپ سے پرہیز کریں اور کسی کو اپنی زبان سے اذیت نہ پہنچائیں، کیوں کہ جس کی بد کلامی سے لوگ محفوظ نہ رہیں نبی کریم ﷺ نے اُسے لوگوں میں بدترین شخص قرار دیا ہے۔ [صحیح بخاری: ۶۰۵۴، صحیح مسلم: ۲۵۹۱]

نیز فضول بک بک کرنے والوں اور باچھوں کو کھول کر لمبی چوڑی گفتگو کرنے والوں کو بھی رسول اللہ ﷺ نے مبغوض، آخرت میں اپنے سے زیادہ دور رہنے والے اور لوگوں میں سب سے بدترین قرار دیا ہے۔ [إسناده ضعيف ولكن الحديث صحيح / مسند احمد: ۸۸۲۲، سنن ترمذی: ۲۰۱۸، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۷۹۱]

❁ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والوں کے لیے اپنے ہم سائے پڑوسی کی عزت و تکریم کرنا بھی ضروری ہے۔ پڑوسی کو تکلیف دینا حرام ہے اور پڑوسی کو ایذا پہنچانے والا کامل مومن نہیں ہو سکتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا: ((وَاللَّهِ لَا يُؤْمِنُ)) ''اللہ کی قسم! وہ شخص (کامل) مومن نہیں ہو سکتا ہے۔'' صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت فرمایا کہ اے اللہ کے رسول! کون شخص؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلَّذِي لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَايِقَهُ)) ''وہ شخص جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی مامون نہ ہو۔'' [صحیح بخاری: ۶۰۱۶]

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِي يَشْبَعُ، وَجَارُهُ جَائِعٌ)) ''مومن (کامل) وہ نہیں ہوتا ہے، جو خود تو کھا کر آسودہ ہو جائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔'' [صحیح / الادب المفرد للبخاری: ۱۱۲، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۱۴۹]

نیز جس شخص کی ایذا رسانی اور شر و فساد سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ رہے نبی کریم ﷺ نے اسے جنت میں داخل نہ ہونے کی وعید سنائی ہے۔ [دیکھیے: صحیح مسلم: ۴۶]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص پڑوسی کو تکلیف دینے کو حرام جانتے ہوئے پڑوسی کو تکلیف دینا درست سمجھے اور اسے ایذا پہنچائے وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا یا یہ کہ موحد ہوتے ہوئے جو کوئی اس گناہ کا ارتکاب کرے گا اسے اولِ وہلہ میں جنت میں داخلہ نہیں ملے گا، یہاں تک کہ وہ اپنے گناہ کے بقدر عذاب چکھ لے یا پھر اللہ اسے اپنے فضل و کرم سے معاف فرما دے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں قرابت دار اور اجنبی دونوں طرح کے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ [دیکھیے: سورۂ نساء: ۳۶] اور ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَا زَالَ جِبْرِيْلُ يُوْصِيْنِي بِالْجَارِ، حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ)) ”جبریل علیہ السلام مجھے ہمیشہ پڑوسی کے متعلق وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ وہ پڑوسی کو وارث ہی قرار دے دیں گے۔“ [صحیح بخاری:۶۰۱۵، صحیح مسلم:۲۶۲۵]

رسول اللہ ﷺ سے ایک عورت کا تذکرہ کیا گیا کہ وہ رات کو قیام کرتی ہے، دن میں روزہ رکھتی ہے، صدقہ کرتی ہے اور دیگر امورِ خیر انجام دیتی ہے، مگر اپنے پڑوسیوں کو اپنی زبان سے تکلیف پہنچاتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا خَيْرَ فِيْهَا هِيَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ)) ”ایسی عورت میں کوئی خیر ہی نہیں ہے، وہ تو جہنمی ہے۔“ [صحیح / الادب المفرد للبخاری:۱۱۹، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ:۱۹۰]

پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی اس قدر تاکید تنبیہ اور برا سلوک کرنے کی صورت میں اس قدر شدید وعید کے باوجود مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے، ان کے آپس کا معاملہ ہمیشہ خراب رہتا ہے، وہ معمولی معمولی باتوں پر لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور دونوں فریق ہمیشہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے فراق میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی بدگوئی کرتے ہوئے ذرا بھی اللہ کا خوف نہیں محسوس کرتے ہیں۔

پڑوسی سے مراد گھر کے قریب بسنے والے پڑوسی ہیں یا جو لوگ بازاروں میں دوکان کے قریب رہنے والے ہیں وہ بھی پڑوسی کے حکم میں ہیں؟ راجح بات یہی ہے کہ عرفِ عام میں ہر وہ شخص انسان کا پڑوسی ہوتا ہے، جو اس کے قریب رہتا ہے، خواہ گھر اور مکان کے قریب رہنے والے ہوں یا پھر بازار میں دوکان کے قریب رہنے والے دوکاندار ہوں یا پھر بڑی بڑی بلڈنگوں اور ہاسٹل میں قریب رہنے والے لوگ ہوں، اس طرح کے سبھی لوگوں پر پڑوسی کا اطلاق ہو سکتا ہے، اس لیے ہر اس پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے اور ہر ایک سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا چاہیے، جسے عام طور پر پڑوسی سمجھا جاتا ہے، تاہم جو جتنا قریب ہوگا وہ اکرام و سلوک کا زیادہ مستحق ہوگا اور اگر پڑوسی رشتے دار ہے تو وہ دوہرے حق کا مستحق ہو جائے گا، ایک تو قرابت دار ہونے کی وجہ سے احسان و صلہ رحمی کا حق اور دوسرے پڑوسی ہونے کا حق اور مسلمان ہونے کی وجہ سے ہر طرح کا پڑوسی احسان و اچھے سلوک کا مستحق ہوتا ہے۔ اگر کسی مسلمان بھائی کا پڑوسی کوئی کافر شخص ہو تب بھی اس کے ساتھ بہتر سلوک اور اچھا معاملہ کرنا چاہیے، اس سے کیے گئے عہد و پیمان کو پورا کرنا چاہیے، اسے ہدیوں اور تحفوں سے نوازنا

چاہیے اور اپنی ذات و کردار سے اسے تکلیف نہیں پہنچانی چاہیے نیز زبان و بیان کے علاوہ اپنے حسنِ معاملہ اور بہتر اخلاق و کردار کے ذریعہ بھی اسے اسلام کی دعوت دینی چاہیے۔

❁ اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھنے والے کے لیے بقدرِ استطاعت حسب دستور ایک دن و رات مہمان کی ضیافت کرنا واجب ہے اور تین دن تک مہمان کی عزت وضیافت مستحب ہے اور اس سے زیادہ ٹھہرنے کی صورت میں میزبان کو اختیار ہے۔ نیز تین دن کے بعد مہمان پر خرچ کرنا صدقہ ہوگا، اس لیے مہمان کو بھی چاہیے کہ کسی کے یہاں بطور مہمان تین دن سے زیادہ قیام نہ کرے کہ میزبان اکتا جائے۔

میزبان مہمان کی ضیافت کرنے سے انکار کرے تو ایسی صورت میں میزبان سے مہمانی کے بقدر سامان وصول کرنا جائز ہے اور یہ چیز وجوبِ ضیافت کو مؤکد کرتی ہے۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ یہ حکم ابتداءِ اسلام میں تھا اور بعد میں اس پر عمل نہیں رہا، یا یہ کہ یہ ان عقوبات میں سے ہے جو مال کے متعلق بطور زجر نافذ کیا گیا تھا اور پھر فرضیتِ زکاۃ کے بعد یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے، مگر منسوخ ہونے کے لیے دلیل کا ہونا ضروری ہے اور منسوخ ہونے سے متعلق سوائے دعویٰ کے کوئی دلیل نہیں پائی جاتی ہے۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک مہمان کی ضیافت اس وقت واجب ہوتی ہے جب کوئی گاؤں دیہات اور چھوٹی بستی میں مہمان بنے اور بڑے شہروں وبستیوں میں مہمان نوازی واجب نہیں ہے، اس لیے کہ وہاں قیام کے لیے ہوٹل وغیرہ ہوتے ہیں، لیکن اس مفہوم کی حدیثیں عام ہیں اور تفریق کی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح اسے ذمیوں اور مجبور و پریشان حال مسافروں کے ساتھ خاص ماننا بھی درست نہیں ہے، کیوں کہ ان کے ساتھ خاص ماننے کی کوئی واضح وصریح منصوص دلیل نہیں پائی جاتی ہے، بلکہ ضیافت اور اس کی وجوبیت سے متعلق حدیثیں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں۔ جیسا کہ زیرِ مطالعہ حدیث کے علاوہ درج ذیل احادیث میں بھی اس بات کی صراحت پائی جاتی ہے:

سیدنا مقدام بن معد یکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((...**وَمَنْ نَزَلَ بِقَوْمٍ فَعَلَيْهِمْ أَنْ يُقْرُوْهُ فَإِنْ لَمْ يَقْرُوْهُ فَلَهُ أَنْ يُعْقِبَهُمْ بِمِثْلِ قِرَاهُ**)) ”اور جو شخص کسی قوم کے ہاں پڑاؤ ڈالے تو ان لوگوں پر لازم ہے کہ وہ اس کی ضیافت کریں اور اگر وہ اس کی ضیافت نہ کریں تو پھر اسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ضیافت کے برابر ان سے وصول کر لے۔“ [صحیح / سنن أبو داود : ۴۶۰۴، سنن دارمی : ۶۰۶]

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یقیناً آپ ہمیں بھیجتے

ہیں تو ہم ایسی قوم کے پاس پہنچتے ہیں جو ہماری میزبانی نہیں کرتے ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے فرمایا: ((إِنْ نَزَلْتُمْ بِقَوْمٍ فَأَمَرُوا لَكُمْ بِمَا يَنْبَغِي لِلضَّيْفِ فَاقْبَلُوا، فَإِنْ لَمْ يَفْعَلُوا فَخُذُوا مِنْهُمْ حَقَّ الضَّيْفِ الَّذِي يَنْبَغِي لَهُمْ)) "اگر تم کسی قوم کے یہاں اترو تو اگر وہ تمھارے لیے اس چیز کا کہیں جو مہمان کے لائق ہے تو اسے قبول کرلو، اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان سے اپنا حقِ ضیافت وصول کرو جو ان کے لیے مناسب ہو۔" [صحیح بخاری: ۶۱۳۷، صحیح مسلم: ۱۷۲۷]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((أَيُّمَا ضَيْفٍ نَزَلَ بِقَوْمٍ فَأَصْبَحَ الضَّيْفُ مَحْرُومًا فَلَهُ أَنْ يَأْخُذَ بِقَدْرِ قِرَاهُ وَلَا حَرَجَ عَلَيْهِ)) "جو کوئی مہمان کسی قوم کے ہاں حاضر ہو اور مہمان ضیافت سے محروم رہے تو وہ اپنی ضیافت کے بقدر لے سکتا ہے، اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔" [إسناده صحيح / مسند أحمد : ٨٩٤٨، سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٦٤٠]

نیز میزبان کی طرف سے میزبانی سے انکار کرنے کی صورت میں میزبان سے مہمانی کے بقدر سامان لینے پر دلالت کرنے والی احادیث ان احادیث کے خلاف اور متعارض بھی نہیں ہیں، جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کسی دوسرے شخص کا مال اس کی اجازت اور خوشی کے بغیر لینا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس مفہوم کی حدیثیں عام ہیں اور صاحبِ مال کی اجازت و خوشی کے بغیر سامان لینے والی احادیث منکرینِ ضیافت کے ساتھ خاص ہیں اور یہ معروف قاعدہ ہے کہ عام و خاص کے درمیان تعارض نہیں ہوتا ہے، اس لیے کہ دونوں کا محل جدا ہوتا ہے۔

آج کل مہمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کی ضیافت کرنے سے متعلق مسلمانوں کے یہاں بہت سستی و کاہلی پائی جاتی ہے، حتیٰ کہ پریشان حال لوگوں کو دیکھ کر بھی لوگ منہ پھیر لیتے ہیں اور ضیافت کے خوف سے قریبی احباب و اخوان کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں، بلکہ ضیافت و اچھا سلوک کرنے کے بجائے خود مہمان سے کھانے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اللہ ہماری اصلاح فرمائے اور ہمیں اسوۂ نبوی کو اپنانے کی توفیق دے۔ آمین!

حدیث میں نبی کریم ﷺ نے پڑوسی اور مہمان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کے لیے "اکرام" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جو اپنے اندر بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے، چناں چہ مہمانوں کے ساتھ اکرام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حسبِ حیثیت دستور کے مطابق ان کی مہمانی اور ان کی عزت و تکریم کی جائے اور

ضیافت کے سلسلے میں اپنی استطاعت، پہنچ اور حدِ اعتدال سے بڑھ کر بے جا تکلف نہ اختیار کیا جائے۔

پڑوسیوں کے ساتھ اکرام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حسبِ حیثیت ان کے ساتھ بہتر تعامل اور عمدہ طرزِ سلوک اپنایا جائے، وہ جس چیز کے زیادہ مستحق ہوں اس کا خیال کیا جائے، اگر پڑوسی نادار و غریب ہے تو کھانے پینے کے سامان وغیرہ اسے دیا جائے اور حسب حیثیت اس کی مالی مدد کی جائے اور ایسا نہ ہو کہ آپ کا کوئی پڑوسی بھوکا رہ جائے۔ پڑوسی اگر امیر ہو تو اس کی حیثیت کے اعتبار سے اس سے سلوک رکھا جائے اور آپسی محبت کو بڑھاوا دینے کے لیے ہر طرح کے پڑوسیوں کے یہاں تحفے تحائف کا تبادلہ کیا جائے۔ نبی کریم ﷺ نے یہاں اس حدیث میں ''اکرام'' کی بات کہی ہے، جس میں ہر طرح کا بہتر سلوک داخل ہے، آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ انھیں مال وزر دیا جائے یا کپڑے پیسے دیے جائیں بلکہ مطلق اکرام کی بات کہی ہے، اس لیے ہر وہ سلوک اور خیر و بھلائی روا رکھی جائے جسے لوگ عرفِ عام میں اکرام سمجھتے ہوں اور انھیں اپنے قول و کردار سے کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔

زیرِ مطالعہ مہتم بالشان حدیثِ نبوی میں مذکور آداب و خصائل نہایت اہمیت کے حامل آداب ہیں، جنھیں اپنانا ہر صاحبِ ایمان شخص کے لیے ضروری ہے۔ ان آداب و تعلیمات کے فوائد بے شمار ہیں اور اس طرح کی بیش بہا تعلیمات مذہبِ اسلام کی امتیازی خصوصیات میں سے ہیں کہ وہ اپنے ماننے والوں کو ایسے آداب و اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتا ہے، جن سے باہمی اُلفت و محبت اور آپسی اُنسیت و یگانگت کو حوصلہ ملتا ہے، لیکن یاد رہے کہ ان اوصاف کے متحمل و خوگر اور ان کی پابندی کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں، جو اللہ اور یومِ آخرت پر کامل ایمان رکھتے ہیں۔ در حقیقت اللہ اور روزِ قیامت پر مضبوط ایمان ہی ہر طرح کی خیر و بھلائی کی جڑ ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں یعنی اعمال ایمان کا حصہ اور اس کی شاخ ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ بندوں کے اعمال میں کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے اور جب اعمال میں کمی و بیشی ہوگی تو یقیناً ایمان میں بھی کمی و زیادتی ہوگی اور اس حقیقت سے ہر کوئی واقف ہے کہ تمام مؤمنین کا ایمان یکساں نہیں ہوتا ہے، بلکہ ان کے اعمال کے حساب سے کم اور زیادہ ہوتا رہتا ہے، مطلب یہ کہ بندۂ مومن کا ایمان طاعت و بندگی سے بڑھتا ہے اور معصیت و نافرمانی سے گھٹتا ہے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

غصہ کرنے سے پرہیز کرو!

(١٦) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْصِنِي؟ قَالَ : ((**لَا تَغْضَبْ**)) فَرَدَّدَ مِرَارًا، قَالَ : ((**لَا تَغْضَبْ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ مجھے وصیت کر دیجیے! تو آپ نے فرمایا: ”غصہ نہ کرو۔“ اس نے کئی مرتبہ درخواست کی اور آپ نے یہی فرمایا: ”غصہ نہ کرو۔“ (صحیح بخاری:٦١١٦)

شرح و فوائد :

یہ دینِ اسلام کے محاسن میں سے ہے اور یہ اسلام کی امتیازی خصوصیت بھی ہے کہ اس فطری دین میں اخلاق و کردار کو بگاڑنے والے تمام اعمالِ سیئہ سے روک دیا گیا ہے۔ غصہ حسنِ اخلاق اور سیرت و کردار کو بگاڑنے والی خوبی ہے، اس لیے اسلامی شریعت نے اس سے بھی منع فرمادیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی حکمت و دانائی کے ساتھ لوگوں کے ساتھ معاملہ فرماتے تھے اور سوال کرنے والوں کے مزاج اور نفسیات کو دیکھ کر حسبِ حال انھیں جواب دیتے اور وعظ و نصیحت فرماتے تھے۔ اس حدیث میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکیمانہ پہلو کو اختیار فرمایا ہے اور صحابیِ رسول کے بار بار دریافت کرنے کے باوجود انھیں غصہ سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ ممکن ہے ان کے اندر غصے کا میلان زیادہ رہا ہو اس لیے آپ نے کئی مرتبہ غصہ سے بچنے کی تاکید و وصیت فرمائی۔ واللہ اعلم

کسی ناگوار بات یا تکلیف پہنچنے کی وجہ سے فوراً آپے سے باہر ہو جانے اور سوچے سمجھے بغیر جو جی میں آئے کر گزرنے اور جو منہ میں آئے بول دینے کا نام غصہ ہے۔ اس کی وجہ سے باہم گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑے تک کی نوبت آجاتی ہے، بلکہ بسا اوقات طلاق و خلع اور قتل وخوں ریزی تک کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ غصہ کے اثرات چہرے پر بھی عیاں ہوتے ہیں اور زبان و دیگر اعضاء سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر دینی غیرت و حمیت کی وجہ سے غصہ آئے اور آدمی حدِ اعتدال میں رہ کر اپنے غصے کا اظہار کرے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، بلکہ یہ مسنون و پسندیدہ عمل ہے اور ایمانی غیرت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ منکر وغیر شرعی کام پر غصہ کیا جائے۔

غصہ سے بچنے کی تاکید فرما کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دنیا و آخرت کی بھلائیوں کو جمع

فرمادیا ہے۔ غصہ ایک ایسا وصف ہے، جس کی وجہ سے اچھا بھلا آدمی بھی بڑے بھیانک کام انجام دے دیتا ہے، جو اس کی دنیا و آخرت کی خرابی و بربادی کا سبب بنتا ہے۔ غصے کی حالت میں انسان کی سمجھ بوجھ ناپید ہو جاتی ہے اور عقل و خرد ماؤف ہو جاتی ہے، وہ اس حالت میں نرمی ورحم دلی اور باہمی الفت و محبت جیسی بہترین صفات سے خالی ہو جاتا ہے اور شیطان اس پر مکمل تسلط حاصل کر لیتا ہے، اس لیے خود بھی غصہ کرنے سے پرہیز کریں اور غصہ آنے کی صورت میں آپے سے باہر ہو کر اول فول بکنے سے گریز کریں اور دوسروں کو بھی غصہ نہ دلائیں۔

اس حدیث میں غصہ سے بچنے کی جو تاکید کی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے امور و معاملات نہ اختیار کیے جائیں اور ایسے اسباب و وسائل سے بچا جائے، جن کی وجہ سے آدمی کو غصہ آئے اور ایسی مجلسوں سے دوری اختیار کی جائے جہاں آدمی لوگوں کی باتوں کو ضبط نہ کر سکے، تکبر و گھمنڈ جیسی مذموم صفات سے دوری اختیار کی جائے، اپنے اندر صبر و تحمل اور بُردباری کی خوبی کو پروان چڑھایا جائے اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھا جائے، تاہم کبھی کسی بات پر غصہ آجائے تو اپنے غصے پر کنٹرول رکھا جائے، غصے کی حالت میں کوئی فیصلہ نہ کیا جائے اور نہ کسی طرح کی کارروائی کی جائے اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپے سے باہر نہ ہوا جائے۔ اس نبوی ممانعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرے سے غصہ کرنا ممنوع ہے، اس لیے کوئی شخص سرے سے غصہ ہی نہ کرے، کیوں کہ غصہ ایک فطری و طبعی جذبہ ہے، کسی بھی بابصیرت آدمی کو کوئی غیر فطری اور غلط کام دیکھنے پر غصہ آسکتا ہے، لہٰذا ایسا اوقات غصہ کا آجانا یا غصہ کرنا ممنوع نہیں ہے، بلکہ غصہ کے اسباب و سائل اختیار کرنے نیز لڑائی جھگڑا کے موقع پر غصہ آنے کی صورت میں جذبات پر کنٹرول نہ رکھنے اور بات بات پر غصہ کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اس نبوی ممانعت کا مقصود یہی ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں داخل ہونے والے پرہیز گاروں کی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی ایک بہترین صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ غصہ کو پی جانے والے ہوتے ہیں یعنی غصہ پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي ٱلسَّرَّآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَٱلۡكَٰظِمِينَ ٱلۡغَيۡظَ وَٱلۡعَافِينَ عَنِ ٱلنَّاسِۗ وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلۡمُحۡسِنِينَ﴾ ”جو خوشی اور تکلیف میں خرچ کرتے ہیں اور غصے کو پی جانے والے اور

لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“ [آل عمران:۱۳۴]

حقیقت یہ ہے کہ غصہ پی جانا اور اپنے غصے کو برداشت کر لے جانا بہت بہادری کا کام ہے اور اگر کوئی غصہ کو نافذ کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود حقیقی بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھے تو یہ بڑے شرف وفضیلت کی بات ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ)) ”بہادر وہ نہیں ہے جو بہت زیادہ پچھاڑ دینے والا ہو، بلکہ بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔“ [صحیح بخاری:۶۱۱۴، صحیح مسلم:۲۶۰۹]

سیدنا معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَسْتَطِيْعُ أَنْ يُنَفِّذَهُ، دَعَاهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى رُءُوسِ الْخَلَائِقِ حَتَّى يُخَيِّرَهُ فِي أَيِّ الْحُوْرِ شَاءَ)) ”جو شخص غصہ پی جائے، جب کہ وہ اسے نافذ کرنے پر قادر ہو تو روزِ قیامت اللہ عزوجل اسے ساری مخلوقات کے سامنے بلا کر یہ اختیار دے گا کہ وہ حور عین میں سے جسے چاہے منتخب کر لے۔“ [صحیح / سنن ترمذی:۲۰۲۱، سنن أبو داود:۴۷۷۷، سنن ابن ماجہ:۴۱۸۶]

نیز سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:((مَنْ كَفَّ غَضَبَهُ كَفَّ اللَّهُ عَنْهُ عَذَابَهُ، وَمَنْ خَزَنَ لِسَانَهُ سَتَرَ اللَّهُ عَوْرَتَهُ، وَمَنِ اعْتَذَرَ إِلَى اللَّهِ قَبِلَ اللَّهُ عُذْرَهُ)) ”جس شخص نے اپنے غصے کو روک لیا اللہ اس سے اپنا عذاب روک لے گا، جس نے (لوگوں کے عیوب سے) اپنی زبان کی حفاظت کی اللہ اس کے عیوب پر پردہ ڈالے گا اور جس نے اللہ سے معذرت کی اللہ اس کا عذر قبول فرمائے گا۔“ [حسن / أخرجہ أبو یعلیٰ فی مسندہ ۳/۱۰۷۱، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ:۲۳۶۰]

احادیث میں غصہ کو سرد کرنے کے وسائل وعلاج بھی بیان ہوئے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

❁ ہر حالت میں اپنے نفس پر کنٹرول رکھیں، اگر کبھی کسی بات پر غصہ آئے تو اسے دبانے کی کوشش کریں اور خاموشی اختیار کریں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:((إِذَا غَضِبْتَ فَاسْكُتْ)) ”جب تمھیں غصہ آئے تو خاموشی اختیار کرو۔“ [حسن / اسے ابن شاہین نے ”الفوائد“ (ق ۱/۱۱۲) میں روایت کیا ہے۔ دیکھیے: سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ ۳/۳۶۳] نیز خود اپنی

ذات کو غصے کے شر سے محفوظ رکھیں اور یہ بات یاد رکھیں کہ اللہ رب العالمین درگزر کرنے والوں اور غصہ پی جانے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

❁ غصہ کا سب سے بہترین علاج یہ ہے جب بھی غصہ آئے تو تعوذ یعنی ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'' پڑھیں، اس لیے کہ غصے کو بھڑکانا شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور شیطان کی طرف سے کچوکا لگے تو اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ [الأعراف:۲۰۰] حدیث میں بھی ایسے موقع پر تعوذ پڑھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔[صحیح بخاری:۳۲۸۲، صحیح مسلم:۲۶۱۰] بندۂ مومن اگر اس کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے اللہ کی پناہ میں آئے گا تو ضرور اس سے غصہ دور ہو جائے گا۔

❁ جس حالت میں غصہ آئے اسے بدل دیں یعنی اگر کھڑے ہوں تو بیٹھ جائیں اور بیٹھے ہوں تو لیٹ جائیں اور ہر طرح سے پُر سکون رہنے کی کوشش کریں، اس سے غصہ کافور ہو جائے گا۔ [صحیح / سنن أبو داود:۴۷۸۲، مسند احمد:۲۱۳۴۸]

❁ غصہ کو دور کرنے کی ایک صورت حدیث میں یہ بھی بتائی گئی ہے کہ آدمی وضو کرلے، اس سے اس کا غصہ دور ہو جائے گا، کیوں کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے۔[حسن / سنن أبو داود:۴۷۸۴، مسند احمد:۱۷۹۸۵، شیخ البانی نے اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے، مگر شیخ زبیر علی زئی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔]

جوامع الکلم پر مشتمل یہ حدیث ''سد الذرائع'' کی زبردست دلیل ہے یعنی جن وسائل کی وجہ سے حرام میں پڑنے کا خطرہ ہو اور وہ نفع کے مقابلے میں بڑی خرابی کا ذریعہ ہو ان سے رکنا اور انھیں چھوڑ دینا ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی چیز کی ممانعت اس کے اسباب کی ممانعت پر بھی دلیل ہوتی ہے، اس لیے غصہ کرنے کے ساتھ ساتھ غصہ کے اسباب سے بھی بچنا ضروری ہے۔

حدیث میں مذکور سوال کرنے والے صحابی کون ہیں؟ اس سلسلے میں مختلف روایات وارد ہوئی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں جاریہ بن قدامہ سعدی، سفیان بن عبد اللہ ثقفی، ابو الدرداء، ابن عمر اور عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم کے دریافت کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا ہے۔ جاریہ بن قدامہ نے وصیت کا مطالبہ کیا، ابو الدرداء نے پوچھا کہ مجھے ایسے عمل کی رہنمائی فرمائیں

جو مجھے جنت میں داخل کر دے، ابن عمرو اور سفیان ثقفی نے دریافت فرمایا کہ مجھے مختصر بات بتائیں جو میرے لیے نفع بخش ہو اور ایک روایت کے مطابق عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا کہ مجھے ایسا عمل بتائیں جو مجھے اللہ کے غضب سے دور کر دے۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے: مسند احمد: ۶۶۳۵، ۸۷۴۴، ۱۵۹۶۴، اور جلد: ۱۱ ص: ۲۱۱ و ۲۱۲ کا حاشیہ، نیز حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی فتح الباری کی آٹھویں جلد کے صفحہ: ۲۸۰ پر حدیث نمبر: ۶۱۱۶ کی شرح کے تحت ان احادیث کو ذکر کیا ہے۔]

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نفع بخش عمل کے بڑے حریص رہتے تھے، اسی لیے وہ عمل کرنے کی نیت سے اس طرح کے سوالات کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے لیے کسی اہم وصیت کا مطالبہ بھی کرتے تھے اور مختلف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی درخواست پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے علاوہ بھی کئی طرح کی وصیتیں فرمائی ہیں۔ ہم بھی بغرض عمل کسی عالمِ دین سے وصیت اور نیک عمل کی رہنمائی کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

زیرِ مطالعہ حدیثِ نبوی ان احادیث میں سے ایک ہے، جن سے خیر و بھلائی اور اخلاقِ حسنہ وغیرہ کے تمام تر آداب نکلتے ہیں۔ اگر آدمی انھیں اپنی عملی زندگی میں داخل کر لے تو اس کی زبان قابو میں رہے گی، لایعنی امور کی طرف وہ متوجہ نہیں ہو گا، خود پر کنٹرول رکھے گا اور اس کا دل بھی گناہوں سے محفوظ رہے گا۔ دیارِ مغرب میں اپنے دور کے مالکی امام ابو محمد عبد اللہ بن ابو زید رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”نیکی اور خیر و بھلائی کے تمام تر آداب چار احادیث سے ماخوذ ہیں: ❶ پہلی حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ)) ❷ دوسری حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ((مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ)) ❸ تیسری وہ حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختصر لفظوں میں یہ وصیت کی ہے: ((لَا تَغْضَبْ)) ❹ اور چوتھی حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ)) واللہ أعلم“ [المنہاج فی شرح صحیح مسلم ص: ۱۲۳]

امام نووی رحمہ اللہ نے مذکورہ چاروں احادیث کو اپنی اس ”أربعین“ میں جمع کر دیا ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں آپ مذکورہ احادیث کو شرح سمیت پڑھ چکے ہیں۔

✿ ✿ ❁ ✿ ✿

ہر ایک کام میں احسان کرنا ضروری ہے

(۱۷) عَنْ أَبِي يَعْلَى شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : **((إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ))** رَوَاهُ مُسْلِمٌ

ابو یعلی شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کر دیا ہے، لہٰذا جب تم قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو، جب ذبح کرو تو اچھے انداز میں ذبح کرو اور تمھیں چاہیے کہ اپنی چھری تیز کر لیا کرو اور اپنے ذبح ہونے والے جانور کو آرام پہنچاؤ۔'' (صحیح مسلم:۱۹۵۵)

شرح و فوائد :

اَلْقِتْلَةَ : قاف پر کسرہ کے ساتھ، قتل کرنے کی کیفیت و حالت اور ہیئت و نوعیت۔ اَلذِّبْحَةَ :ذال پر کسرہ کے ساتھ، ذبح کرنے کی کیفیت و حالت اور ہیئت و نوعیت، بیش تر نسخوں میں ذال پر زبر اور ھاء یعنی تائے مدور کے بغیر واقع ہوا ہے۔ شَفْرَةٌ : چھری، تلوار، تلوار کی دھار، ج:شَفَرات، شِفار، شَفْر

یہ قواعدِ اسلام کی ایک جامع حدیث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی رحمت و شفقت ہی کی بنیاد پر ہر چیز کے ساتھ احسان یعنی اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ ادیانِ عالم میں اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو ہر کام کو اچھے طریقے سے ادا کرنے کا حکم دیا ہے، یہاں تک کہ اگر کسی کو اس کے گناہوں اور بغاوت کی پاداش میں یا بطور قصاص سزائے موت دینی ہو یا مرتد شخص کو قتل کرنا ہو یا میدانِ جنگ میں دشمن کو قتل کرنا ہو یا پھر کسی موذی جانور کو مارنا ہو تو انھیں بھی تڑپا تڑپا کر مارنا درست نہیں ہے اور مرنے کے بعد لاش کا مثلہ کرنا بھی جائز نہیں ہے، تاہم شادی شدہ زانیوں کو پتھر سے مار مار کر ہلاک کرنا ایک شرعی تقاضا ہے تاکہ لوگ یہ عبرت ناک سزا دیکھ کر اس بدترین عمل سے بچیں۔ بعض لوگوں نے محض اپنی نادانی و دین بے زاری کی وجہ سے سزائے رجم کا انکار کیا ہے، جو کہ فطرت اور شریعت دونوں کے خلاف ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے کسی کو بُرے طریقے سے قتل کیا ہے تو اسے بھی بطور قصاص اسی طرح سے قتل کرنا جائز ہے تاکہ مقتول کے ساتھ حق تلفی نہ ہو اور قصاص کا تقاضا بھی یہی ہے۔

انسانی ضرورت کے پیشِ نظر اللہ رب العزت نے بہت سے جانوروں اور پرندوں کو حلال کیا ہے اور شریعت نے انھیں ذبح کرنے کے اصول بتائے ہیں اور ہر ایک کے ساتھ احسان کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔ چناں چہ زیرِ مطالعہ حدیث میں نبی ﷺ نے جانوروں کو ذبح کرنے کے تعلق سے یہ بیش قیمت تعلیم دی ہے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت اس کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنا ضروری ہے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک یہ ہے کہ چھری کو خوب تیز رکھا جائے تاکہ ذبح ہونے والے جانور کو بہت زیادہ اذیت نہ اٹھانی پڑے اور ذبح ہونے والے جانوروں کو دوسرے جانوروں کے سامنے ذبح نہ کیا جائے، ذبح کرنے کے بعد جب تک وہ ٹھنڈا نہ پڑ جائے اس کی کھال نہ اتاری جائے اور ذبح کرتے وقت انھیں مضبوطی سے پکڑ کر رکھا جائے۔ یہ محض اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہر طرح کے جانوروں کو ہمارے تابع کر دیا ہے ورنہ انھیں ذبح کرنا انتہائی مصیبت کا باعث ہوتا۔

آج کل جانوروں کو مشینی جھٹکوں کے ذریعہ ذبح کیا جاتا ہے اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس طرح ذبح کرنے کی وجہ سے جانور کو کم تکلیف ہوتی ہے، حالاں کہ یہ طریقہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ اس طرح جانور کو ذبح کرنے کی صورت میں جانور کا خون نہیں نکلتا ہے، جب کہ جانور کے حلال ہونے کے لیے جانور کا خون نکلنا ضروری ہے اور خون نہ نکلنے کی وجہ سے جانور کا گوشت صحتِ انسانی کے لیے مضر ہوتا ہے اور مشینی جھٹکے سے ذبح کرنے کی صورت میں جانور کو بھی کافی تکلیف پہنچتی ہے اور اس کی جان گھٹ گھٹ کر نکلتی ہے، جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں یہ بات متحقق ہو چکی ہے کہ جانور کا خون بہانا یعنی جانور کو اسلامی طریقے سے ذبح کرنا جانور کے لیے راحت و آسانی کا باعث ہوتا ہے۔

حدیث کی عمومیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان کے علاوہ کسی بھی موذی جانور کو مارنے کی ضرورت درپیش ہو تو اسے بھی اذیت دے کر نہ مارا جائے، بلکہ ہر ایک کے ساتھ احسان کیا جائے، خواہ وہ انسان ہو یا جانور۔ کتاب و سنت میں جابجا احسان کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی فضیلت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں احسان کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُ بِٱلْعَدْلِ وَٱلْإِحْسَٰنِ وَإِيتَآيِٕ ذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ ٱلْفَحْشَآءِ وَٱلْمُنكَرِ وَٱلْبَغْىِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ ”بے شک اللہ عدل، احسان اور قرابت

داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی و برائی اور سرکشی سے روکتا ہے، وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔" [النحل:۹۰]

یہ قرآن کریم کی جامع ترین آیتوں میں سے ایک ہے، اس میں تین طرح کی خوبیوں کو اپنانے کا حکم دیا گیا ہے: ❶ عدل ❷ احسان اور ❸ قرابت داروں کو دینا، جس میں تمام طرح کی بنیادی نیکیاں آجاتی ہیں اور تین بُری خصلتوں سے روکا گیا ہے: ❶ فحشاء یعنی بے حیائی ❷ منکر یعنی برائی ❸ بغی یعنی سرکشی و زیادتی، جس میں بنیادی طور پر اخلاق و کردار کو بگاڑنے والی تمام برائیاں آجاتی ہیں۔

زیرِ مطالعہ حدیثِ نبوی میں بنیادی طور پر نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں مطلب یہ کہ زندگی کے تمام معاملات میں احسان کو لکھ دیا ہے یعنی فرض قرار دے دیا ہے۔ لغوی اعتبار سے احسان، احْسَنَ یُحسِنُ سے باب افعال کا مصدر ہے، جس کے معنیٰ نیکی کرنا، کسی کام کو عمدہ و خوب صورت بنانا، حق دار کو اس کے حق سے زیادہ دینا اور کسی کے ساتھ بھلائی اور اچھا برتاؤ کرنا کے ہیں اور یہ درج ذیل دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

① اس کا ایک معنیٰ ہے کسی کام کو خوب اچھی طرح اور پختگی سے کرنا، علم و عمل کے ذریعہ اس میں حسن و خوبی پیدا کرنا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ٱلَّذِىٓ أَحۡسَنَ كُلَّ شَىۡءٍ خَلَقَهُۥ...﴾ "جس نے ہر چیز کو خوب اچھی طرح بنایا جو اس نے پیدا کیا۔" [السجدہ:۷]

② اور دوسرا معنیٰ ہے اچھا سلوک و برتاؤ کرنا، انعام کرنا، نفع پہنچانا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿...وَبِٱلۡوَٰلِدَيۡنِ إِحۡسَانًا وَذِى ٱلۡقُرۡبَىٰ وَٱلۡيَتَٰمَىٰ وَٱلۡمَسَٰكِينِ...﴾ "اور والدین، قرابت والوں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔" [البقرۃ:۸۳]

اس اعتبار سے احسان کی مندرجہ ذیل دو قسمیں ہیں:

❶ **احسان کی پہلی قسم** اپنے رب و معبودِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں احسان کرنا ہے، جیسا کہ مشہور حدیث حدیثِ جبریل میں بیان ہوا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عبادت اس طرح کی جائے گویا بندہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، یہ احسان کا پہلا مرتبہ ہے اور اگر یہ کیفیت نہ پیدا ہو تو بندہ یہ شعور و احساس رکھے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ رہا ہے، یہ احسان

کا دوسرا مرتبہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی و مراقبے کا پختہ یقین رکھتے ہوئے انتہائی خشوع و خضوع، عاجزی و فروتنی، خلوص وللٰہیت، محبت و چاہت اور شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عبادت کو انجام دیا جائے۔ اگر بندہ اللہ کی نگرانی کا کامل تصور رکھے گا تو اس کا ہر عمل پختہ طریقے سے انجام پائے گا اور وہ گناہوں کے صدور سے بچا رہے گا۔

❷ **احسان کی دوسری قسم** مخلوق کے حقوق میں احسان کرنا ہے، جیسا کہ مختلف قرآنی آیات و احادیث میں مخلوقات کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مخلوق کے ساتھ احسان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی دنیاوی معاوضے کی امید کے بغیر لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، حق داروں کو ان کا حق دینا بلکہ اس سے زیادہ عطا کرنا وغیرہ اور تمام مخلوقات کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرنا، جیسا کہ زیرِ مطالعہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

واجبی حقوق کی ادائیگی سے متعلق احسان واجب ہے۔ مثلاً والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا، صلہ رحمی کرنا، تمام امور و معاملات میں عدل و انصاف سے کام لینا اور حق داروں کے حق کو کما حقہ ادا کرنا وغیرہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَٱعۡبُدُواْ ٱللَّهَ وَلَا تُشۡرِكُواْ بِهِۦ شَيۡـٔٗاۖ وَبِٱلۡوَٰلِدَيۡنِ إِحۡسَٰنٗا وَبِذِي ٱلۡقُرۡبَىٰ وَٱلۡيَتَٰمَىٰ وَٱلۡمَسَٰكِينِ وَٱلۡجَارِ ذِي ٱلۡقُرۡبَىٰ وَٱلۡجَارِ ٱلۡجُنُبِ وَٱلصَّاحِبِ بِٱلۡجَنۢبِ وَٱبۡنِ ٱلسَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتۡ أَيۡمَٰنُكُمۡۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخۡتَالٗا فَخُورًا﴾ ''اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور رشتے داروں کے ساتھ اور یتیموں، مسکینوں، قرابت والے ہم سائے، اجنبی ہم سائے، عارضی ساتھی، مسافر اور جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ بنے ہیں (احسان کرو)۔ یقیناً اللہ ایسے شخص سے محبت نہیں کرتا، جو اکڑنے والا، شیخی مارنے والا ہو۔'' [النساء:٣٦]

مستحب امور سے متعلق مامور احسان مستحب ہے۔ مثلاً خندہ پیشانی سے پیش آنا، لوگوں کو اپنی ذات سے مالی و بدنی، علمی و دینی نفع پہنچانا، حق داروں کو ان کے حق سے زیادہ واپس کرنا، مصیبت میں لوگوں کے کام آنا، ضرورت مندوں کی ضرورت کو پوری کرنا حتیٰ کہ اگر کسی سے تکلیف پہنچ رہی ہو تب بھی اس

کی برائی کے بدلے اس کے ساتھ احسان کرنا اور برائی کو احسان و بھلائی سے دور کرنا وغیرہ۔ بندوں کو ہمیشہ یہ بات یادرکھنی چاہیے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہم پر کسی حق اور بدلے کے بغیر اپنے لطف و کرم کا احسان کیا ہے ہم بھی اس کی جملہ مخلوق کے ساتھ احسان کریں، خواہ کسی بھی نوعیت کا احسان ہو اور اس سلسلے میں انسان و حیوان کے درمیان تفریق نہ کریں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿...وَأَحْسِنْ كَمَآ أَحْسَنَ ٱللَّهُ إِلَيْكَ...﴾ "اور احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے۔" [القصص:۷۷]

اللہ کی کسی بھی مخلوق کے ساتھ احسان کرنے کو معمولی نہ سمجھیں، کیوں کہ یہ انسان کے حسنِ عمل اور حسنِ کردار کی دلیل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں بنو اسرائیل کی دو عورتوں کا یہ واقعہ ملاحظہ فرمائیں کہ اللہ رب العالمین کو یہ عمل کس قدر پسندیدہ ہے کہ اللہ نے جانور کے ساتھ احسان کرنے کی وجہ سے ایک عورت کو بخش دیا اور دوسری عورت کو اس میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کر دیا۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بنو اسرائیل کی ایک فاحشہ عورت صرف اس وجہ سے بخش دی گئی کہ وہ گرمی کے دن میں ایک کتے کے قریب سے گزر رہی تھی، جو ایک کنویں کے قریب پیاس کی شدت سے ہانپ رہا تھا، اس عورت نے اپنا موزہ نکالا اور اس میں اپنا دوپٹہ باندھ کر پانی نکالا اور اس کتے کو پلا دیا تو اس کی بخشش اسی کی وجہ سے ہو گئی۔" [صحیح بخاری:۳۳۲۱،۳۴۶۷، صحیح مسلم:۲۲۴۵]

اور اس کے برعکس احسان کو پامال کرنے والی ایک عورت کے بارے میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک عورت محض ایک بلی کی وجہ سے عذاب دی گئی، جسے اس نے باندھے رکھا یہاں تک کہ وہ بھوکی مر گئی، اس وجہ سے وہ جہنم میں داخل ہوئی۔ اس نے اسے باندھے رکھا نہ اسے کچھ کھلایا، نہ پلایا اور نہ اسے چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے ہی کھا لیتی۔" [صحیح بخاری:۲۳۶۵،۳۳۱۸،۳۴۸۲، صحیح مسلم:۲۲۴۲]

ان دونوں واقعات سے ہمیں عبرت حاصل کرتے ہوئے ہر کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے اور کسی کو تکلیف نہیں دینی چاہیے، اللہ ہمارے کسی بھی عمل اور ادا سے خوش ہو کر ہماری مغفرت فرما سکتا

ہے، بشرط یہ کہ ہمارا ایمان و عقیدہ درست ہو۔ نیز احسان کا یہ مقام ہے کہ احسان کرنے والے اللہ کے محبوب بندے ہوتے ہیں، اللہ رب العالمین محسنین سے محبت کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿.....وَأَحْسِنُوٓاْ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ﴾ ''اور احسان کرو، بے شک اللہ محسنین سے محبت کرتا ہے۔'' [البقرة:۱۹۵]

گذشتہ صفحات میں احسان سے متعلق جو تفصیل پیش کی گئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن ''محسنین'' سے اللہ رب العزت محبت کرتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی کامل نگرانی کا تصور رکھتے ہیں، پوری مضبوطی و پختگی اور اخلاص کے ساتھ اپنے تمام امور کو انجام دیتے ہیں، اللہ پر ان کا ایمان پختہ ہوتا ہے اور وہ متقی ہوتے ہیں، نیکی کا ہر کام کرتے ہیں، خیر و بھلائی کو عام کرتے ہیں، لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں، خوش حالی اور تنگ دستی دونوں صورتوں میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، غصے کو پی جانے والے اور لوگوں سے در گزر کرنے والے ہوتے ہیں، واجبات کی ادائیگی کے ساتھ نوافل کا بھی خوب اہتمام کرتے ہیں، عفو و در گزر سے کام لیتے ہیں اور اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے بلکہ ان کی ذات ہر ایک کے لیے نفع بخش ہوتی ہے۔ وغیرہ

راویِ حدیث کا تعارف :

سیدنا شداد بن اوس بن ثابت انصاری نجاری رضی اللہ عنہما کی کنیت ابو یعلی ہے۔ یہ مشہور صحابی و شاعرِ رسول حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بھتیجے ہیں۔ انھیں اور ان کے والد دونوں کو شرفِ صحابیت حاصل ہے۔ ان کی ماں کا نام صریمہ ہے، جو بنو عدی بن نجار کی ایک خاتون تھیں۔ مدینہ کے رہائشی تھے، مگر بعد میں بیت المقدس میں سکونت اختیار کر لی۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے بقول یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں علم اور بُرد باری عطا کی گئی تھی۔ ۷۵ سال کی عمر میں شام کے اندر ۵۸ یا ۵۹ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔ ان سے پچاس (۵۰) حدیثیں مروی ہیں۔

جہاں کہیں رہو اللہ سے ڈرو اور حسنِ اخلاق کو لازم پکڑو!

(۱۸) عَنْ أَبِي ذَرٍّ جُنْدُبِ بْنِ جُنَادَةَ، وَأَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**اِتَّقِ اللَّهَ حَيْثُمَا كُنْتَ، وَأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ**)) رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ: حَدِيثٌ حَسَنٌ، وَفِي بَعْضِ النُّسَخِ: حَسَنٌ صَحِيحٌ

ابو ذر جندب بن جُنادہ اور ابو عبد الرحمان معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ سے ڈرو، جہاں کہیں بھی رہو اور برائی (ہو جانے) کے بعد نیکی کرو، نیکی برائی کو مٹا دیتی ہے اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔“ (اسے ترمذی[حدیث : ۱۹۸۷]نے روایت کیااور کہا کہ یہ حدیث حسن ہے اور سنن ترمذی کے بعض نسخوں میں ”حسن صحیح“ مرقوم ہے۔)

شرح و فوائد :

یہ بڑی جامع حدیث ہے اور اپنے اندر مکمل خیر و بھلائی کو لیے ہوئے ہے۔ اس حدیث کے مطابق اگر انسان خلوت و جلوت ہر حالت میں تقویٰ اختیار کرلے، گناہ سرزد ہوتے ہی نیکی سے اسے دور کر دے اور حسبِ مراتب و درجات لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے تو وہ مکمل خیر و بھلائی کو حاصل کرلے گا، اس لیے کہ وہ اللہ اور بندوں کے حقوق کو ادا کرنے والا ہو گا نیز اللہ کی عبادت میں احسان کرتے ہوئے بندوں کے ساتھ بھی احسان کرنے والا ہو گا۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابو ذر اور معاذ رضی اللہ عنہما کے واسطے سے پوری امت کو یہ وصیت کی ہے کہ ہر حالت میں جہاں کہیں بھی رہیں اللہ کے احکام کی تعمیل اور منہیات سے اجتناب کرکے اللہ کا تقویٰ اختیار کریں یعنی اللہ سے ڈریں، خواہ تنہائی میں ہوں یا لوگوں کے درمیان میں ہوں، کوئی دیکھ رہا ہو یا نہ دیکھ رہا ہو، دلوں میں بھی اس کا خوف بسائے رکھیں اور ظاہری اعمال میں بھی اللہ کا ڈر دکھائی دے۔ اللہ سے ڈرنے اور تقویٰ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان امور سے دور رہیں، جن کے کرنے یا چھوڑنے کی وجہ سے اللہ ناراض ہو اور اس کے عذاب کا مستحق بننے کا خطرہ لاحق ہو اور ان امور کو بجالائیں جن سے اللہ راضی اور خوش ہوتا ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اپنے ہر عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی

خوش نودی چاہے، اس کے احکام و فرامین کے مطابق اپنی زندگی گزارے، منہیات سے دور رہے اور اوامر کو بجالائے۔ آدمی اسی وقت متقی ہو گا جب وہ دنیا کے بجائے آخرت کی حقیقی زندگی کو اپنے پیشِ نگاہ رکھے گا۔ تقویٰ کے بارے میں جناب طلق بن حبیب عنزلی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''اَلتَّقْوٰی أَنْ تَعْمَلَ بِطَاعَةِ اللَّهِ رَجَاءَ رَحْمَةِ اللَّهِ عَلىٰ نُوْرٍ مِّنَ اللَّهِ، وَأَنْ تَتْرُكَ مَعْصِيَةَ اللَّهِ عَلىٰ نُوْرٍ مِّنَ اللَّهِ تَخَافُ عَقَابَ اللَّهِ'' ''تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ تو اللہ کی اطاعت، اللہ کی دی ہوئی روشنی کے مطابق کرے اور اللہ سے ثواب کی امید رکھے اور اللہ کی نافرمانی، اللہ کی دی ہوئی روشنی کے مطابق ترک کردے، اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے۔'' [تفسیر ابن کثیر ۱/۱۲۳] تقویٰ کے بارے میں ایک عربی شاعر عبد اللہ بن محمد المُعتز باللہ کہتے ہیں:

ے
خَلِّ الذُّنُوبَ صَغِيرَها و كَبِيْرَهَا ذَاكَ التُّقىٰ
وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ أَرْ ضِ الشَّوكِ يَحْذَرُ مَايَرىٰ
لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً إِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصىٰ

''چھوٹے اور بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دو یہی تقویٰ ہے۔ ایسے رہو جیسے کانٹوں والی راہ پر چلنے والا انسان بچ بچا کر چلتا ہے۔ چھوٹے گناہ کو بھی ہلکا نہ جانو، بے شک پہاڑ کنکروں ہی سے بنتا ہے۔''

تقویٰ کا اصل محل دل ہے کہ آدمی دل میں اللہ کا خوف رکھے، جیسا کہ ایک مشہور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے سینے کی طرف تین مرتبہ اشارہ کر کے فرمایا تقویٰ یہاں ہے۔ [صحیح مسلم: ۲۵۶۴] لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی کا ظاہری عمل تقویٰ کے بالکل خلاف ہو بلکہ حقیقی متقی وہ ہے جو ظاہر اور باطن دونوں میں اللہ سے ڈرے، جیسا کہ قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ میں جابجا متقین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان سے اسی بات کی وضاحت ہوتی ہے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اسی وقت ممکن ہو گا جب انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و ہیبت اور اس کی نگرانی کا کامل تصور جاگزیں ہو گا۔ آج کل بہت سے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کرتے پھرتے ہیں اور جب انھیں ان کے اعمالِ بد پر تنبیہ کی جاتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا خوف ہمارے دل میں ہے۔ یہ بالکل غلط رویہ ہے، دل کی صفائی کے ساتھ ساتھ ظاہری اعمال کا بھی شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے، جیسا

کہ زیرِ مطالعہ حدیث میں ہر جگہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وصیت کی گئی ہے اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((**إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ**)) ”اللہ تمھاری صورتوں اور تمھارے مالوں کی طرف نہیں دیکھتا ہے، لیکن وہ تمھارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔“ [صحیح مسلم : ۲۵۶۴]

یعنی دل کی صفائی کے ساتھ ساتھ اعمالِ صالحہ کا ہونا بھی ضروری ہے اور یہ بھی یاد رکھیں! کہ بظاہر جلوت میں نیک اعمال انجام دینا، لوگوں کے سامنے تقوے کا اظہار کرنا اور تنہائی میں اللہ کو بھول کر اس کی حرمتوں کو پامال کرنا بڑا خطرناک معاملہ اور انتہائی بھیانک جرم ہے۔ تنہائی میں اللہ کو بھول کر حرام امور انجام دینے کی وجہ سے روزِ قیامت نیک اعمال کے ذخیرے بھی فضا میں اڑنے والے ذرات کی شکل میں تبدیل کر دیے جائیں گے یعنی پہاڑ جیسے کیے ہوئے اعمال کی کوئی وقعت وحیثیت نہیں ہو گی۔ سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((**لَأَعْلَمَنَّ أَقْوَامًا مِنْ أُمَّتِي، يَأْتُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِحَسَنَاتٍ أَمْثَالِ جِبَالِ تِهَامَةَ بِيْضًا، فَيَجْعَلُهَا اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ هَبَاءً مَنْثُورًا. قَالَ ثَوْبَانُ : يَا رَسُولَ اللَّهِ! صِفْهُمْ لَنَا، جَلِّهِمْ لَنَا؛ أَنْ لَا نَكُونَ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَا نَعْلَمُ. قَالَ : أَمَا إِنَّهُمْ إِخْوَانُكُمْ وَمِنْ جِلْدَتِكُمْ، وَيَأْخُذُونَ مِنَ اللَّيْلِ كَمَا تَأْخُذُونَ، وَلَكِنَّهُمْ أَقْوَامٌ إِذَا خَلَوْا بِمَحَارِمِ اللَّهِ انْتَهَكُوهَا**)) ”میں اپنی امت میں سے ان لوگوں کو ضرور جان لوں گا جو قیامت کے دن تہامہ کے پہاڑوں جیسی سفید نیکیاں لے کر آئیں گے اور اللہ عزوجل ان نیکیوں کو بکھرے ہوئے ذرات میں بدل دے گا۔ ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمارے لیے ان کی صفات بیان فرما دیجیے! ہمارے لیے ان کے حالات کھول دیجیے! اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان میں سے ہو جائیں اور ہمیں علم بھی نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تمھارے بھائیوں میں سے ہوں گے اور تمھاری قوم میں سے ہوں گے اور وہ لوگ رات کا کچھ حصہ عبادت کے لیے لیں گے، جس طرح تم رات کا کچھ حصہ عبادت کے لیے لیتے ہو، لیکن وہ ایسے لوگ ہوں گے کہ جب انھیں تنہائی میں اللہ کے حرام کیے ہوئے گناہوں کا موقع ملے گا تو وہ ان کاموں کا ارتکاب کریں گے۔“ [صحیح / سنن ابن ماجہ: ۴۲۴۵، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۵۰۵]

اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں سے چھپ کر تنہائی میں حرام کام کا ارتکاب کرنا تقویٰ کے خلاف ہے

اور اس طرح کیا جانے والا گناہ نیکیوں کو ضائع کرنے والا ہوتا ہے، اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی تنہائیوں کو گناہوں سے بچائیں، اپنی خلوتوں کو حرام اور فضول امور میں ضائع نہ کریں، جہاں کہیں اور جس بھی حالت میں رہیں اللہ تعالیٰ سے ڈریں اور اللہ تعالیٰ کی کامل نگرانی کا تصور ویقین رکھیں۔

یقیناً اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اور حسنِ اخلاق ایسا وصف ہے، جس کی وجہ سے لوگ بہ کثرت جنت میں داخل ہوں گے، رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے اس عمل کے بارے میں سوال کیا گیا جو سب سے زیادہ جنت میں داخل کرنے کا سبب بنے گا تو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ((تَقْوَى اللَّهِ، وَحُسْنُ الْخُلُقِ)) ”اللہ کا تقویٰ اور حسنِ اخلاق“ [حسن / سنن ترمذی:۲۰۰۴، سنن ابن ماجہ:۴۲۴۶، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ:۹۷۷]

اللہ رب العزت کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔ اللہ نے فرمایا: ﴿...إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ...﴾ ”بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔“ [الحجرات:۱۳]

سیدنا ابو ہریرہ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے پوچھا گیا: لوگوں میں سب سے زیادہ عزت والا کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ”لوگوں میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو ان میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔“ [صحیح بخاری:۳۳۷۴، ۴۶۸۹، صحیح مسلم:۲۳۷۸]

چوں کہ خلوت و جلوت میں تقویٰ اختیار کرنے کے باوجود ماموارت کی بجا آوری اور منہیات سے رکنے میں بسا اوقات بشری تقاضے کے تحت خطا اور کمی ہو سکتی ہے، اسی لیے زیرِ مطالعہ حدیث میں نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ وصیت بھی کی ہے کہ اگر کبھی کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کی تلافی کے لیے فوری طور پر نیک کام کر لیا کریں تاکہ اس کا تدارک ہو اور اس کے جسمانی وروحانی اثراتِ بد کا ازالہ ہو سکے، اس لیے کہ نیکی برائی کا کفارہ بن جاتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿...إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ...﴾ ”بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔“ [ھود:۱۱۴]

گناہوں کے ازالے کے لیے ضروری ہے کہ گناہوں پر ہمیشگی نہ برتی جائے، بلکہ فوراً توبہ و استغفار کیا جائے اور اللہ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگی جائے یعنی خالص توبہ کی جائے۔ اہلِ علم نے ”خالص توبہ“ کی درج ذیل پانچ شرطیں بیان کی ہیں جو کتاب وسنت کے نصوص سے ماخوذ ہیں:

❶ محض اللہ کے لیے ندامت کا اظہار۔ ❷ ترکِ معاصی یعنی جس گناہ سے توبہ کیا جا رہا ہے فوراً اسے ترک کر دیا جائے۔ ❸ مستقبل میں گناہ نہ کرنے کا عزم۔ ❹ حقوق العباد کی ادائیگی یعنی اگر معصیت کا تعلق کسی فرد سے ہو تو اسے راضی کرنا۔ ❺ توبہ کا دروازہ بند ہونے سے پہلے توبہ کرنا یعنی وقتِ نزاع یا اللہ کا عذاب دیکھ لینے سے پہلے اور قیامت کی بڑی نشانی [مثلاً سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دجال کا آنا اور زمین سے جانور کا نکلنا وغیرہ۔] ظاہر ہونے سے پہلے توبہ کرنا۔

جنت میں داخلے کے حق دار اہلِ ایمان متقین کی اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی بیان فرمائی ہے کہ وہ اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے ہیں، بلکہ فوراً ہی توبہ و استغفار سے کام لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ ''اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا اور کون گناہ بخشتا ہے؟ اور انھوں نے جو کیا اس پر اصرار نہیں کرتے، جب کہ وہ جانتے ہوں۔'' [آل عمران:۱۳۵]

قرآن اور حدیث میں عمومیت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں یعنی ہر طرح کی نیکی سے برائی دور ہو جاتی ہے، تاہم کبیرہ گناہوں کی معافی کے لیے توبہ ضروری ہے، اسی طرح بعض اعمالِ صالحہ کے تعلق سے خصوصی طور پر یہ فضیلت وارد ہوئی ہے کہ ان سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ **دراصل نیکیاں برائیوں کو تین طرح سے دور کرتی ہیں:**

❶ نیکیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے برائیوں کو معاف فرما دیتا ہے۔ گناہوں کو دفع کرنے والی نیکیوں میں سے توبہ و استغفار، ذکرِ الٰہی، وضو، پنج وقتہ نمازیں و جمعہ، روزہ، حج و عمرہ، اللہ کی راہ میں شہادت، صدقہ و خیرات، عفو و درگزر، لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، لوگوں پر آسانی کرنا اور پریشان حال و مصیبت زدگان کی پریشانیوں اور مصیبتوں کو دور کرنا وغیرہ، علاوہ ازیں حدود و تعزیرات اور مصائب و تکالیف بھی گناہوں سے کفارے کا باعث ہیں۔

❷ نیکیوں کے اندر یہ تاثیر پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص نیکی کرنے کا عادی ہو جائے تو برائیاں بذاتِ

خود اس سے دور ہو جاتی ہیں اور وہ برائیوں سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

❸ جس سماج و معاشرے میں نیکیاں عام ہوتی ہیں اور وہاں کے لوگوں میں نیکیوں کی عادت پائی جاتی ہے تو اس سماج و معاشرے میں نیکی کا بول بالا ہوتا اور وہاں سے برائیاں دور ہو جاتی ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنے کی ترغیب دی ہے اور سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ حسنِ اخلاق بھی ان اعمال میں سے ہے، جن سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنا خصال تقویٰ میں سے ہے، اس کے بغیر تقویٰ کی تکمیل نہیں ہو گی۔ حُسنِ اخلاق کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، خندہ روئی سے ملا جائے، عفو و درگزر اور صلہ رحمی کی جائے، غصہ پر قابو رکھتے ہوئے اپنی فیض رسانی کو عام کیا جائے، کسی کو تکلیف نہ دی جائے اور گناہوں سے بچتے ہوئے مکارمِ اخلاق کو اپنایا جائے۔ احادیث میں حُسن اخلاق کی بڑی اہمیت و فضیلت بیان کی گئی ہے :

حسنِ اخلاق سے متصف شخص کو سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نہ تو طبعاً بدگو تھے اور نہ بہ تکلف بدگوئی کرنے والے تھے اور فرمایا کرتے تھے: ((إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنُكُمْ أَخْلَاقًا)) "تم میں سب سے بہترین وہ لوگ ہیں، جو تم میں اخلاق میں سب سے اچھے ہوں۔" [صحیح بخاری:۳۵۵۹،۶۰۳۵، صحیح مسلم:۲۳۲۱]

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحَاسِنَكُمْ أَخْلَاقًا)) "یقیناً میرے نزدیک (دنیا میں) تم میں سب سے زیادہ محبوب اور قیامت کے دن سب سے زیادہ مجھ سے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہوں گے، جو سب سے اچھے اخلاق والے ہیں۔" [صحیح / سنن ترمذی:۲۰۱۸، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ:۷۹۱]

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:((مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ)) "قیامت کے دن مومن کے میزان میں حسنِ خلق سے زیادہ بھاری کوئی اور چیز نہیں ہو گی۔" [صحیح / سنن ترمذی:۲۰۰۲، سنن ابوداود:۴۷۹۹، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ:۸۷۶]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:((إِنَّ

الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ)) "یقیناً مومن اپنے حسنِ اخلاق کی وجہ سے صائم اور قیام کرنے والے کا درجہ پالیتا ہے۔" [صحیح / سنن أبو داود: ۴۷۹۸، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۷۹۵]

سیدنا ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أَنَا زَعِيمٌ بِبَيْتٍ فِي رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ، وَإِنْ كَانَ مُحِقًّا، وَبِبَيْتٍ فِي وَسَطِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ، وَإِنْ كَانَ مَازِحًا، وَبِبَيْتٍ فِي أَعْلَى الْجَنَّةِ لِمَنْ حَسَّنَ خُلُقَهُ)) "میں اس شخص کے لیے جنت کے اطراف میں ایک گھر کا ضامن ہوں، جس نے لڑائی جھگڑا چھوڑ دیا اگرچہ وہ حق پر ہو اور اس شخص کے لیے جنت کے بیچوں بیچ میں ایک گھر کا ضامن ہوں، جس نے جھوٹ بولنا چھوڑ دیا اگرچہ وہ ہنسی مذاق ہی میں ہو اور اس شخص کے لیے جنت کے بلند ترین حصے میں ایک گھر کا ضامن ہوں، جس نے اپنے اخلاق کو اچھا کیا۔" [حسن / سنن أبو داود: ۴۸۰۰، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۲۷۳]

حسنِ اخلاق ایمان کی سب سے بہترین خصلت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا)) "مومنوں میں سب سے کامل ایمان والا وہ ہے، جو ان میں سب سے بہتر اخلاق والا ہے۔" [حسن صحیح / سنن أبو داود: ۴۶۸۲، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۲۸۴]

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أَفْشِ السَّلَامَ وَابْذُلِ الطَّعَامَ وَاسْتَحْيِ مِنَ اللَّهِ اسْتَحْيَاءَكَ رَجُلاً مِنْ أَهْلِكَ، وَإِذَا أَسَأْتَ فَأَحْسِنْ، وَلْتُحَسِّنْ خُلُقَكَ مَا اسْتَطَعْتَ)) "سلام کو عام کرو، کھانا کھلاؤ اور اللہ سے اتنا حیا کرو جتنا کہ تم اپنے گھر کے ایک فرد سے کرتے ہو اور جب تم سے گناہ ہو جائے تو فوراً نیکی کرو اور تم سے جس قدر ہو سکے اپنے اخلاق کو اچھا بناؤ۔" [صحیح / اسے امام محمد بن نصر المروزی (الإیمان قلمی ۱/۲۲۶) اور امام بزار (کشف الأستار: ۲۱۷۲) نے روایت کیا ہے، دیکھیے: سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۳۵۵۹]

معلوم یہ ہوا کہ لوگوں میں سب سے اچھا، ایمان میں سب سے کامل اور روزِ قیامت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہو گا، جو لوگوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آئے، اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے، عفو و درگزر اور صبر و تحمل سے کام لے، کسی بھی حال میں تہذیب و شائستگی کا دامن نہ چھوڑے، جو خود اپنے لیے پسند کرے وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرے، جس کے اخلاق و کردار

سب سے اچھے ہوں، جس کے عادات و اطوار کتاب و سنت کے مطابق ہوں اور ایسا شخص اپنے حُسنِ اخلاق و کردار کے ذریعے بڑے بڑے معرکے سر کرلیتا ہے، اپنے حُسنِ کردار کے ذریعہ اپنے مخالف کو بھی اپنا ہم نوا بنالیتا ہے اور جب اخلاق بگڑتا ہے تو دوست بھی دشمن بن جاتے ہیں، اسی لیے لوگوں کے ساتھ حُسنِ اخلاق سے پیش آنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حُسنِ اخلاق کو اپنانے کے سلسلے میں ہمارے لیے ہمارے رہبر ورہنما اور اسوہ وقدوہ رسولِ کریم ﷺ عمدہ و بہترین اور قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ قرآنی شہادت کے مطابق آپ ﷺ اخلاق کے عمدہ وبلند ترین مرتبہ پر فائز تھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ ''اور بے شک تو اخلاق کے بلند مرتبے پر ہے۔'' [القلم:۴]

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبوی اخلاق کی بابت استفسار کیا گیا تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ (قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) میں نے کہا: کیوں نہیں؟ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ((فَإِنَّ خُلُقَ نَبِيِّ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، كَانَ الْقُرْآنَ)) یقیناً نبی ﷺ کا خُلق قرآن تھا۔ [صحیح مسلم:۷۴۶]

معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے اخلاق قرآن کریم کا عملی نمونہ تھے، پورا کا پورا قرآن ہی آپ کا اخلاق تھا اور آپ نے قرآنی تعلیمات کے مطابق زندگی گزار کر ہمارے لیے اپنی اعلیٰ سیرت و اخلاق کا عمدہ نمونہ پیش کر دیا ہے۔ حُسنِ کردار کی بلندی کا اندازہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے لگایئے: ''میں نے دس سال تک نبی ﷺ کی خدمت کی، آپ ﷺ نے کبھی مجھے اُف تک نہیں کہا، نہ کبھی یہ کہا: یہ کام تم نے کیوں کیا؟ اور نہ یہ کہا: تم نے کیوں نہیں کیا؟'' [صحیح بخاری:۶۰۳۸، صحیح مسلم:۲۳۰۹]

یہ حُسنِ اخلاق اور عمدہ کردار کی بلند ترین مثال ہے کہ اس قدر لمبی مصاحبت اور ہم نشینی کے باوجود رسول کریم ﷺ نے کبھی انھیں اُف تک نہیں کہا، ڈانٹنا تو دور کی بات ہے، جب کہ وہ ابھی بچے تھے اور روز مرہ کے معمولات میں ضرور ان سے بھول چوک ہوتی رہی ہوگی۔ اس قدر عمدہ اخلاق و کردار کے وصف سے متصف ہوتے ہوئے بھی نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ سے اپنے اخلاق کی درستی کے طلب گار رہتے تھے اور اپنی ذات سے بُرے اخلاق کو دور کرنے کی دعا فرمایا کرتے تھے، چناں چہ آپ ﷺ کی رات کی نماز کی دعائے استفتاح میں یہ جملہ بھی ہوا کرتا تھا: ((...وَاهْدِنِي لِأَحْسَنِ الأَخْلَاقِ، لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا، لَا يَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ...))

"...اور اخلاقِ حسنہ کی طرف میری رہنمائی فرما، صرف تو ہی اچھے اخلاق کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے اور اخلاقِ قبیحہ کو مجھ سے دور فرمادے، صرف تو ہی مجھ سے بُرے اخلاق کو پھیر سکتا ہے۔" [صحیح مسلم:۷۷۱]

نیز حسنِ اخلاق سے متعلق نبی کریم ﷺ سے یہ دعا بھی ثابت ہے:

((اَللّٰهُمَّ أحْسَنْتَ خَلْقِي فَأَحْسِنْ خُلُقِي)) "اے اللہ! تو نے میری تخلیق اچھی فرمائی ہے، اس لیے میرے اخلاق کو بھی اچھا بنادے۔" [إسنادہ حسن / مسند احمد:۳۸۲۳، صحیح الترغیب والترھیب:۲۶۵۷]

نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل و کردار کے ذریعہ ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اپنی دعا میں اللہ سے بلند اخلاق طلب کریں، لہٰذا ہمیں بھی اپنے نبی کے معمول کی پیروی کرنی چاہیے اور اپنے اخلاق کو نبوی اخلاق و کردار کے مطابق درست رکھتے ہوئے اس کی درستی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہنا چاہیے۔

راویِ حدیث کا تعارف :

❁ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کے نام کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ مشہور یہی ہے کہ یہ جندب بن جُنادہ بن سفیان بن عبید بن وقیعہ بن حرام بن غفار ہیں۔ ان کا تعلق کنانہ بن خزیمہ کے قبیلے بنو غفار سے ہے۔ ان کی کنیت ابو ذر غِفَاری ہے اور یہ اپنی کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ سابقین اوّلین میں سے ہیں، چار لوگوں کے بعد پانچویں نمبر پر انھوں نے مکہ کے اندر اسلام قبول کیا اور پھر نبوی فرمان کے مطابق اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے اور غزوۂ خندق کے بعد نبی ﷺ کے پاس مدینہ آئے۔ زہد و عبادت اور تقویٰ و پرہیز گاری کے لیے مشہور ہیں، صدق گوئی و سچائی میں بھی ضرب المثل تھے اور ان کے مناقب و فضائل بہت زیادہ ہیں۔ انھوں نے ہی نبی ﷺ کو سب سے پہلے اسلامی سلام پیش کیا۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مقام ربذہ کے اندر ۳۲ ہجری میں وفات پائی۔ ان سے (۲۸۱) حدیثیں مروی ہیں۔

❁ ابوعبد الرحمان مُعاذ بن جبل بن عمرو بن اوس بن عائذ بن عدی انصاری خزرجی رضی اللہ عنہ جلیل القدر اور فقیہ صحابیِ رسول ہیں۔ ان کی والدہ کا نام ہند بنت سہل ہے اور انھیں زبانِ نبوت سے امت میں حلال و حرام کی سب سے زیادہ معرفت رکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ بڑے خوب صورت اور تندرست تھے۔ نبوت کے بارہویں سال اسلام لائے، جب کہ ان کی عمر ۱۸ سال تھی اور بیعتِ عقبہ و غزوۂ بدر و احد وغیرہ میں شریک ہوئے۔ نبی ﷺ نے انھیں یمن کا گورنر و معلم بنایا اور عہد فاروقی میں شام کے حاکم مقرر کیے گئے۔ ۱۷ھ یا ایک قول کے مطابق ۱۸ھ میں ملک شام کے اندر طاعون کی بیماری میں ۳۸ برس کی عمر پا کر عین عنفوانِ شباب میں وفات پائی۔ ان سے تقریباً ایک سو ستاون (۱۵۷) احادیث مروی ہیں۔

✿ ✿ ❁ ✿ ✿

احکامِ الٰہی کی حفاظت اور اس کے ثمرات

(۱۹) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ : كُنْتُ خَلْفَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا، فَقَالَ : ((**يَا غُلَامُ! إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ : اِحْفَظِ اللَّهَ يَحْفَظْكَ، اِحْفَظِ اللَّهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللَّهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللَّهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ لَكَ، وَإِنِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ عَلَيْكَ؛ رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ، وَجَفَّتِ الصُّحُفُ**)) رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ : حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ. وَفِي رِوَايَةِ غَيْرِ التِّرْمِذِيِّ : ((**اِحْفَظِ اللَّهَ تَجِدْهُ أَمَامَكَ، تَعَرَّفْ إِلَى اللَّهِ فِي الرَّخَاءِ يَعْرِفُكَ فِي الشِّدَّةِ. وَاعْلَمْ! أَنَّ مَا أَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ، وَمَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ. وَاعْلَمْ! أَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ، وَأَنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْكَرْبِ، وَأَنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا**))

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں (سواری پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے لڑکے! میں تمھیں چند کلمات سکھا رہا ہوں: تم اللہ کی حفاظت کرو وہ تمھاری حفاظت کرے گا، تم اللہ کی حفاظت کرو تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے اور جب تم سوال کرو تو صرف اللہ سے سوال کرو اور جب مدد طلب کرو تو صرف اللہ سے مدد طلب کرو۔ جان لو! بے شک پوری امت اکٹھا ہو کر اگر تجھے کچھ نفع پہنچانا چاہے تو وہ تمھیں اس سے زیادہ کچھ نہیں نفع پہنچا سکتی ہے جتنا اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے اور اگر وہ تجھے کچھ نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے تو وہ تمھیں اس سے زیادہ کچھ نہیں نقصان پہنچا سکتی جتنا اللہ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔'' (اسے ترمذی (۲۵۱٦) نے روایت کیا ہے اور حسن صحیح قرار دیا ہے۔) نیز ترمذی کے علاوہ ایک اور روایت میں ہے: ''تم اللہ کی حفاظت کرو تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے، تم خوش حالی میں اللہ کو پہچانو اور اس کی طرف توجہ کرو وہ سختی میں تمھیں پہچانے گا اور جان لو! جو (نعمت) تم سے ہٹ گئی ہے وہ تمھیں پہنچ نہیں سکتی اور جو تمھیں حاصل ہو چکی ہے وہ تم سے دور نہیں ہو سکتی۔ جان لو! بے شک مدد صبر کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور تکلیف کے ساتھ کشادگی لگی ہوئی ہے اور دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔''

(صحیح / مسند احمد: ۲۸۰۳)

شرح و فوائد :

یہ جامع ترین حدیث امورِ دین سے متعلق اہم ترین بنیادی قواعد اور عظیم وصیتوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس حدیث پر غور وفکر کرنا اور اس کے معانی ومفاہیم کو سمجھنا ہر فرد کے لیے ضروری ہے۔ اسے حرزِ جاں بنا کر اس پر عمل کرنے کی صورت میں آدمی اللہ کی حفاظت وامان میں آکر دنیا وآخرت میں سرخرو ہوگا اور اللہ کی رحمت وفضل اور عزت وسربلندی سے سرفراز ہوگا۔ اس حدیث کے مخاطب اگرچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، لیکن ان کے توسط سے پوری امت کو یہ جامع ہدایات دی گئی ہیں۔

اس مہتم بالشان حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اسلام کی بنیادی تعلیم کا درس دیا ہے اور انھیں خالص توحید، عقیدہ وعبادت اور اخلاق وآداب کی باتیں بڑے اچھے اسلوب میں سمجھائی ہیں، جب کہ وہ ابھی نوعمر تھے تاکہ ابتدا ہی سے توحید کی باتیں ان کے ذہن ودماغ میں پیوست ہو جائیں۔ اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ بچوں اور نئی نسل کی تربیت صحیح اسلامی نہج پر بہتر طریقے سے ہونی چاہیے اور ان کے ذہن ودماغ میں ابتدا ہی سے نہایت اچھے اسلوب میں توحید اور عقیدۂ صحیحہ کی باتیں پیوست کی جانی چاہیئں تاکہ وہ اپنی آیندہ کی زندگی میں گمراہی کا شکار نہ ہوں، بالخصوص موجودہ الحادی دور میں اس کی اہمیت وضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے، لیکن معلمین ومربین اور اساتذہ ووالدین کی طرف سے اس جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی جارہی ہے، جس کی وجہ سے سماجی ومعاشرتی خرابیوں کے ساتھ ساتھ عقیدہ وعبادات کی خرابیاں بھی مسلم نوجوانوں کے اندر بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے، لہٰذا تمام طبقہ کے ذمہ داروں کو اس جانب خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

"اللہ کی حفاظت کرو" اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام وحدود، حقوق، اوامر ونواہی اور دین وشریعت کی حفاظت کرو، عالمِ ارواح میں اس کے ساتھ کیے جانے والے عہد وپیمان کا ہر وقت خیال رکھو، اس کی توحید وعبادت میں خلل نہ آنے دو اور اگر احکامِ الٰہی کی بجا آوری میں کبھی کوتاہی ہو جائے تو فوری طور پر توبہ وانابت سے کام لو، بالخصوص ایمان، حدودِ الٰہی، وضو اور نماز، زبان وشرم گاہ، سر اور پیٹ، عہد وپیمان اور قسموں کی حفاظت کرو۔ کوئی آدمی اگر ان کی پابندی کرے تو وہ اپنی حفاظت ونصرت میں اللہ کو اپنے سامنے پائے گا، اسے یہی محسوس ہوگا کہ اللہ ہمارے سامنے ہے اور اس کے تمام اعضاء وجوارح اللہ کے اطاعت گزار ہو جائیں گے۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کے ساتھ ہے، لیکن احکامِ الٰہی کی حفاظت وپابندی کرنے والوں کو اللہ کی معیتِ خاصہ اور اس کی قربت حاصل ہوتی ہے۔

"اللہ تمھاری حفاظت کرے گا" اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ دنیا میں اپنے احکام و حدود کی حفاظت کرنے والے بندے کی محافظت اس کے دنیاوی مصالح، جان ومال، عزت و آبرو اور اس کے دینی مصالح یعنی ایمان و استقامت میں فرماتا ہے۔ چناں چہ اللہ اسے مصائب و تکالیف، ذلت و رسوائی، شیطانی و نفسانی خواہشات کی پیروی اور گمراہ کن باطل افکار و نظریات اور شبہات میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا اور ان سے بچنے کی راہیں دکھائے گا، اس کے دین و ایمان کی حفاظت فرما کر اسے ایمان کی حالت میں موت دے گا اور پھر عذابِ قبر اور آخرت کے رسوا کن عذاب سے بھی محفوظ رکھے گا۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ عمومی طور پر تمام انسانوں کی جان ومال، اہل وعیال، صحت و تندرستی اور عقل وفہم کی حفاظت فرماتا ہے، لیکن اللہ کے احکام کی حفاظت و پابندی کرنے والے اہلِ ایمان کو اللہ کی حفاظتِ خاصہ حاصل ہوتی ہے۔ اللہ ان کی جان ومال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان کے دین و ایمان کی حفاظت فرماتا ہے، آخری دم تک انھیں ایمان و استقامت پر سلامت رکھتا ہے، ان کی اولاد کی بھی حفاظت فرماتا ہے، انھیں گناہوں کی تاریکی میں بھٹکنے سے محفوظ رکھتا ہے، معصیت سے بچنے کی توفیق دیتا ہے اور کسی مصیبت میں گرفتار ہونے پر ان کی مدد فرماتا ہے اور معصیت سے نکلنے کی کوئی نہ کوئی سبیل پیدا فرما دیتا ہے، گویا ہر طرح سے اُن کے دنیاوی اور اُخروی مصالح کا کفیل بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

▪ ﴿...وَأَوْفُواْ بِعَهْدِيٓ أُوفِ بِعَهْدِكُمْ...﴾ "اور تم میرا عہد پورا کرو، میں تمھارا عہد پورا کروں گا۔" [البقرۃ:۴۰] ▪ ﴿فَٱذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ وَٱشْكُرُواْ لِي وَلَا تَكْفُرُونِ﴾ "سو تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔" [البقرۃ:۱۵۲] ▪ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن تَنصُرُواْ ٱللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم جما دے گا۔" [محمد:۷]

اللہ کی حفاظت اور اسے دھیان میں رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبانی طور پر تو اس کا ذکر کیا جائے، تسبیحات پڑھی جائیں اور اس کے احکام کو بھلا ہی دیا جائے اور اس نے جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں انھیں بالائے طاق رکھ دیا جائے، بلکہ دل و زبان اور تمام اعضاء و جوارح سے احکامِ الٰہی کی پابندی کی جائے اور اسے یاد رکھا جائے۔ یاد رکھیں! جو لوگ اللہ کے ذکر سے روگردانی کرتے ہیں، احکامِ شریعت

کی حفاظت نہیں کرتے اور اللہ کو بھلا دیتے ہیں تو اللہ بھی دنیا میں انھیں چھوڑ دیتا ہے اور ان کی دنیا کی زندگی کو تنگ کر دیتا ہے اور آخرت میں بھی انھیں چھوڑ دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

◘ ﴿...نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ...﴾ "وہ اللہ کو بھول گئے تو اس نے انھیں بھلا دیا۔" [التوبة:٦٧] ◘ ﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى﴾ "اور جس نے میرے ذکر سے منہ پھیرا یقیناً اس کے لیے تنگ گزران ہے اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔" [طہ:١٢٤] ◘ ﴿وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنْسَاكُمْ كَمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ نَاصِرِينَ﴾ "اور کہہ دیا جائے گا کہ آج ہم تمھیں بھلا دیں گے جیسے تم نے اپنے اس دن کے ملنے کو بھلا دیا اور تمھارا ٹھکانا آگ ہے اور تمھارے کوئی مدد کرنے والے نہیں۔" [الجاثیۃ:٣٤]

زیرِ بحث حدیث میں رسول کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے دوسری نصیحت یہ کی ہے کہ جب تم سوال کرو تو صرف اللہ سے سوال کرو یعنی جو کچھ مانگنا ہو اور جب بھی مانگنا ہو اللہ سے مانگو کسی مخلوق کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرو، کیوں اللہ ہی عطا کرنے والا اور تمام مخلوق کی ہر قسم کی ضروریات کو پوری کرنے والا ہے، وہی حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

◘ ﴿وَسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾ "اور اللہ سے اس کے فضل میں سے حصہ مانگو۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔" [النساء:٣٢] ◘ ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ "اور جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق سوال کریں (تو انھیں کہہ دیجیے کہ) بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کہ وہ ہدایت پائیں۔" [البقرۃ:١٨٦]

سیدنا ابو ہریرہ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ ہر رات جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہتا ہے آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور کہتا ہے: کوئی ہے مجھ سے دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ کوئی مجھ سے مانگنے والا ہے کہ میں اسے عطا کروں؟ کوئی مجھ سے مغفرت طلب کرنے والا ہے کہ میں اسے بخش دوں؟" [صحیح بخاری:١١٤٥، صحیح مسلم:٧٥٨]

خادمِ رسول سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ تَكَفَّلَ لِي أَلَّا يَسْأَلَ النَّاسَ شَيْئًا وَأَتَكَفَّلُ لَهُ بِالْجَنَّةِ؟)) ”کون ہے جو مجھے ضمانت دے کہ وہ لوگوں سے کچھ نہیں مانگے گا اور میں اسے جنت کی ضمانت دوں؟“ ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں ضمانت دیتا ہوں۔ پس وہ کسی سے کوئی چیز نہیں مانگتے تھے۔[صحیح / سنن أبو داود:۱۶۴۳، سنن نسائی:۲۵۹۰، سنن ابن ماجہ:۱۸۳۷، مسند احمد:۲۲۳۶۶]

جو امور صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں مثلاً نفع و نقصان، صحت و تندرستی، اولاد، بیماری و شفا، ہدایت، جنت میں داخلہ، جہنم سے دوری، فتح و نصرت، کائنات میں کسی طرح کی مافوق الفطرت تصرف، رزق میں کشادگی وغیرہ تو ان کا سوال صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے کرنا چاہیے، اللہ کے علاوہ کسی اور سے مانگنا جائز نہیں، اللہ تعالیٰ سوال کرنے سے خوش ہوتا ہے اور بندے کو نوازتا ہے اور سوال نہ کرنے سے ناراض ہوتا ہے، جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّهُ مَنْ لَّمْ يَسْأَلِ اللَّهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ)) ”جو اللہ سے سوال نہیں کرتا اللہ اس پر ناراض ہوتا ہے۔“ [حسن / سنن ترمذی:۳۳۷۳، سنن ابن ماجہ:۳۸۲۷، مسند احمد:۹۷۰۱] اور جو چیزیں مخلوق کے اختیار میں نہیں ہیں، انھیں مخلوق میں سے کسی فرد سے طلب کرنا شرک ہے۔ قرآن و حدیث میں کسی غیر اللہ کو حاجت روائی، مشکل کشائی اور نفع و ضرر کے لیے پکارنے سے روکا گیا ہے اور اسے شرک قرار دیا گیا ہے۔ نفع و ضرر اللہ کے اختیار میں ہے، وہی اس کا مالک ہے، اس نے جو فیصلہ کر دیا ہے وہ ہو کر رہے گا اسے کوئی بدل نہیں سکتا ہے اور اللہ جس کی نصرت میں ہو پوری دنیا اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی اور جس کو نقصان پہنچانا چاہے پوری دنیا مل کر اسے فائدہ نہیں پہنچا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ ٱللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۖ فَإِن فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ۝ وَإِن يَمْسَسْكَ ٱللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُۥٓ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهِۦ ۚ يُصِيبُ بِهِۦ مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ ۚ وَهُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ﴾ ”اور اللہ کو چھوڑ کر اس چیز کو مت پکارو جو نہ تجھے نفع دے اور نہ تجھے نقصان پہنچائے، پھر اگر تو نے ایسا کیا تو یقیناً تو اس وقت ظالموں میں سے ہو گا۔ اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کر لے تو کوئی اس کے فضل کو ہٹانے والا نہیں، وہ اسے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے پہنچا دیتا ہے اور وہی بے حد بخشنے

والا، نہایت رحم والا ہے۔“ [یونس:۱۰۶-۱۰۷]

تاہم جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے اختیار میں رکھا ہے، ان میں ان سے سوال کرنا جائز ہے، مثلاً کسی شخص سے کسی دنیوی کام اور مدد و تعاون کے لیے کہنا، کسی سے اپنے حق کا مطالبہ کرنا، ظالم کے ظلم کو دور کرنے کے لیے کسی سے مدد مانگنا یا کسی طرح کے وسائل کا سہارا لینا مثلاً بیماری کو دور کرنے کے لیے دوا کا استعمال کرنا وغیرہ، مگر یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں بھی امید و آس صرف اللہ ہی سے رکھیں، کیوں کہ وہی لوگوں کے دلوں کا پھیرنے والا ہے، وہ چاہے تو لوگوں کو آپ کی طرف مائل کر دے اور چاہے تو لوگوں کو آپ سے دور کر دے یعنی یہاں بھی اصل سوال اللہ سے ہونا چاہیے اور وہی اسے پورا بھی کرتا ہے۔

زیرِ بحث حدیث میں رسول کریم ﷺ نے تیسری نصیحت یہ کی ہے کہ جب مدد طلب کرو تو صرف اللہ سے مدد طلب کرو یعنی جب بھی کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو صرف اللہ سے مدد مانگو کسی مخلوق کے دستِ نگر نہ بنو، اللہ ہی اسباب و وسائل کے بغیر ہر طرح کی مدد فرماتا ہے اور اللہ ہی پریشان حال لوگوں کی پریشانیوں کو دور فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَمَّن يُجِيبُ ٱلْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ ٱلسُّوٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ ٱلْأَرْضِ ۗ أَءِلَٰهٌ مَّعَ ٱللَّهِ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ﴾ ”بھلا کون ہے جو لاچار کی دعا قبول کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے اور تمھیں زمین کے جانشین بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ بہت کم تم نصیحت قبول کرتے ہو۔“ [النمل:۶۲]

تاہم ظاہری اسباب کا سہارا لینا اور اسباب و وسائل کے مطابق کسی کی مدد کرنا یا کسی سے مدد لینا جائز ہے اور یہ توحید کے منافی نہیں ہے بس شرط یہ ہے کہ عملاً اور اعتقاداً صرف اور صرف اللہ پر اعتماد رکھا جائے۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَتَعَاوَنُواْ عَلَى ٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُواْ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ﴾ ”نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔“ [المائدۃ:۲] اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((...وَاللهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ أَخِيْهِ...)) ”اللہ بندے کی مدد میں رہتا ہے، جب تک کہ بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔“ [صحیح مسلم:۲۶۹۹]

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، جو ہو چکا ہے اور جو ہونے والا ہے وہ سب

اللہ کی لکھی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے، بندوں کے حق میں جو نفع یا ضرر اللہ نے لکھ دیا ہے وہ اٹل ہے اور ہو کر رہے گا پوری دنیا والے مل کر اسے ٹال نہیں سکتے، اس لیے صرف اللہ ہی پر توکل و اعتماد رکھیں اور صرف اسی کی عبادت کریں۔ کتاب و سنت کے بہت سے نصوص اس پر دلالت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۞ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ ''کوئی مصیبت نہ زمین پر پہنچتی ہے اور نہ تمھاری جانوں پر مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔ یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔ تاکہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمھیں عطا فرمائے اور اللہ کسی تکبر کرنے والے، بہت فخر کرنے والے سے محبت نہیں رکھتا۔'' [الحدید:۲۲-۲۳]

[تقدیر سے متعلق تفصیلی گفتگو حدیث نمبر: ۴ کے تحت ص: ۵۹ تا ۷۱ پر پوری تفصیل سے ہو چکی ہے، لہٰذا اس سے متعلق مزید تفصیل و وضاحت وہیں ملاحظہ فرمائیں۔]

اللہ کو پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے اور اس کی نافرمانی سے بچا جائے اور اس کے ذریعہ اللہ کی محبت حاصل کی جائے، کیوں کہ معرفت محبت کا سبب ہوتی ہے۔ پریشانی اور خوش حالی دونوں میں اللہ سے لو لگائی جائے۔ چناں چہ صحت و عافیت آسودگی و خوش حالی میں اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑیں گے تو تنگی و مصیبت اور بیماری و مصیبت میں اللہ تمھیں یاد رکھے گا اور تمھارا خیال کرے گا۔ عملِ صالح شدت و مصیبت کے وقت نفع بخش ہوتا ہے اور نیک عمل کرنے والے کو مصیبتوں سے نجات دلاتا ہے، جب کہ معصیت و نافرمانی شدت و پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَّسْتَجِيْبَ اللَّهُ لَهُ عِنْدَ الشَّدَائِدِ وَالْكَرْبِ فَلْيُكْثِرِ الدُّعَاءَ فِي الرَّخَاءِ))

''جو شخص یہ پسند کرے کہ مشکلات اور سختیوں کے وقت اللہ اس کی دعا قبول فرمائے تو اسے چاہیے کہ وہ خوش حالی میں بہ کثرت دعا کرے۔'' [حسن / سنن ترمذی: ۳۳۸۲، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۵۹۳]

زیرِ مطالعہ حدیث میں صبر کرنے والوں کے لیے زبردست بشارت و فضیلت موجود ہے۔ ''صبر'' کا لغوی معنیٰ حبس، قید و بند اور روکے رکھنا کے ہیں۔ انسان کا خود کو تکلیف کی حالت میں شکوہ کرنے، ناشکری

کے کلمات ادا کرنے، چہروں کو ہاتھوں سے پیٹنے اور کپڑوں کو پھاڑنے سے روکنے کو "صبر" کہتے ہیں۔ اور اس کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ خوشی و غمی اور مُصیبت و پریشانی وغیرہ کے وقت میں خود کو قابو میں رکھنا اور شرعی حدود سے تجاوز نہ کرنا۔ مطلب یہ کہ ماموراتِ کی تعمیل، منہیات سے اجتناب اور قضا و قدر پر ایمان رکھتے ہوئے نفس کو جزع فزع کرنے اور غضب ناک ہونے سے روکنا، زبان کو نالہ و فریاد اور شکوہ کرنے سے باز رکھنا، اعضاء و جوارح کے اضطراب و انتشار سے بچنا اور مصائب و مشکلات میں ضبط و تحمّل سے کام لینا۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُودَ، وَشَقَّ الْجُيُوبَ، وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ)) "وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو (مصیبت کے وقت) رخسار پیٹے، گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی پکار پکارے۔ (یعنی نوحہ و ماتم کرے۔)" [صحیح بخاری:۱۲۹۷، صحیح مسلم:۱۰۳]

علماء نے صبر کی مندرجہ ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں:

❶ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کی اتباع پر اپنے نفس کو پابند کرنا اور اس راہ میں پیش آنے والی تمام تر تکلیفوں اور پریشانیوں پر صبر کرنا۔ ❷ اللہ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو روکنا اور ممنوعہ کاموں کے کرنے پر ان سے حاصل ہونے والی وقتی لذتوں پر صبر کرتے ہوئے انھیں ترک کر دینا۔ مطلب یہ کہ اللہ کے حکموں کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ ❸ اللہ کی تقدیر و قضا پر مکمل ایمان رکھنا اور اللہ کی طرف سے تقدیر میں لکھی مصیبت و تکلیف پہنچنے پر صبر کرنا اور اس پر اپنی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے اللہ کا شکوہ نہ کرنا اور مخلوق کے شکوہ سے بھی اپنے آپ کو روکے رکھنا۔

اللہ کی مدد و نصرت اور فتح و غلبہ صبر کے ساتھ وابستہ ہے۔ انسان اگر صبر سے کام لے تو اللہ کو راضی و خوش کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی بھلائیوں کو حاصل کر سکتا ہے۔ اللہ نے صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دینے کا وعدہ فرمایا ہے: ﴿...إِنَّمَا يُوَفَّى ٱلصَّٰبِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ "بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔" [الزمر:۱۰]

زیرِ مطالعہ حدیث میں مصیبت زدگان اور پریشان حال لوگوں کے لیے بھی بشارت ہے کہ انھیں مشکلات سے گھبرانا نہیں چاہیے، کیوں کہ ہر مشکل و تنگی کے بعد آسانی و کشادگی ہوتی ہے اور مشکلات کے دن بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

▪ ﴿فَإِنَّ مَعَ ٱلْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ ٱلْعُسْرِ يُسْرًا﴾ ”پس بے شک ہر مشکل کے ساتھ ایک آسانی ہے، بے شک اسی مشکل کے ساتھ ایک اور آسانی ہے۔“ [الشرح:۵-۶]

زیرِ مطالعہ حدیث سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ سفر کے دوران اپنے قیمتی اوقات کو لایعنی و فضول چیزوں اور بے مطلب کی بحث و گفتگو میں ضائع کرنے کے بجائے علمی اور فائدہ مند چیزوں میں لگانا چاہیے اور دعوت و تعلیم کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس جامع ترین حدیثِ نبوی میں بنیادی طور پر اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ صرف اور صرف اللہ تبارک و تعالیٰ سے لو لگانی چاہیے، اسی سے اپنا ربط و تعلق قائم رکھنا چاہیے، اسی کی ذات پر توکل و اعتماد ہونا چاہیے اور اسی کی ذات سے امید و آس لگانی چاہیے۔ یہ جان لیں کہ اگر ہم اپنا پورا دھیان اور مکمل توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف رکھیں گے تو اللہ تعالیٰ بھی دونوں جہان میں ہمارا دھیان رکھے گا اور ہم اللہ کو اپنے سامنے پائیں گے یعنی ہر جگہ وہ ہماری رہنمائی فرمائے گا، بصورتِ دیگر دنیا و آخرت میں ہمارا کوئی حامی و ناصر نہیں ہوگا اور اللہ ہماری طرف سے اپنا رخ پھیر کر ہمیں یوں ہی آزاد چھوڑ دے گا۔

راویِ حدیث کا تعارف:

سیدنا عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف ہاشمی مدنی قریشی رضی اللہ عنہما نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی اور فقہائے صحابہ میں سے ہیں۔ ان کی ولادت ہجرت سے تین سال پہلے مدینہ کے اندر شِعبِ ابی طالب میں ہوئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تحنیک فرمائی۔ ان کی والدہ کا نام ام الفضل لبابہ کبریٰ بنت حارث ہے، جو کہ ام المؤمنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں علم و حکمت، تفقہ فی الدین اور علم تفسیر قرآن کی خصوصی دعا فرمائی تھی، جس کی برکت سے اللہ نے انھیں وفورِ علم سے نوازا تھا اور یہ ”ترجمان القرآن“ ”البحر“ اور ”حبر الامۃ“ کے لقب سے ملقب ہوئے۔ خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں اپنے مجلسِ شوریٰ میں رکھا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر تیرہ سال کی تھی۔ اکہتر سال کے قریب عمر پا کر ۶۸ ہجری میں طائف کے اندر فوت ہوئے۔ سالِ وفات کے تعلق سے یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ ۶۷ یا ۶۹ یا ۷۰ ہجری میں فوت ہوئے اور نمازِ جنازہ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے پڑھائی۔ ان سے ایک ہزار چھ سو ساٹھ (۱۶۶۰) حدیثیں مروی ہیں۔

✿ ✿ ❁ ✿ ✿

حیا نہیں تو کچھ بھی نہیں

(۲۰) عَنْ أَبِی مَسْعُودٍ عُقْبَةَ بْنِ عَمْرٍو الْأَنْصَارِيِّ الْبَدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم : ((**إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُولَى : إِذَا لَمْ تَسْتَحِي فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

ابو مسعود عقبہ بن عمرو انصاری بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک پہلی نبوتوں کے کلام میں سے لوگوں نے جو پایا یہ بھی ہے کہ جب تجھ میں حیا نہ ہو تو جو جی میں آئے وہ کرو۔“ (صحیح بخاری: ۶۱۲۰)

شرح و فوائد :

یہ بڑی اہم حدیث ہے اس پر اسلام کا مدار ہے۔ اس میں حیا کو اپنانے کی ترغیب دی گئی ہے، جو خیر و بھلائی کا سرچشمہ ہے، اس لیے محض شرمندگی محسوس کرکے خیر و بھلائی کے کاموں کو ترک کرنے سے پرہیز کریں جیسا کہ اس حدیث سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے۔ چناں چہ اس حدیث میں جو یہ کہا گیا ہے کہ: ((**فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ**)) ”جو جی میں آئے کرو۔“ محدثینِ کرام نے اس کا مندرجہ ذیل دو مفہوم بیان کیا ہے:

❶ ایک تو یہی کہ یہاں امر حکم کے معنٰی میں نہیں ہے کہ جو چاہو کرو بلکہ یہ دو طرح سے مذمت اور نہی کے معنٰی میں ہے: ① امر ڈانٹ پھٹکار اور دھمکی و وعید کے مفہوم میں ہے یعنی جب تمھارے اندر حیا نہیں ہے تو جو چاہو کرو تمھیں اللہ کی طرف سے اس کا بدلہ مل جائے گا۔ ② امر خبر کے مفہوم میں ہے یعنی جب کسی کے اندر حیا نہیں ہوگی تو وہ جو جی میں آئے گا کرے گا، اس لیے کہ حیا ہی ایسی خوبی ہے جو برائیوں سے روک سکتی ہے اور اگر حیا ہی نہیں تو وہ ہر طرح کی برائی میں ملوث ہو سکتا ہے۔

❷ دوسرے یہ کہ امر اپنے ظاہر لفظ کے مطابق حکم ہی کے معنٰی میں ہے، مطلب یہ کہ نیکی اور بھلائی کے کام جنھیں تم کرنا چاہتے ہو تو جیسا بھی ہو اور جہاں بھی ہو کسی کی پروا کیے بغیر اس کے کرنے میں حیا نہ محسوس کرو بلکہ اسے کر ڈالو۔ اسی پر اسلام کا مدار ہے۔

حیا ایک ایسی ایمانی صفت ہے، جو انسان کو نیکی کی طرف مائل کرتی ہے، شریفانہ عادات و اطوار کو اپنانے پر ابھارتی ہے، اسے مہذب اور باسلیقہ بناتی ہے، برائیوں نیز اخلاق سے گری ہوئی خلافِ مروّت کاموں سے روکتی ہے اور کسی حق دار کے حق میں کمی کرنے سے باز رکھتی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ علماء کے

حوالے سے حیا کے متعلق لکھتے ہیں:

”قَالَ العُلمَاءُ : حَقِيقَةُ الحَيَاءِ خُلُقٌ يَبْعَثُ عَلَى تَرْكِ القَبِيحِ، وَيَمْنَعُ مِنَ التَّقْصِيرِ فِي حَقِّ ذِي الحَقِّ. وَرَوَيْنَا عَنْ أَبِي القَاسِمِ الْجُنَيْدِ رَحِمَهُ اللَّهُ، قَالَ : الحَيَاءُ : رُؤيَةُ الآلَاءِ - أيْ النِّعَمِ - ورُؤْيَةُ التَّقْصِيرِ، فَيَتَوَلَّدُ بَيْنَهُمَا حَالَةٌ تُسَمَّى حَيَاءً“ ”علماء کہتے ہیں کہ حقیقت میں حیا ایسے کردار کا نام ہے، جو قبیح چیزوں کے چھوڑنے پر آمادہ کرے اور صاحبِ حق کو حق پہنچانے میں سرزد ہونے والی کمی و کوتاہی سے روکے۔ ہم نے ابو القاسم جنید رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ: نعمتوں اور کوتاہیوں کو دیکھ لینے کا نام حیا ہے، چناں چہ ان دونوں کے درمیان پیدا ہونے والی حالت کو حیا کہتے ہیں۔“ [ریاض الصالحین مع ترجمہ وفوائد ۱/ ۵۷۵]

حیا کی اہمیت وفضیلت تمام انبیاء ورسل کی شریعتوں میں پائی جاتی تھی، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں ”مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُولَى“ سے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔

احادیث میں حیا کو ایمان کا جزو و شاخ اور خیر و بھلائی کا منبع قرار دیا گیا ہے، چناں چہ حیا کے بغیر انسان کمالِ ایمان کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا ہے۔ جس طرح ایمان کی وجہ سے مومن شخص برائیوں سے دور رہتا ہے اور اس کا ایمان اسے برائیوں سے روکنے کا سبب بنتا ہے، اسی طرح حیا بھی انسان کو فواحش ومنکرات اور معاصی وسیئات سے دور رکھتی ہے، بلکہ حیا اور ایمان کو ایک دوسرے کا قرین قرار دیا گیا ہے کہ دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں، ایک کا وجود دوسرے کے وجود کا متقاضی ہے اور ایک کا نہ پایا جانا دوسرے کے نہ پائے جانے کو مستلزم ہے، یعنی اگر انسان کے اندر ایمان پایا جاتا ہے تو اس میں حیا بھی ہوگا اور اگر ایمان نہیں ہے تو حیا بھی نہیں ہوگا، اسی طرح انسان اگر حیا کے جوہر سے متصف ہے تو ایمان بھی اس کے اندر ہوگا اور اگر حیا نہیں ہے تو ایمان بھی اس کے اندر نہیں ہوگا اور ایسی صورت میں اسے کوئی پروا نہیں ہوگی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں چند احادیث ذکر کی جاتی ہیں:

▪ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ - أَوْ : بِضْعٌ وَسِتُّونَ - شُعْبَةً، فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ : لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ)) ”ایمان کے ستر سے زائد یا ساٹھ سے زائد شعبے ہیں اور ان میں

سب سے افضل ”لا الہ الا اللہ“ کا اقرار کرنا ہے اور سب سے چھوٹا کسی تکلیف دہ چیز کو راستے سے ہٹانا ہے اور حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔“ [صحیح مسلم:۳۵]

▫ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَا كَانَ الْفُحْشُ فِي شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ، وَمَا كَانَ الْحَيَاءُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ)) ”جس چیز میں فحش یعنی بے حیائی ہو گی وہ اسے عیب دار بنادے گی اور جس چیز میں حیا ہو گی وہ اسے خوب صورت بنادے گی۔“ [صحیح / سنن ترمذی:۱۹۷۴، سنن ابن ماجہ:۴۱۸۵، مسند احمد:۱۲۶۸۹، السراج المنیر ۲ / ۱۰۷۵]

▫ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْحَيَاءُ لَا يَأْتِي إِلَّا بِخَيْرٍ)) ”حیا سے بھلائی ہی حاصل ہوتی ہے۔“ [صحیح بخاری: ۶۱۱۷، صحیح مسلم: ۳۷]

▫ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّ الْحَيَاءَ وَالإِيْمَانَ قُرِنَا جَمِيْعًا، فَإِذَا رُفِعَ أَحَدُهُمَا رُفِعَ الآخَرُ)) ”بے شک حیا اور ایمان دونوں ساتھ ساتھ ہیں، جب ان دونوں میں سے ایک اٹھالیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اٹھالیا جاتا ہے۔“ [صحیح / المستدرک علی الصحیحین للحاکم:۵۸، حوالہ: السراج المنیر ۲ / ۱۰۷۳، صحیح الأدب المفرد:۹۸۶]

▫ سیدنا انس بن مالک اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّ لِكُلِّ دِيْنٍ خُلُقًا، وَخُلُقُ الإِسْلَامِ الْحَيَاءُ)) ”ہر دین کے لیے ایک اخلاق ہوتا ہے اور اسلام کا اخلاق حیا ہے۔“ [حسن / سنن ابن ماجہ:۴۱۸۱، ۴۱۸۲، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ:۹۴۰]

▫ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْحَيَاءُ مِنَ الإِيمَانِ، وَالإِيمَانُ فِي الْجَنَّةِ، وَالْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءِ، وَالْجَفَاءُ فِي النَّارِ)) ”حیا ایمان سے ہے اور ایمان جنت میں لے جانے والی ہے۔ اور بد کلامی ظلم سے ہے اور ظلم جہنم میں لے جانے والی ہے۔“ [صحیح / سنن ترمذی: ۲۰۰۹، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ:۴۹۵]

▫ سیدنا ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْحَيَاءُ وَالْعِيُّ شُعْبَتَانِ مِنَ الإِيمَانِ، وَالْبَذَاءُ وَالْبَيَانُ شُعْبَتَانِ مِنَ النِّفَاقِ)) ”حیا اور کم گوئی ایمان کی دو شاخیں ہیں، جب کہ بد کلامی اور کثرتِ کلام نفاق کی دو شاخیں ہیں۔“ [صحیح / سنن ترمذی:۲۰۲۷، مسند احمد:۲۲۳۱۲، السراج المنیر ۲ / ۱۰۷۴]

▪ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک انصاری آدمی کے پاس سے ہوا اس حال میں کہ وہ اپنے بھائی کو حیا کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا، اسے ملامت کر رہا تھا کہ تم بہت شرماتے ہو، گویا وہ کہہ رہا تھا کہ تم اس کی وجہ سے اپنا نقصان کر لیتے ہو۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((**دَعْهُ، فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ**)) ”اسے چھوڑ دو، کیوں کہ حیا ایمان سے ہے۔“ [صحیح بخاری: ۶۱، ۶۱۱۸، صحیح مسلم: ۳۶]

اللہ تعالیٰ صفتِ حیا کو پسند فرماتا ہے اور جس خوبی کو اللہ پسند فرمائے اس کی عظمت و فضیلت کا کیا کہنا! سیدنا یعلیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو میدان میں بغیر تہ بند کے غسل کرتے ہوئے دیکھا تو آپ منبر پر چڑھے اور اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((**إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ حَيِيٌّ سِتِّيرٌ يُحِبُّ الْحَيَاءَ وَالسَّتْرَ، فَإِذَا اغْتَسَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَتِرْ**)) ”یقیناً اللہ عزوجل حیادار اور پردہ پوشی کرنے والا ہے، حیا اور پردہ پوشی کو پسند فرماتا ہے، لہذا جب تم میں سے کوئی شخص غسل کرے تو چاہیے کہ وہ پردہ پوشی کرے۔“ [صحیح / سنن أبو داود: ۴۰۱۲، سنن نسائی: ۴۰۶، السراج المنیر ۲/ ۱۳۲۶]

جب ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کو حیا کی خوبی بہت پسند ہے تو ہمیں اللہ تعالیٰ سے اسی طرح حیا کرنی چاہیے جس طرح حیا کرنے کا حق ہے اور اس کی وضاحت ایک حدیث میں کی گئی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((**اِسْتَحْيُوا مِنَ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ**)) قَالَ: قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّا نَسْتَحْيِي وَالْحَمْدُ لِلَّهِ. قَالَ: ((**لَيْسَ ذَاكَ، وَلَكِنَّ الِاسْتِحْيَاءَ مِنَ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ أَنْ تَحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَا وَعَى، وَالْبَطْنَ وَمَا حَوَى، وَتَتَذَكَّرَ الْمَوْتَ وَالْبِلَى، وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ تَرَكَ زِينَةَ الدُّنْيَا، فَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ فَقَدِ اسْتَحْيَا مِنَ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ**)) ”اللہ سے حیا کرو، جیسا اس سے حیا کرنے کا حق ہے۔“ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایسا نہیں ہے، بلکہ اللہ سے حیا کرنے کا جو حق ہے وہ یہ ہے کہ تم سر اور اس میں جتنی چیزیں ہیں ان سب کی حفاظت کرو اور پیٹ اور اس کے متعلق جو چیزیں ہیں ان کی حفاظت کرو اور یہ کہ تم موت اور بوسیدہ ہو جانے کو یاد کیا کرو اور جسے آخرت کی چاہت ہو وہ دنیا کی

زیب وزینت کو ترک کر دے، پس جس کسی نے ایسا کیا تو اس نے اللہ سے ایسے حیا کیا، جس طرح اس سے حیا کرنے کا حق ہے۔" [حسن / سنن ترمذی: ۲۴۵۸، السراج المنیر ۲/ ۱۰۷۳]

اس حدیث کی روشنی میں اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے حرام کیے ہوئے امور سے بچا جائے اور اس کے حقوق و واجبات کی پابندی کی جائے۔ چناں چہ حیا ایک ایسی عمدہ خوبی و جوہر ہے، جو انسان کو نیکیوں کی راہ پر گامزن کرتی ہے، برائیوں سے متنفر اور اس سے گریزاں رہنے کی تاکید کرتی ہے، لیکن حیا کی صفت اگر شرعی امور کی تعلیم و تعلم اور اس کی ادائیگی میں آڑے آئے اور انسان کو اوامر و واجبات کی ادائیگی سے روک دے اور شرم و حیا کو بنیاد بنا کر انسان اپنے عمدہ خصائل و عادات کا اظہار نہ کر سکے تو وہ قابلِ مذمت ہے اور اسے حیا نہیں بلکہ خجالت اور بزدلی کہتے ہیں اور اس طرح کا معاملہ انسان کے اندر مروّت، خوداعتمادی اور جرأت نہ پائے جانے کی وجہ سے ہوتا ہے، زیرِ مطالعہ حدیث سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے، جیسا کہ اوپر حدیث کے مفہوم کے تحت اسے بیان کیا گیا ہے، لہٰذا حق کے اظہار و استفسار اور دینی امور کو جاننے کے سلسلے میں حیا آڑے نہیں آنا چاہیے، بلکہ بلا جھجھک حق کو جاننا چاہیے اور حق کو جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

((نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ، لَمْ يَكُنْ يَمْنَعُهُنَّ الْحَيَاءُ أَنْ يَتفقَّهْنَ فِي الدِّينِ))
"انصار کی عورتیں کتنی اچھی عورتیں ہیں کہ حیا انھیں دین کی سمجھ حاصل کرنے سے نہیں روکتی۔" [صحیح مسلم: ۳۳۲، امام بخاری نے بھی صحیح بخاری میں، کتاب العلم، باب الحیاء فی العلم کے تحت اسے معلق روایت کیا ہے]

نیز ام المؤمنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ سیدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: ((يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحِي مِنَ الْحَقِّ، فَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ غُسْلٌ إِذَا احْتَلَمَتْ؟ فَقَالَ : نَعَمْ، إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ)) "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یقیناً اللہ حق بات سے حیا نہیں کرتا، کیا عورت پر غسل ہے جب وہ محتلم ہو؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اگر وہ پانی (یعنی کپڑے پر منی کا اثر) دیکھے۔" [صحیح بخاری: ۱۳۰، ۶۱۲۱، صحیح مسلم: ۳۱۳]

[راویِ حدیث ابو مسعود رضی اللہ عنہ کا مختصر تعارف آگے ص: (۱۵۷) پر ملاحظہ فرمائیں۔]

ایمان و استقامت

(۲۱) عَنْ أَبِي عَمْرٍو وَقِيْلَ : أَبِي عَمْرَةَ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قُلْتُ : يَا رَسُولَ اللَّهِ! قُلْ لِي فِي الْإِسْلَامِ قَوْلًا لَا أَسْأَلُ عَنْهُ أَحَدًا غَيْرَكَ، قَالَ : ((**قُلْ : آمَنْتُ بِاللَّهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

ابو عمرو-اور کہا گیا ہے ابو عمرہ-سفیان بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے اسلام کے بارے میں ایسی بات بتا دیجیے کہ آپ کے سوا کسی اور سے مجھے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کہو: میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اسی پر مضبوطی سے جمے رہو۔" (صحیح مسلم:۳۸)

شرح و فوائد :

اس حدیث میں ہے کہ سیدنا سفیان ثقفی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے بارے میں ایسی جامع، نفع بخش اور کامل بات کے بارے میں سوال کیا کہ اس بارے میں انھیں کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے اور وہ انھیں کفایت کر جائے، جس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لفظوں میں پورے اوصافِ اسلام کو بیان کر دیا۔ یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم میں سے ہے یعنی الفاظ کم ہونے کے باوجود بہت زیادہ معانی پر دلالت کرتی ہے۔

اس حدیث میں ہمارے لیے یہ درس موجود ہے کہ ہم بھی علم و عمل کے لیے فقط مفید اور جامع قسم کا سوال کریں، جس طرح کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دنیا و آخرت میں کام آنے والے نفع بخش سوالات کیا کرتے تھے اور جواب دینے والوں کو بھی چاہیے کہ کلام میں جامعیت کو ملحوظِ خاطر رکھیں اور غیر ضروری باتوں کو بیان کرنے سے پرہیز کریں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اسلام کے بنیادی رکن کی تعلیم دی ہے کہ اللہ عزوجل پر ایمان لاؤ اور اسی پر ڈٹے رہو۔ ایمان باللہ اور استقامت میں ایمان و اسلام اور ان سے متعلقہ امور کی تمام بنیادی باتیں اور ہر طرح کے ظاہری و باطنی اعمالِ جوارح و قلوب آجاتے ہیں، چناں چہ فلاح و کامیابی اور جنت میں داخل ہونے اور جہنم سے نجات پانے کے لیے اللہ پر ایمان لانا، اس کی اطاعت کو لازم پکڑنا اور اسی پر ہمیشہ ثابت قدم رہنا، منہیات سے اجتناب کرنا، نبوی طریقے کی پیروی کرنا اور مرتے دم تک اسی پر قائم رہنا ضروری ہے۔

اس حدیث سے ان لوگوں کی زبردست تردید ہوتی ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ ایمان زبانی اقرار اور دلی تصدیق کا نام ہے اور اعمال ایمان کا حصہ نہیں ہیں، اس لیے کہ اس حدیث میں اعمال کو بھی ایمان میں داخل کیا گیا ہے، جیسا کہ اس حدیث سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو رہی ہے کہ ایمان باللہ کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا جائے، دل سے اس کی تصدیق کی جائے اور اعضاء وجوارح کے ذریعہ اس کا اظہار بھی ہو، ایمان صرف زبانی اقرار اور دلی تصدیق کا نام نہیں ہے، بلکہ اسی کے مطابق عمل کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کا نام ایمان ہے اور ایمان باللہ کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ صرف زبانی اقرار کیا جائے اور جملہ معاملات میں سراسر اللہ کی نافرمانی کی جائے نیز اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کی جائے یا ان کے مقام ومرتبے کو بڑھا کر اللہ کے برابر کر دیا جائے، بلکہ نبی ﷺ کی ذاتِ گرامی کے بارے میں حد سے زیادہ غلو کرنے اور ان کی شان میں گستاخی کرنے سے بچنا بھی ضروری ہے۔

زیرِ مطالعہ حدیثِ نبوی میں بیان ہوئے مضمون کا بیان اللہ رب العزت کے کلام قرآن کریم میں بھی ہوا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان واستقامت کے فوائد کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۞ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۞ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ﴾ ”بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے۔ ہم تمھارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی اور تمھارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تمھارے دل چاہیں گے اور تمھارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تم مانگو گے۔ یہ غفور رحیم (بے حد بخشنے والے، نہایت مہربان) کی طرف سے مہمانی ہے۔“ [حم السجدة: ۳۰-۳۲]

دوسری جگہ فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۞ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ ”بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ

غمگین ہوں گے۔ یہ لوگ جنت والے ہیں، ہمیشہ اس میں رہنے والے، اس کے بدلے کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے۔" [الأحقاف:۱۳-۱۴]

مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان و استقامت کے دنیوی و اُخروی فوائد و ثمرات کو بیان فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان و استقامت کی توفیق دے اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے ثمرات و انعامات کا مستحق و حق دار بنائے۔ آمین!

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ "رَبِّيَ اللَّهُ" اور "آمَنْتُ بِاللَّهِ" کا مفہوم ایک ہی ہے اور دوسری سند سے ثابت اس حدیث میں بھی "قُلْ : آمَنْتُ بِاللَّهِ" کے بجائے "قُلْ : رَبِّيَ اللَّهُ" بھی مروی ہے۔ حقیقت میں یہ ایک ایسا جامع کلمہ ہے، جس نے توحیدِ کامل اور شریعتِ اسلامیہ کی پوری تعلیمات کو مکمل طور پر اپنے اندر سمو لیا ہے۔

استقامت کے معنی افراط و تفریط اور کجی و انحراف سے بچ کر سیدھا رہنے اور سیدھا چلنے کے ہیں اور اس سے مراد اللہ عزوجل کے دین اسلام کو مضبوطی سے تھامنا، اس کے حکم پر پوری طرح قائم رہنا، اس کے اوامر و نواہی کی پابندی کرنا اور ہمیشہ کتاب و سنتِ رسول کی پیروی کرتے رہنا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک جسم میں جان ہے اور بدن میں سانس چل رہی ہے توحیدِ خالص پر اچھی طرح قائم رہیں اور موت تک اسی پر ڈٹے رہیں، دائیں بائیں بھٹکنے کے بجائے دینِ اسلام کی سیدھی شاہ راہ پر گامزن رہیں اور ہر طرح کی طاعات و اعمالِ صالحہ انجام دیں، شرک و کفر اور تمام منہیات سے دور رہیں، خلوص و للّٰہیت اور اللہ کی محبت و اطاعت کو لازم پکڑیں، ریا و نمود اور معصیت سے بچیں، کسی بھی حال میں ایمان و عقیدے کا سودا نہ کریں، کوئی خوف یا کسی طرح کا لالچ ایمان اور عملِ صالح سے بھٹکا نہ سکے اور اگر کوئی گناہ یا کوتاہی سرزد ہو جائے تب بھی ایمان اور عملِ صالح کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے بلکہ اپنے گناہ پر اللہ سے توبہ و استغفار کریں، اس کے ذکر سے اپنی زبان کو تر رکھیں اور دیگر اعضاء و جوارح کے ساتھ ایمان کے تقاضے کو پورا کرتے رہیں۔ اللہ کے دین پر پوری طرح قائم رہنا اسی وقت ممکن ہے جب ہر چیز میں آخری نبی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع و پیروی کی جائے گی، کیوں کہ اللہ نے جس سیدھی راہ اور دین پر جمے رہنے کا حکم دیا ہے وہ صرف اور صرف وہی راہ اور دین ہے، جس کی وحی نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی تھی اور

آپ ﷺ کے علاوہ امت کا کوئی بھی فرد ایسا نہیں ہے کہ جس کے قول و فعل کو اللہ کا حکم یا اللہ کا دین قرار دیا گیا ہو اور امت کو اس پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا ہو۔ اللہ نے نبی کریم ﷺ کو دیے گئے حکم پر استقامت اور جمے رہنے کا حکم خود نبی کریم ﷺ کو اور کفر سے توبہ کرنے والے اہلِ ایمان کو دیا ہے اور حد سے تجاوز کرنے سے روکا ہے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾

"پس تو ثابت قدم رہ، جیسے تجھے حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی جنھوں نے تیرے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو، بے شک وہ جو کچھ تم کرتے ہو، اسے خوب دیکھنے والا ہے۔" [ھود:۱۱۲]

تاریخ کے ہر دور میں اہلِ ایمان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ خود نبی ﷺ اور پھر آپ کے اصحاب کو مختلف قسم کی تکلیفیں اٹھانی پڑیں، مگر کبھی ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی اور وہ لوگ پوری پامردی کے ساتھ ہمیشہ دینِ اسلام پر جمے رہے۔ اللہ ہمیں بھی اس کی توفیق دے۔ آمین!

یاد رکھیں ظاہری و باطنی تمام اعمال میں اور خلوت و جلوت تمام جگہوں میں اور خالقِ کائنات کے علاوہ اس کی مخلوقات کے ساتھ بھی استقامت مطلوب ہے۔ بہت سے لوگ ظاہری طور پر دین کے پابند ہوتے ہیں، لیکن ان کے دلوں میں کجی و انحراف پایا جاتا ہے۔ جلوت میں تو دین دار نظر آتے ہیں، لیکن خلوت میں موقع ملتے ہی اللہ کی نافرمانی کرنے سے نہیں چوکتے۔ اللہ کی عبادت کی طرف توجہ تو دیتے ہیں، لیکن لوگوں کے ساتھ ان کا معاملہ خراب رہتا ہے یا اپنا ظاہری اخلاق تو بہتر رکھتے ہیں، لیکن اپنے خالق کے ساتھ ان کا رشتہ قائم نہیں رہتا ہے، اسی طرح کچھ لوگ اوامر یا نواہی کی بجا آوری میں اعتدال و میانہ روی برقرار نہیں رکھ پاتے، جب کہ عبادات و معاملات کے علاوہ تمام امورِ خیر میں اعتدال و میانہ روی مطلوب ہے، چناں چہ اپنی طاقت سے بڑھ کر نیکی کرنا، عبادات کو انجام دینے میں بے جا تشدد سے کام لینا اور دنیاوی امور و معاملات سے کنارہ کش ہو جانا استقامت نہیں ہے، بلکہ استقامت یہ ہے کہ مداومت کے ساتھ واجب احکام کی تعمیل کی جائے، حرام کاموں سے بچا جائے اور نوافل و پسندیدہ اعمال پر بھی حتی المقدور پابندی کی جائے خواہ وہ کم ہی کیوں نہ ہوں۔ اعتدال و میانہ روی کے بارے میں بعض لوگ نہایت سستی و کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اسی کی آڑ میں یہ کہتے ہوئے کہ اسلام میں تنگ نظری

نہیں ہے بعض حرام کام کا بھی ارتکاب کر لیتے ہیں اور فرائض تک کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں اور بسا اوقات کفریہ اعمال بھی انجام دے لیتے ہیں اور یہ سب کچھ اسلام، اسلامی اعتدال اور ایمانی استقامت کے سراسر خلاف ہے اور ایمانی کمزوری کی علامت ہے۔

زیرِ مطالعہ حدیث صحیح مسلم میں اسی قدر ہے جتنا کہ اوپر متن میں نقل کیا گیا ہے، تاہم دیگر محدثین کے یہاں اس روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کو میرے بارے میں کس چیز کا سب سے زیادہ ڈر ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان پکڑی اور فرمایا: "یہ" [صحیح / سنن ترمذی: ۲۴۱۰، سنن ابن ماجہ: ۳۹۷۲، سنن دارمی: ۲۷۵۲، مسند احمد: ۱۵۴۱۶، ۱۵۴۱۷، ۱۹۴۳۱] یعنی اس زبان کا خوف سب سے زیادہ ہے۔

محدثینِ کرام رحمہم اللہ کا یہ ثابت شدہ اصول و ضابطہ ہے کہ ثقہ راویوں کی زیادتی اور اضافہ قابلِ قبول اور قابلِ عمل و حجت ہوتی ہے، یعنی کسی روایت کے کچھ راویان اسے مختصر طور پر بیان کریں اور دوسرے راوی تفصیل سے بیان کریں اور دونوں روایتوں کے رُواۃ ثقہ ہوں یعنی اصولِ حدیث کے مطابق روایت صحیح ہو تو ثقہ راوی کی زیادتی اور اضافہ قبول کیا جائے گا اور دونوں کو ملا کر ہی کوئی مسئلہ اخذ کیا جائے گا اور محدثین کے نزدیک زیرِ مطالعہ حدیث میں موجود مذکورہ اضافہ بھی ثابت و صحیح ہے، اس لیے زبان کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے اور اس کا بے جا استعمال نہ کرکے اس کی آفتوں سے بچنا چاہیے۔ ویسے تو حقیقت میں دل تمام اعضائے انسانی کا مرکز و محور اور سب کا بادشاہ ہے اور دیگر تمام اعضاء اس کے تابع ہوتے ہیں، اگر دل صحیح ہے تو دیگر اعضاء بھی درست ہوتے ہیں اور اگر دل فساد کا شکار ہے تو دیگر اعضاء میں بھی خرابی آجاتی ہے، جیسا کہ اس بارے میں صحیح حدیث گذشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں، لیکن زبان چوں کہ دل کی ترجمان ہوتی ہے، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں جب ایمان و استقامت کا حکم دیا تو اسی کے ساتھ ساتھ زبان کی حفاظت کی بھی تاکید فرمائی تاکہ دل کے اس ترجمان کو قابو میں رکھ کر اعمالِ صالحہ کی حفاظت کی جائے اور اسے ذکر و اذکار، توبہ و استغفار اور بھلی باتوں کے کہنے تک محدود رکھا جائے۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِذَا أَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ فَإِنَّ الْأَعْضَاءَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ، فَتَقُولُ : اتَّقِ اللَّهَ فِينَا، فَإِنَّمَا

نَحْنُ بِكَ، فَإِنِ اسْتَقَمْتَ اِسْتَقَمْنَا، وَإِنِ اعْوَجَجْتَ اِعْوَجَجْنَا)) ”انسان جب صبح کرتا ہے تو اس کے سارے اعضاء زبان کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: تو ہمارے سلسلے میں اللہ سے ڈر، اس لیے کہ ہم تیرے ساتھ ہیں اگر تو سیدھی رہی تو ہم سب سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہوگئی تو ہم سب بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔“ [حسن / سنن ترمذی:۲۴۰۷، مسند احمد:۱۱۹۰۸]

راویِ حدیث کا تعارف :

سیدنا سفیان بن عبد اللہ بن ربیعہ بن حارث ثقفی طائفی رضی اللہ عنہ ثقیف کے وفد کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دولتِ اسلام سے سرفراز ہوئے۔ ان کی کنیت ابو عمرو یا ابو عمرہ ہے اور ابن ابی ربیعہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں عثمان بن ابو العاص رضی اللہ عنہ کو طائف سے معزول کر کے بحرین کا گورنر بنایا اور ان کی جگہ پر انھیں طائف کا گورنر بنا دیا۔ ان سے ان کے بیٹوں عاصم، عبد اللہ، علقمہ، عمرو اور ابو الحکم وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ان سے یہی ایک روایت مروی ہے، جب کہ ان سے مروی حدیثوں کی تعداد پانچ ہے۔ ان کی وفات طائف میں ہوئی۔

ص:۱۵۱ کا بقیہ:

راویِ حدیث کا تعارف:

سیدنا عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ بدری انصاری خزرجی رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابیِ رسول ہیں۔ ان کی کنیت ابو مسعود ہے اور یہ اپنی کنیت ابو مسعود بدری ہی سے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ غزوۂ بدر میں شریک تو نہیں تھے، لیکن ماءِ بدر کے پاس اُترے تھے، اس لیے انھیں بدری کہا جاتا ہے، جب کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی الصحیح میں ان کی مختلف روایات لا کر بالجزم اس بات کا استدلال کیا ہے کہ یہ غزوۂ بدر میں شریک تھے اور یہی راجح بھی ہے، البتہ بالاتفاق یہ بیعتِ عقبہ ثانیہ میں شریک تھے اور اس وقت ان کی عمر سات سال سے کم تھی نیز غزوۂ احد اور اس کے بعد کے غزوات میں بھی شریک تھے۔ ان کی والدہ کا نام سلمہ بنت عامر ہے۔ کوفہ میں رہائش پذیر ہوئے اور وہیں ۳۹ ہجری میں وفات پائی اور ایک قول کے مطابق ۴۰ ہجری میں مدینہ کے اندر وفات پائی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور میں ان کی وفات ہوئی۔ ان سے ایک سو دو (۱۰۲) حدیثیں مروی ہیں۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

دخولِ جنت کا راستہ

(۲۲) عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا : أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ : أَرَأَيْتَ إِذَا صَلَّيْتُ الْمَكْتُوبَاتِ، وَصُمْتُ رَمَضَانَ، وَأَحْلَلْتُ الْحَلَالَ، وَحَرَّمْتُ الْحَرَامَ، وَلَمْ أَزِدْ عَلَى ذَلِكَ شَيْئًا؛ أَأَدْخُلُ الْجَنَّةَ؟ قَالَ : ((**نَعَمْ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

ابو عبد اللہ جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت فرمایا اور عرض کیا: آپ کا کیا خیال ہے اگر میں فرض نمازوں کو ادا کروں، رمضان کے روزے رکھوں، حلال کو حلال سمجھوں، حرام کو حرام سمجھوں اور اس پر کوئی اضافی عمل نہ کروں تو کیا میں جنت میں داخل ہو سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:"ہاں" (صحیح مسلم:۱۵)

شرح و فوائد :

اس حدیث میں سوال کرنے والے صحابیِ رسول نے رسول اللہ ﷺ سے یہ عرض کیا کہ میں فرض نمازوں (فجر وظہر، عصر ومغرب اور عشاء) کی پابندی کروں، رمضان کے روزے رکھوں، حرام کو حرام سمجھ کر اس سے اجتناب کروں اور حلال کو حلال سمجھوں اور اس پر کوئی اضافی عمل نہ کروں تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟ یعنی جنت میں میرا داخلہ عذاب کے بغیر اولِ وہلہ میں ہو جائے گا؟ نبی کریم ﷺ نے اثبات میں جواب دیا کہ اگر تم یہ سب کچھ کر لو گے تو جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے فرائض میں صرف نماز اور روزے کا ذکر کیا اور زکاۃ وحج وغیرہ دیگر فرائض کا ذکر نہیں کیا اور یہ کہا : ((**وَلَمْ أَزِدْ عَلَى ذَلِكَ شَيْئًا**)) "اور میں اس پر کوئی اضافہ نہیں کروں گا۔" تو کیا دخولِ جنت کے لیے دیگر فرائض کی پابندی ضروری نہیں ہے؟ حقیقت میں انھوں نے : ((**وَلَمْ أَزِدْ عَلَى ذَلِكَ شَيْئًا**)) "اور میں اس پر کوئی اضافہ نہیں کروں گا۔" کی جو بات کہی ہے اس میں دیگر فرائض وواجبات اور شرائعِ اسلام بھی داخل ہیں، کیوں کہ فرائض کا ترک کرنا حرام ہے اور ظاہری اعمال میں نماز وروزے کی خاص اہمیت واہتمام کے پیشِ نظر ان کا ذکر بطور خاص کیا ہے نیز زکاۃ چوں کہ مال دار مسلمانوں پر فرض ہے اور ممکن ہے کہ وہ زکاۃ دینے کے اہل نہ رہے ہوں اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا اور رہی بات حج کی تو اس کی فرضیت نو یا دس سنِ ہجری میں ہوئی ہے اور یہ سوال اس کی فرضیت سے پہلے کیا گیا

تھا، کیوں کہ سوال کرنے والے صحابی بنو عمرو بن عوف کے فرد نُعمان بن قَو قَل رضی اللہ عنہ ہیں، جیسا کہ صحیح مسلم ہی کی روایت میں اس کی صراحت موجود ہے اور یہ غزوۂ بدر کے علاوہ غزوۂ احد میں شریک ہوئے تھے، لیکن اسی غزوۂ احد کے اندر یعنی سن ۳ھ میں شہید بھی ہو گئے تھے۔ نیز ان کے کہنے کا مقصود یہ نہیں ہے کہ میں بقیہ دیگر اعمال وواجبات نہیں بجالاؤں گا، بلکہ اس جملے کا مطلب یہ ہو گا کہ میں ان کے ادا کرنے میں کمی نہیں کروں گا اور ان میں اپنی جانب سے کوئی اضافہ نہیں کروں گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ علاوہ ازیں حرام کو حرام سمجھنا اور ان سے بچنا نیز حلال کو حلال سمجھنا اور واجب ومستحب اور مباح کے مطابق ان پر عمل کرنا، ایسا جامع بیان ہے کہ اس میں پورا دین آجاتا ہے، اس اعتبار سے گویا انھوں نے پورے دین پر عمل کرنے کا عہد کیا اور ظاہر سی بات ہے کہ اس میں زکاۃ اور حج دونوں شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں پر کچھ اعمال فرض قرار دیے ہیں، جن پر عمل کرنا ضروری ہے، ساتھ ہی کچھ چیزوں کو حرام اور کچھ کو حلال قرار دیے ہیں۔ حرام امور کو چھوڑنا ضروری ہے اور حلال کو حلال سمجھنا ضروری ہے، تاہم ان کا استعمال اختیاری ہے۔ عبادات سے متعلق حلال امور میں سے واجب امور کو اپنانا ضروری ہے اور جو واجب نہیں ہیں بلکہ سنن ونوافل کے درجے میں ہیں ان کی پابندی ضروری تو نہیں ہے، مگر یہ درجات کی بلندی کا باعث بنتے ہیں۔ کتاب وسنت کے اندر جن کاموں سے روکا گیا ہے وہ حرام ہیں اور جن کاموں کے کرنے کا حکم یا اجازت وترغیب دی گئی ہے وہ حلال ہیں۔ اس اعتبار سے شریعت کے سارے احکام ان کے اندر آجاتے ہیں اور کتاب وسنت کے بجائے من مانی طور پر شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال قرار دینا اور ان کے حلال ہونے کا عقیدہ رکھنا اور شرعی اعتبار سے حلال امور کو حرام قرار دینا اور ان کے حرام ہونے کا عقیدہ رکھنا کفر کا باعث ہے، کیوں کہ حلال وحرام قرار دینے کا اختیار صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ ہمارے یہاں شخصیت وپیر پرستی کی وبا اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ کسی بھی شخصیت کے گرد عقیدت کا جالا بُن کر اسے الٰہی درجہ اور حلال وحرام کا اختیار دے دیتے ہیں اور کسی بھی مسئلہ کے بارے میں کتاب وسنت کا واضح حکم موجود ہونے کے باوجود اپنے پیر ومرشد کے اقوال کو قرآن وحدیث پر ترجیح دیتے ہیں، جب کہ یہ عمل انھیں اپنا رب بنانے کی طرح ہے۔ سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میری گردن میں سونے کی صلیب تھی، آپ نے فرمایا: ”عدی!

اس بت کو نکال کر پھینک دو۔" میں نے آپ کو سورۂ براءۃ کی آیت: ﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ...﴾ ["ان لوگوں نے اپنے علما اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنالیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالاں کہ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ صرف ایک الٰہ کی عبادت کریں، جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ پاک ہے، ان چیزوں سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔" (التوبۃ:۳۱)] پڑھتے ہوئے سنا۔ [میں نے کہا ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے تھے۔] آپ نے فرمایا: "وہ لوگ ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ اَحبار و رہبان ان کے لیے کسی چیز کو حلال قرار دے دیتے تو وہ لوگ اسے حلال بنالیتے تھے اور جب وہ لوگ ان کے لیے کسی چیز کو حرام ٹھہرا دیتے تو وہ لوگ اسے حرام مان لیتے تھے۔ [اور یہی تو ان کی عبادت کرنا تھا۔]" [**اخرجہ البخاري في التاریخ، والترمذي في جامعہ : ۳۰۹۵، والزیادتان للبخاري وغیرہ، والسیاق للترمذي، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۳۲۹۳**]

جو لوگ مذکورہ امور کی پابندی کریں گے یعنی فرائض کو ادا کریں گے، حرام کیے گئے امور کو حرام سمجھ کر ان سے بچیں گے اور حلال کیے گئے امور کو حلال سمجھ کر اپنائیں گے تو اللہ انھیں اپنے فضل و رحمت سے جنت میں داخل فرمائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فلاح و کامیابی کے لیے اعمال و فرائض کی ادائیگی ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اعمال ایمان کا حصہ ہیں، عمل کے بغیر ایمان کا وجود نہیں ہے اور ایمان کے بغیر عمل نفع بخش نہیں ہے۔ کامیابی کا انحصار اگرچہ فرائض کی ادائیگی میں ہے تاہم سنن و نوافل اور رواتب پر بھی مداومت برتنی چاہیے اور ان کا خوب اہتمام کرنا چاہیے، کیوں کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے پابندی سے انھیں ادا فرمایا ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ جب فرائض کی ادائیگی میں کمی ہو گی تو سنن و نوافل وغیرہ کام آئیں گے، کیوں کہ یہ فرائض کی تکمیل کے لیے ہیں اور روزِ قیامت حساب کتاب کے موقع پر اُنھیں نوافل ہی کے ذریعہ فرضوں کی کمی پوری کی جائے گی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے دوسرے فرامین میں اس کی صراحت موجود ہے۔ [دیکھیے: سنن أبو داود: ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، سنن ترمذی: ۴۱۳، سنن نسائی: ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، سنن ابن ماجہ: ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، مسند احمد: ۷۹۰۲، ۷۹۹۴، ۱۶۹۴۹، ۱۶۹۵۴] تاہم اگر کوئی شخص بطور تحقیر و استخفاف سنن کو ترک کرے تو وہ کافر ہو گا۔

اس حدیث سے دیگر فرائض کے علاوہ نماز اور روزے کی خصوصی اہمیت و فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ یہ دونوں اعمال دخولِ جنت کا سبب ہیں۔ قرآن اور احادیث میں ان کی فرضیت کے ساتھ ساتھ ان کی اہمیت و فضیلت پر بھی بڑا زور دیا گیا ہے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ان کی بڑی پابندی کرتے تھے، لہٰذا ان

کو ادا کرنے میں سستی و کاہلی نہیں کرنی چاہیے اور ان کا خصوصی دھیان رکھنا چاہیے۔

صحابیِ رسول کے کردار سے معلوم ہوا کہ جس چیز کے بارے میں علم نہ ہو اہلِ علم سے اس کے بارے میں سوال کرنا چاہیے اور ہر وقت احکام و مسائلِ شریعت پر عمل کرنے کا عزم و ارادہ اور حوصلہ رکھنا چاہیے نہ کہ محض بال کی کھال نکالنے اور ذہنی لذت کے لیے سوال ہو۔

زیرِ مطالعہ حدیث کے مفہوم کی اور بھی بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں، بلکہ اس سے ملتی جلتی اس معنیٰ و مفہوم کی احادیث حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اور زیادہ تر احادیث میں نبی کریم ﷺ نے صرف واجبات کے ادا کرنے والوں کو جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی ہے اور ان میں محرمات سے اجتناب کا ذکر نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سوال کرنے والوں نے ان اعمال کے بارے میں سوال کیا ہے کہ جن پر عمل کرنے والے جنت میں داخل ہو جائیں، لہٰذا اسی کے مطابق نبی کریم ﷺ نے سائلین کو جواب دیا ہے اور پھر یہ ابتدائے اسلام کا معاملہ تھا، اس لیے نبی کریم ﷺ نے صرف انھیں اعمال پر اکتفا کیا، لیکن نبوی تربیت و تزکیہ نے انھیں فرائض کے ساتھ ساتھ سنن و نوافل کا ایسا عادی بنا دیا تھا کہ ان کا ترک کرنا ان کے لیے مشقت کا باعث تھا اور حُرماتِ الٰہی کی پامالی تو ان کے وہم و خیال میں بھی نہیں ہوتی تھی، وہ تو ہمیشہ خیر کے متلاشی اور منکرات و سیئات سے متنفر رہتے تھے۔

راویِ حدیث کا تعارف :

سیدنا جابر بن عبد اللہ بن عمرو بن حرام بن کعب بن غنم بن کعب بن سلمہ انصاری خزرجی سلمی رضی اللہ عنہ بہ کثرت حدیثیں روایت کرنے والے فقہائے صحابہ میں سے ایک ہیں۔ ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے اور ان کی والدہ کا نام نسیبہ بنت عقبہ بن عدی ہے۔ غزوۂ بدر و احد کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے، جب کہ امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک غزوہ بدر میں بھی شریک تھے۔ ان کی نو یا سات بہنیں تھیں، جن کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے ان کے والد محترم نے غزوۂ احد کے موقع پر انھیں گھر ہی پر رہنے دیا تھا اور خود شہادت کے جذبے سے غزوے میں شریک ہوئے اور شہادت سے سرفراز بھی ہوئے۔ نبی ﷺ نے ایک رات ان کے حق میں ۲۵ مرتبہ مغفرت کی دعا فرمائی۔ آخری عمر میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔ ۹۴ سال کی عمر پا کر ۷۳ یا ۷۴ ہجری میں فوت ہوئے اور اس وقت کے حاکمِ مدینہ ابان بن عثمان رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ بیعتِ عقبہ میں شریک ہونے والے ستر صحابہ میں سب سے چھوٹے تھے اور شرکائے بیعتِ عقبہ میں سے مدینہ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے صحابی ہیں، بعض لوگوں کے نزدیک ان کا سن وفات ۷۷ یا ۷۸ ہجری ہے۔ ان سے (۱۵۴۰) حدیثیں مروی ہیں۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

چند اعمالِ صالحہ کی ترغیب اور ان کے فضائل

(٢٣) عَنْ أَبِي مَالِكٍ الْحَارِثِ بْنِ عَاصِمٍ الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : **((الطُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ تَمْلَأُ الْمِيزَانَ، وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ تَمْلَآنِ -أَوْ: تَمْلَأُ- مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، وَالصَّلَاةُ نُورٌ، وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ، وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ، وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ، كُلُّ النَّاسِ يَغْدُو، فَبَائِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا أَوْ مُوْبِقُهَا))** رَوَاهُ مُسْلِمٌ

ابومالک حارث بن عاصم اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”طہارت نصف ایمان ہے، الحمد للہ میزان کو بھر دے گا نیز سبحان اللہ اور الحمد للہ دونوں زمین و آسمان کے مابین کو بھر دیں گے، نماز نور ہے، صدقہ برہان ہے، صبر ضیاء ہے اور قرآن تیرے حق میں یا تیرے خلاف حجت ہو گا۔ ہر آدمی صبح کے وقت اپنے نفس کا سودا کرتا ہے، پس وہ اسے آزاد کرا لیتا ہے یا ہلاک کر دیتا ہے۔“ (صحیح مسلم : ٢٢٣)

شرح و فوائد :

اَلطُّهُورُ : طہارت وپاکیزگی، خود پاک اور دوسرے کو پاک کرنے والا، پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ خواہ پانی ہو یا کوئی دیگر شے، گندگی اور نجاست سے پاک پانی، ہر طرح کی نجاست سے پاکی حاصل کرنا۔ **اَلطُّهُورُ** کی طاء پر ضمہ ہو تو یہ **طَهُرَ** (ن،ک) سے مصدر یا اسم مصدر ہوتا ہے اور اس سے مراد **تَطَهُّر** یعنی فعلِ طہارت ہوتا ہے، خواہ وہ وضو ہو یا غسلِ جنابت ہو اور **طَهُور**، طاء کے فتحہ کے ساتھ فعول کے وزن پر صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے، جس سے مراد پاک اور پاک کرنے والا کے ہوتا ہے یعنی وہ چیز جو خود پاک ہو اور جس سے پاکی حاصل کی جائے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿...**وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا**﴾ ”اور ہم نے ہی آسمان سے پاک پانی اتارا ہے۔“ [الفرقان:٤٨] یعنی ایسا پانی جو پاک ہے اور پاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ **اَلْمِيزَان :** ترازو۔ انسان کے اعمال کو وزن کرنے والی ترازو۔

یہ عظیم الشان حدیثِ نبوی دینِ اسلام کے عظیم اقدار و آداب، بلند پایہ تعلیمات اور اہم ترین قواعد و امور پر مشتمل انتہائی جامع حدیث ہے۔

اسلام عفت و عصمت اور طہارت و پاکیزگی کا مذہب ہے۔ وہ جہاں اپنے ماننے والوں کو شرک و نفاق اور معاصی و فواحش سے پاک رہنے کی تعلیم دیتا ہے اور اعضاء و جوارح کو گناہوں سے آلودہ کرنے سے روکتا ہے، وہیں جسم ولباس، رہنے سہنے کے مقامات، راستوں اور عبادت کی جگہوں کو پاک رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ اسلامی شریعت میں ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی نجاستوں سے پاکی وصفائی حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے اور اس کی فضیلت و فوائد کو بیان کرکے ہر طرح سے طہارت و پاکیزگی اور صفائی و ستھرائی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افرادِ معاشرہ کی روحانی وجسمانی تطہیر ہی کی خاطر عفت و عصمت، شرم و حیا اور طہارت و پاکیزگی کو آلودہ کرنے والے تمام راستوں کو اسلام نے مسدود کر دیا ہے نیز طہارت کی اہمیت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ طہارت رکھنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ زیرِ مطالعہ حدیث میں بھی طہارت کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے۔ محدثین علمائے کرام نے اس کے کئی معانی ومفاہیم بیان کیے ہیں، جن کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے:

◈ یہاں ایمان سے مراد نماز ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿...**وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ إِيْمَانَكُمْ ۚ**...﴾ ”اور اللہ ہرگز تمھارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا۔“ [البقرۃ: ۱۴۳] میں ”ایمان“ سے مراد ”صلاۃ“ ہے۔ [دیکھیے: صحیح بخاری: ۴۰] اور صلاۃ کے لیے طہارت شرط ہے یعنی نماز بغیر طہارت کے درست نہیں ہوگی اور ظاہری نجاست سے پاکی حاصل کرنے میں وضو و غسل کے علاوہ جسم ولباس اور عبادت کی جگہ کو پاک رکھنا بھی شامل ہے۔ طہارت نماز کا نصف حصہ ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ نماز خارجی شرائط اور داخلی ارکان کے پائے جانے کے بعد درست ہوتی ہے اور طہارت نماز کی انتہائی اہم اور قوی ترین شرائط میں سے ہے، گویا کہ اس کے سوا کوئی اور شرط نہیں ہے، اس طرح نماز کے بقیہ ارکان وشرائط کے بالمقابل طہارت کو بطور مبالغہ نماز کا نصف حصہ مانا گیا ہے۔

◈ طہارت کو ایمان کا نصف حصہ قرار دے کر طہارت کی ترغیب دلانا اور اس کے عظیم اجر و ثواب کو بتلانا مقصود ہے۔

◈ طہارت سے مراد وضو ہے، جیسا کہ ترمذی [رقم الحدیث: ۳۵۱۷] وغیرہ کی بعض روایتوں میں **الطہور** کے بجائے **الوضوء** کا لفظ وارد ہوا ہے، چناں چہ ایمان صغیرہ اور کبیرہ دونوں طرح کے گناہوں کو مٹا دیتا

ہے اور وضو صرف صغیرہ گناہوں کو مٹاتا ہے، گویا کہ وضو نصف ایمان کے درجے میں ہے۔ اسی طرح نماز جنت کی کنجی ہے اور وضو نماز کی کنجی ہے۔

یہاں حدیث میں وارد لفظ "اَلْمِيزَانَ" سے اعمال کو وزن کرنے والی ترازو کے نیکیوں کا پلڑا امراد ہے۔ کتاب و سنت کے نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ روزِ قیامت انسانوں کے اعمال تولے جائیں گے، اگرچہ اس کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ہے، مگر اس پر ایمان لانا اور اسے تسلیم کرنا ضروری ہے، چناں چہ روزِ قیامت جس کے نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ ہمیشگی والی جنت میں ہوگا اور جس کا یہ پلڑا ہلکا ہوگا وہ جہنم میں داخل کیا جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۞ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ﴾ "اور اس دن وزن برحق ہے پھر جس شخص کے پلڑے بھاری ہوگئے تو وہی کامیاب ہوں گے اور جس شخص کے پلڑے ہلکے ہوگئے تو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، اس لیے کہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے۔" [الأعراف:۸-۹]

زیرِ مطالعہ حدیث ذکرِ الٰہی کی اہمیت و فضیلت پر دلالت کرتی ہے، جیسا کہ اس میں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ بشارت دی ہے کہ الْحَمْدُ لِلَّهِ اتنی عظمت کا حامل ذکر ہے کہ یہ نیکیوں کے پلڑے کو بھر دے گا نیز الْحَمْدُ لِلَّهِ اور سُبْحَانَ اللَّهِ اتنا عظیم الشان ذکر ہے کہ یہ دونوں کلمات آسمان سے زمین تک کی وسعتوں کو محیط ہیں یعنی زمین و آسمان کے درمیانی خلا کو نیکیوں سے بھر دیں گے، لہٰذا پورے ادراک و شعور کے ساتھ بہ کثرت ان کلمات کا ورد کرتے رہنا چاہیے۔ یقیناً اللہ کا ذکر اور اس کی یاد بہت بڑی چیز ہے اس سے دلوں کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے اور اللہ بھی ایسے بندے کو یاد رکھتا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى : أَنَا عِنْدِ ظَنِّ عَبْدِي بِي وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي، فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي، وَإِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ)) "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں اور میں اس کے ساتھ رہتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے، اگر وہ مجھے

اپنے نفس میں یاد کرے تو میں اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی جماعت میں یاد کرے تو میں اسے اس سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں۔" [صحیح بخاری:۷۴۰۵، صحیح مسلم:۲۶۷۵]

حقیقت یہ ہے کہ الْحَمْدُ لِلَّهِ اللہ تعالیٰ کے تمام ایجابی و اثباتی صفاتِ کمال کا جامع ہے اور اس میں اللہ کے لیے شکر کا اظہار بھی ہے یعنی اس میں یہ اقرار بھی شامل ہے کہ ہر قسم کی ظاہری و باطنی نعمت اللہ ہی سے ملی ہوئی ہے اور یہ سب سراسر اللہ کا فضل و احسان ہے ورنہ ذاتی طور پر مخلوق کسی نعمت کا حق نہیں رکھتی ہے۔ نیز سُبْحَانَ اللَّهِ تمام سلبی صفات کا جامع ہے یعنی اس کے ذریعہ بندہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے نقص و عیب، مشابہتِ مخلوق سے پاک و منزہ ہے اور ان تمام اوصاف و افعال سے بھی پاک ہے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ گویا یہ دونوں کلمے اللہ تعالیٰ کی توحید و کبریائی اور تقدس پر دلالت کرتی ہیں اور ان سے اللہ کے اوصافِ کمال کا اثبات اور ہر قسم کے عیب و نقص اور مشابہتِ مخلوق کی نفی ہوتی ہے اور ذکر کے ان دونوں کلمات کے اجتماع سے اللہ تعالیٰ کی ہمہ پہلو صفات کا اقرار و اعتراف ہو جاتا ہے۔

نماز نور ہے : جس طرح روشنی سے راستہ معلوم ہوتا ہے اور تکلیف دہ چیزوں سے آدمی بچ سکتا ہے، ویسے ہی نماز کی وجہ سے آدمی نافرمانی و معصیتِ الٰہی سے بچ سکتا ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے اندر ایسی روحانی تاثیر رکھی ہے کہ اگر اسے نبوی طریقے کے مطابق اُن آداب و شرائط کے ساتھ ادا کیا جائے جو اس کی صحت و قبولیت کے لیے ضروری ہے تو ایسی نماز انسان کو ہر قسم کی برائیوں اور ناشائستہ حرکات و افعال سے روکتی ہے اور کارِ ثواب کی طرف لے جاتی ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے : ﴿...إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ...﴾ "یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔" [العنکبوت:۴۵]

علاوہ ازیں نماز سے قبر اور میدانِ حشر میں پُل صراط پر روشنی حاصل ہوگی نیز نماز اس لیے بھی نور ہے کہ اس سے نمازیوں کو دنیا میں رونق و روشنی حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں بھی روشنی حاصل ہوگی۔

سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

((مَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا كَانَتْ لَهُ نُورًا وَبُرْهَانًا وَنَجَاةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ لَمْ يُحَافِظْ عَلَيْهَا لَمْ

يَكُنْ لَهُ نُورٌ وَلَا بُرْهَانٌ وَلَا نَجَاةٌ، وَكَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ قَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَأُبَيِّ بْنِ خَلَفٍ)) ”جس نے نماز کی حفاظت کی اسے قیامت کے دن نور، برہان اور نجات حاصل ہو گی اور جس نے اس کی حفاظت نہیں کی اسے نور، برہان اور نجات نہیں حاصل ہو گی اور قیامت کے دن وہ قارون، فرعون، ہامان اور اُبی بن خلف کے ساتھ ہو گا۔“ [اس کی سند حسن ہے / مسند احمد : ۶۵۷۶، سنن دارمی : ۲۷۶۳]

صدقہ دلیل ہے : اس سے وجوبی صدقہ یعنی زکاۃ اور نفلی صدقہ وغیرہ دونوں مراد ہیں اور دلیل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ ایمان کی دلیل ہے، اس لیے کہ اللہ کے لیے غریبوں، مسکینوں اور ضرورت مندوں کو وہی صدقہ دیتے ہیں، جو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور جب قیامت کے دن مال وغیرہ سے متعلق سوال کیا جائے گا اور انسان نفسی نفسی کے عالم میں ہو گا تو یہ صدقہ، صدقہ کرنے والے کے حق میں نجات کے لیے دلیل ہو گا، اس لیے وجوبی صدقہ کے علاوہ نفلی صدقہ بھی کرتے رہنا چاہیے۔ نیز نماز کو بھی برہان قرار دیا گیا ہے۔ [صحیح / سنن ترمذی: ۶۱۴] یعنی نماز صحتِ اسلام کی دلیل ہے اور کفر و اسلام کے درمیان فرق کرنے والی ہے اور حقوق اللہ میں سب سے پہلے نماز کا محاسبہ ہو گا، وہ پوری ہو گی تبھی آدمی کو نجات و کامیابی حاصل ہو گی۔

صبر ضیاء ہے : یعنی یہ ایسی روشنی ہے، جو انسانوں کو گناہوں سے باز رکھتا ہے اور اللہ کی اطاعت پر ابھارتا ہے، جس کی وجہ سے صبر کرنے والا عبادت و اطاعت کو بجالاتا ہے اور اس راہ میں اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس پر چنداں پریشان نہیں ہوتا ہے اور گناہوں کی لذتوں سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے، دنیوی مصیبتوں پر جزع و فزع کرنے کے بجائے صبر و شکر سے کام لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قضاو قدر پر کامل یقین رکھتے ہوئے مکمل طور پر روشنی میں رہتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ نے کئی مقامات پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ بشارت دی ہے کہ وہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے، انھیں بے حساب اجر و ثواب سے نوازے گا اور جنت میں داخل فرمائے گا۔ [صبر سے متعلق مزید تفصیل کے لیے حدیث نمبر:۱۹ کے تحت پیش کی گئی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔]

نزولِ قرآن کا مقصد اس کے احکام و فرامین پر عمل کرنا ہے۔ اگر انسان خلوصِ نیت سے قرآن کریم کی تلاوت کے ساتھ احکامِ قرآن کے مطابق عمل کرے گا تو یہ دنیا و آخرت دونوں کے لیے نفع بخش ہے، اس

کی وجہ سے قرآن قیامت کے دن اپنے پڑھنے والے کے حق میں اللہ سے سفارش کرے گا اور عمل نہ کرنے کی صورت میں یہ انسان کے خلاف گواہی دے گا۔ اسی طرح صحیح حدیث میں ہے کہ ریاکار قاریِ قرآن کو منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ ویسے تو قرآن کریم پوری دنیائے انسانیت کے لیے ہدایت ہے، مگر متقین ہی اس سے فیض یاب ہوتے ہیں اور قرآن اِنھی کو منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔

صبح اٹھتے ہی آدمی اپنے نفس کا سودا کرتا ہے یعنی آدمی اپنے کاموں میں لگ جاتا ہے اور اپنے اچھے کاموں کی بدولت اپنے آپ کو عذابِ الٰہی سے آزاد کرا لیتا ہے اور کوئی اپنے بُرے کرتوتوں کی وجہ سے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہر شخص کو نیکی و بدی والا کام کرنے کا اختیار حاصل ہے، وہ چاہے تو اللہ کی اطاعت کر کے جنت کا حق دار بن جائے اور جہنم سے آزادی حاصل کر لے اور چاہے تو شیطان کی پیروی کر کے خود کو دنیا و آخرت کی ہلاکت میں ڈال لے یعنی اس کے عمل ہی کے مطابق جزا یا سزا دیا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان مجبور نہیں ہے بلکہ اللہ نے اسے اچھا یا برا عمل کرنے کا اختیار دیا ہے، چاہے تو وہ شکر گزار بندہ بنے اور چاہے تو نافرمان بندہ بنے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان کے کئی درجات اور متعدد شاخیں ہیں اور پھر ان درجات کے اعتبار سے اعمالِ صالحہ کی بجا آوری کی صورت میں ایمان میں اضافہ بھی ہو گا اور عدمِ عمل کی صورت میں ایمان میں کمی بھی ہو گی۔

راویِ حدیث کا تعارف:

صحابیِ رسول ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ اپنی اسی کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ ان کے نام کے بارے میں کئی اقوال ہیں: ان کا نام حارث بن حارث، حارث بن مالک، عبید، عبید اللہ، عبید بن عمرو، عامر بن حارث بن ہانی بن کلثوم، کعب بن عاصم، کعب بن کعب اور عمرو وغیرہ بتایا گیا ہے۔ ان کی وفات سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ۱۸ ہجری میں طاعون کی وجہ سے ہوئی اور ان سے ستائیس (۲۷) حدیثیں مروی ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے یہاں اس حدیث کے راوی ابو مالک اشعری کا نام "حارث بن عاصم" ہونے کو ترجیح دی ہے جب کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے بقول ان کا نام معلوم نہیں ہے۔ یہ مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کے رواۃ میں سے ہیں اور بخاری میں ان سے معلق روایت ہے۔ اس نام کے دو اور صحابی ہیں: ایک حارث بن حارث اشعری اور دوسرے کعب بن عاصم اشعری۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

ظلم کی حرمت اور توحید کی حقیقت

(٢٤) عَنْ أَبِي ذَرٍّ الْغِفَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا يَرْوِيْهِ عَنْ رَبِّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى، أَنَّهُ قَالَ : ((**يَا عِبَادِي! إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي، وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا؛ فَلَا تَظَالَمُوا. يَا عِبَادِي! كُلُّكُمْ ضَالٌّ إِلَّا مَنْ هَدَيْتُهُ، فَاسْتَهْدُوْنِي أَهْدِكُمْ. يَا عِبَادِي! كُلُّكُمْ جَائِعٌ إِلَّا مَنْ أَطْعَمْتُهُ، فَاسْتَطْعِمُوْنِي أُطْعِمْكُمْ. يَا عِبَادِي! كُلُّكُمْ عَارٍ إِلَّا مَنْ كَسَوْتُهُ، فَاسْتَكْسُونِي أَكْسُكُمْ. يَا عِبَادِي! إِنَّكُمْ تُخْطِئُونَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَأَنَا أَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا؛ فَاسْتَغْفِرُونِي أَغْفِرْ لَكُمْ. يَا عِبَادِي! إِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوا ضُرِّي فَتَضُرُّونِي، وَلَنْ تَبْلُغُوا نَفْعِي فَتَنْفَعُونِي. يَا عِبَادِي! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوا عَلَى أَتْقَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ، مَا زَادَ ذَلِكَ فِي مُلْكِي شَيْئًا. يَا عِبَادِي! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوا عَلَى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ، مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِنْ مُلْكِي شَيْئًا. يَا عِبَادِي!**

ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب تبارک و تعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: ”اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنی ذات پر حرام کر لیا ہے اور تمھارے درمیان بھی اسے حرام کر دیا ہے، اس لیے تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو سوائے اس کے جسے میں ہدایت دے دوں، اس لیے تم مجھ سے ہدایت مانگو میں تمھیں ہدایت دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو سوائے اس کے جسے میں کھلاؤں، اس لیے تم مجھ سے کھانا مانگو میں تمھیں کھانا دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو سوائے اس کے جسے میں پہناؤں، اس لیے تم مجھ سے لباس مانگو میں تمھیں لباس دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب دن و رات گناہ کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو بخش دیتا ہوں، اس لیے تم مجھ سے بخشش طلب کرو میں تمھیں بخش دوں گا۔ اے میرے بندو! تمھاری رسائی مجھے نقصان پہنچانے تک نہیں ہو سکتی کہ تم مجھے نقصان پہنچا سکو اور تمھاری پہنچ مجھے نفع پہنچانے تک نہیں ہو سکتی کہ تم مجھے نفع پہنچاؤ۔ اے میرے بندو! اگر تمھارے اولین و آخرین اور تمھارے تمام انسان و جنات تم میں سے سب سے زیادہ متقی شخص کے دل کی طرح ہو جائیں تو یہ میری سلطنت میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہو گا۔ اے میرے بندو! اگر تمھارے اولین و آخرین اور تمھارے تمام انسان و جنات تم میں سے سب سے زیادہ فاجر شخص کے دل کی طرح ہو جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کوئی

لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ قَامُوا فِي صَعِيْدٍ وَاحِدٍ، فَسَأَلُونِي، فَأَعْطَيْتُ كُلَّ وَاحِدٍ مَسْأَلَتَهُ، مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ. يَا عِبَادِي! إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُحْصِيْهَا لَكُمْ، ثُمَّ أُوَفِّيْكُمْ إِيَّاهَا؛ فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللَّهَ، وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذَلِكَ فَلَا يَلُومَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

کمی نہیں ہوگی۔ اے میرے بندو! اگر تمھارے اگلے اور پچھلے اور تمھارے انسان و جنات کسی ایک میدان میں کھڑے ہو جائیں اور مجھ سے مانگیں اور میں ان سبھوں کی مانگی ہوئی چیز دے دوں تو اس سے میرے پاس موجود خزانے میں کوئی کمی نہیں ہوگی، مگر ویسے ہی جیسے سوئی سمندر میں ڈبوئے جانے کے بعد کمی کرتی ہے۔ اے میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہیں، جنھیں میں نے تمھارے لیے شمار کر لیا ہے، پھر میں تمھیں ان کا پورا بدلہ دوں گا، پس جو کوئی بھلائی پائے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور جو اس کے علاوہ کچھ پائے تو وہ صرف اپنے ہی نفس کو ملامت کرے۔" (صحیح مسلم:۲۵۷۷)

شرح و فوائد :

كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ : "جیسے سوئی کمی کرتی ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے خزانے میں کوئی نقص و کمی نہیں ہوتی ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ جتنا سوئی کمی کرتی ہے اتنی کمی ہوتی ہے۔

یہ حدیثِ قدسی ہے، اسے حدیثِ ربانی اور حدیثِ الٰہی بھی کہا جاتا ہے۔ حدیثِ قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں، جسے نبی ﷺ اپنے رب تبارک و تعالیٰ سے روایت کریں یعنی جس کا معنیٰ و مفہوم اللہ کی طرف سے ہو اور آپ ﷺ اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

حدیثِ قدسی کا مرتبہ قرآن اور حدیثِ نبوی کے درمیان میں ہوتا ہے، بس قرآن کریم لفظاً و معناً اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور حدیث لفظاً و معناً نبی ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی ہے جب کہ حدیثِ قدسی کا معنیٰ و مفہوم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور الفاظ اللہ کی طرف منسوب نہیں ہوتے ہیں، قرآن کریم جبریل علیہ السلام کے توسط سے نبی ﷺ پر نازل ہوا جب کہ حدیثِ قدسی نبی کے خواب یا الہام کے ذریعے ہم تک پہنچیں اور اس کے لیے تواتر سے منقول ہونا بھی شرط نہیں ہے اور نہ اس میں تحدی و چیلنج ہی پایا جاتا ہے نیز احادیثِ قدسیہ صحیح، حسن، ضعیف حتیٰ کہ موضوع بھی ہوتی ہیں جب کہ قرآن کریم کا ایک ایک حرف و حرکت صحیح ہے اور تواتر سے ثابت ہے۔ اسی لیے قرآن کی طرح

بطور عبادت حدیثِ قدسی کی تلاوت نہیں کی جاتی اور نہ یہ نماز ہی میں پڑھی جاتی ہے۔

زیرِ مطالعہ حدیثِ قدسی دین کے اہم اصول و فروع اور اس کے آداب کے سلسلے میں بہت سے عظیم فوائد پر مشتمل ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بے پناہ عظمت و قدرت کا بیان ہوا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، وہی ہدایت دیتا ہے، رزق کی کنجی اسی کے پاس ہے، کسی کو عطا کرنے سے اس کے خزانے میں معمولی کمی بھی نہیں ہوتی ہے، ساری مخلوق یکجا ہو کر اللہ سے مانگے اور وہ سب کی مراد کو پوری کر دے پھر بھی اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں واقع ہو گی۔ کسی کی مخالفت یا حمایت سے اس کی سلطنت و بادشاہت میں رتی برابر فرق نہیں آسکتا، پوری کائنات کے تمام لوگ متقی و پرہیز گار ہو جائیں تب بھی اس کی عظمت و سلطنت میں اضافے کا باعث نہیں ہوں گے اور اگر سبھی لوگ سیاہ کار ہو جائیں تب بھی اس کی بادشاہت پر اثر انداز نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ ساری مخلوق اللہ کے سامنے کمزور اور ہر طرح سے اس کے محتاج ہیں، وہی سب کی ضرورتوں کو پوری کرتا ہے، بندے شب و روز گناہ کرتے ہیں، مگر اللہ اپنی رحمت سے ان کی ستر پوشی کرتا ہے اور جب اپنے کیے پر نادم ہو کر اللہ سے مغفرت طلب کرتے ہیں تو اللہ ان کی مغفرت بھی فرما دیتا ہے۔ بندوں کے تمام اچھے و برے اعمال ریکارڈ کیے جاتے ہیں اور پھر قیامت کے دن اللہ انھیں ان کا پورا پورا بدلہ دے گا، لہٰذا کوئی بھی عمل کرنے سے پہلے یہ ضرور ذہن میں رکھیں کہ ہمیں اپنے تمام اعمال کا حساب دینا ہے۔ اللہ کی توفیق سے جنھیں اچھے اعمال کی توفیق مل جائے تو وہ اس پر اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتے ہوئے اس کا شکر ادا کریں اور اگر بُرے اعمال سرزد ہوں تو خود اپنے نفس کو ملامت کریں اور تقدیر کا سہارا لے کر اپنے آپ کو بُرائیوں کار سیانہ بنائیں، کیوں کہ بُرے اعمال انسان کے نفس امارہ ہی کے باعث سرزد ہوتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا:

﴿مَّآ أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ ٱللَّهِ ۖ وَمَآ أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ ۚ...﴾ "جو کوئی بھلائی تجھے پہنچے سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو کوئی برائی تجھے پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے۔" [النساء:۷۹]

یہ حدیث اس بات کی بڑی واضح دلیل ہے کہ تقویٰ اور گناہوں کا اصل محل انسان کا دل ہے اور وہیں سے نیکی یا بدی کے اعمال انجام پاتے ہیں، اسی لیے حدیث میں ((كَانُوا عَلَى أَتْقَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ)) اور ((كَانُوا عَلَى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ)) کے ذریعہ تقویٰ اور فجور کو دل کی طرف منسوب کیا گیا

ہے، چناں چہ جب انسان کا دل نیک اور متقی ہو گا تو سارے اعضاء پر اس نیکی اور تقویٰ کا اثر ہو گا اور جب انسان کا دل فاسق و فاجر ہو گا تو سارے اعضاء میں فسق وفجور کا رنگ نمایاں طور پر نظر آئے گا۔

متنِ حدیث میں آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ یہ حدیث چھوٹے چھوٹے دس جملوں پر مشتمل ہے اور ہر جملے کی ابتدا ''يَا عِبَادِي!'' یعنی اے میرے بندو! جیسے پیار بھرے خطاب سے ہوئی ہے۔ خطاب کا یہ اسلوب و تکرار بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت و شفقت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ کس قدر اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے بہت سے مقامات پر ''عبادي'' کہہ کر بندوں کے ساتھ اپنی رحمت و محبت کا اظہار فرمایا ہے نیز کتاب و سنت کے متعدد نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ بندوں کے ساتھ حد درجہ مہربان اور شفیق ہے اور وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے، اس لیے بندوں کو بھی چاہیے کہ پورے انہماک و توجہ کے ساتھ عبودیت کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتے رہیں۔

زیرِ مطالعہ ربانی حدیث سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے از راہِ فضل واحسان اور اپنے کمالِ عدل کی وجہ سے ظلم پر قادر ہونے کے باوجود اپنے آپ پر ظلم کو حرام قرار دے لیا ہے اور اپنی مخلوق کے مابین بھی ظلم کو حرام ٹھہرایا ہے، لہٰذا جب اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے تو مخلوق کو بھی چاہیے کہ وہ خود اپنی ذات پر یا باہم ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ حدیث کے اسلوبِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق کے لیے ظلم کرنا کسی بھی صورت میں روا نہیں ہے، لہٰذا ظلم سے بچنا چاہیے، کیوں کہ یہ روزِ قیامت تاریکیوں کا سبب بنے گا، بالخصوص اپنی ذات پر ظلمِ عظیم کرنے والوں یعنی شرک کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے خسارہ ہی خسارہ ہو گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿...وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا﴾ ''اور یقیناً ناکام ہوا وہ شخص جس نے بڑے ظلم کا بوجھ اٹھایا۔'' [طٰہٰ: ۱۱۱]

علمائے لغت اور بیش تر اہلِ علم کے نزدیک ''وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهِ'' کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام سے ہٹا دینے کا نام ظلم ہے، خواہ کمی وزیادتی کر کے اس کے مخصوص مقام سے ہٹایا جائے یا پھر اسے اس کے متعین وقت یا پھر اصلی جگہ سے ہٹا دیا جائے اور شرعی اصطلاح میں حق سے پھر کر باطل کی طرف تجاوز کرنے کا نام ظلم ہے۔ علماء نے ظلم کی مندرجہ ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں:

اوّل: وہ ظلم جو انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی صورت کفر و شرک اور

نفاق ہے۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ ”بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔“ [لقمان: ۱۳] اس سے بڑھ کر ظلم و ناانصافی اور کیا ہو سکتی ہے کہ انتہائی بے بس اور عاجز مخلوق کو خالق و مالک اور مختارِ کل رب تبارک و تعالیٰ کے اختیارات کا مالک بنا دیا جائے اور یہ خود اپنی جان پر بھی بہت بڑا ظلم ہے کہ انسان اپنے آپ کو توحید کی بلندی سے شرک کی پستی میں گرا دے اور ہمیشہ کی نعمتوں والی جنت کے بجائے ابد الآباد جہنم کے عذاب کا سزاوار ٹھہرے۔

دوم: وہ ظلم ہے جو انسان ایک دوسرے پر کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ظالمین سے اسی قسم کے لوگ مراد ہیں: ﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۖ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۞ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِم مِّن سَبِيلٍ ۞ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ ”اور کسی برائی کا بدلہ اس کی مثل ایک برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ بے شک وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ اور بے شک جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لے لے تو یہ وہ لوگ ہیں جن پر کوئی راستہ نہیں۔ راستہ تو انھی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں حق کے بغیر سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ [الشوریٰ: ۴۰-۴۲]

سوم: وہ ظلم ہے جو ایک انسان خود اپنے نفس پر کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿...فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ...﴾ ”...پھر ان میں سے کوئی اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے۔...“ [فاطر: ۳۲]

یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ جو لوگ ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں آخرت کے دن ان کی نیکیاں مظلومین کو دے دی جائیں گی اور نیکی نہ ہونے کی صورت میں ستائے ہوئے لوگوں کی برائیاں ان ظالموں پر لاد دی جائیں گی۔ جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تم لوگ جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟“ لوگوں نے عرض کیا: ہم میں سے مفلس وہ ہے جس کے پاس درہم یعنی روپیہ پیسہ اور کوئی پونجی نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک قیامت کے دن میری امت کا مفلس وہ ہو گا جو نماز، روزہ اور زکاۃ کے ساتھ آئے گا اس حال میں کہ اس نے کسی کو گالی دی

ہو گی، کسی پر تہمت لگائی ہو گی، کسی کا مال کھایا ہو گا، کسی کا خون کیا ہو گا، کسی کو مارا ہو گا، اس لیے ان لوگوں کو اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی اور اگر اس کی نیکیاں لوگوں کے حقوق کی ادائیگی سے پہلے ختم ہو گئیں تو ان لوگوں کی برائیاں اس پر ڈال دی جائیں گی اور پھر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔" [صحیح مسلم:۲۵۸۱] اس لیے دنیا میں اگر کسی پر ظلم کیے ہوں تو اس کی صفائی اسی دنیا میں کر لیں ورنہ آخرت میں ظلم کے مطابق مظلوموں کے گناہوں کا بوجھ اٹھانا پڑے گا، جیسا کہ مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے اور ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَانَتْ لَهُ مَظْلِمَةٌ لِأَحَدٍ مِنْ عِرْضِهِ أَوْ شَيْءٍ، فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ، قَبْلَ أَنْ لَا يَكُونَ دِينَارٌ وَلَا دِرْهَمٌ، إِنْ كَانَ لَهُ عَمَلٌ صَالِحٌ أُخِذَ مِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلِمَتِهِ، وَإِنْ لَمْ تَكُنْ لَهُ حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ صَاحِبِهِ فَحُمِلَ عَلَيْهِ)) "جس شخص کا کسی دوسرے کی عزت یا کسی اور چیز کے بارے میں کوئی ظلم ہو تو آج ہی اس سے چھٹکارا حاصل کر لے، اس دن کے آنے سے پہلے کہ جس دن کوئی دینار و درہم نہیں ہو گا، اگر اس کا کوئی نیک عمل ہو گا تو اس کے ظلم کے بقدر لے لیا جائے گا اور اگر نیکیاں اس کے پاس نہیں ہوں گی تو اس کے (مظلوم) ساتھی کی برائیاں اس پر ڈال دی جائیں گی۔" [صحیح بخاری:۲۴۴۹]

كُلُّكُمْ ضَالٌّ إِلَّا مَنْ هَدَيْتُهُ، فَاسْتَهْدُونِي أَهْدِكُمْ : "تم سب گمراہ ہو سوائے اس کے جسے میں ہدایت دے دوں، اس لیے تم مجھ سے ہدایت مانگو میں تمھیں ہدایت دوں گا۔" اس فرمان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکلفین میں اصل گمراہی ہے یعنی بندے اصلاً گمراہ ہیں اور اللہ کی ہدایت کے محتاج ہیں، اللہ ہی ہدایت دینے والا ہے اس لیے اسی سے ہدایت طلب کرنی چاہیے۔ حدیث کا یہ ٹکڑا بظاہر اُن احادیث کے معارض ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندے اصلاً ہدایت پر قائم ہوتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے: **((وَإِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِي حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ وَإِنَّهُمْ أَتَتْهُمُ الشَّيَاطِيْنُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِيْنِهِمْ))** "بے شک میں نے اپنے تمام بندوں کو مسلمان پیدا کیا ہے، پھر شیاطین ان کے پاس آئے اور انھیں ان کے دین سے دور کھینچ لیا۔" [صحیح مسلم: ۲۸۶۵] اور ایک دوسری روایت میں ہے: **((كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ))** "ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔" [صحیح بخاری:۱۳۸۵، صحیح مسلم:۲۶۵۸]

در حقیقت دونوں طرح کی روایات میں کوئی تعارض نہیں ہے، یہ حقیقت ہے کہ ہر انسان کی

پیدائش فطرتِ سلیمہ پر ہوتی ہے اور حق کو قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت فطری طور پر ان کے اندر پائی جاتی ہے، مگر وہ حق کی معرفت سے نابلد ہوتے ہیں اور عملاً اس سے دور ہوتے ہیں اور اسی عدمِ علم کو یہاں اس حدیث میں ضلالت یعنی گمراہی سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی حدیث میں گمراہ ہونے کی جو بات کہی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندے حق سے جاہل و ناواقف اور اس پر عمل کرنے سے غافل ہوتے ہیں اور اللہ ہی انھیں علم و ہدایت اور عمل کی توفیق دیتا ہے، لہٰذا اسی سے ہدایت طلب کرنی چاہیے۔ قرآن کریم میں یہی حقیقت اس طرح بیان ہوئی ہے: ﴿وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ ”اور اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور اس نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے، تاکہ تم شکر کرو۔“ [النحل:۷۸]

زیرِ مطالعہ حدیث کے مذکورہ جملے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہدایت یافتہ وہی ہے جسے اللہ ہدایت دے اور اللہ کے ارادہ و مشیئت اور اس کے ہدایت دینے ہی کی وجہ سے ہدایت ملتی ہے اور اللہ اپنے بندوں میں سے جنھیں چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور دوسرے لوگ اس کے ارادے ہی کے تحت ہدایت نہیں پاتے ہیں اور اگر وہ چاہے تو انھیں بھی ہدایت دے سکتا ہے، گویا بندے اور ان کے افعال دونوں اللہ کی مخلوق ہیں۔

اس حدیثِ قدسی سے اللہ تعالیٰ کے لیے صفتِ کلام کا ثبوت ملتا ہے اور کتاب و سنت کے بہت سے نصوص میں اللہ کے لیے کلام کا ثبوت موجود ہے نیز اس حدیث سے اللہ کے لیے نفس ثابت ہوتا ہے اور یہ کہ نفس کا اطلاق ذات پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ اس حدیث میں نفس سے مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ سلبی صفات بھی ہیں، چناں چہ اس حدیث سے بھی اللہ تعالیٰ کے لیے صفتِ ظلم کی نفی ہوتی ہے اور اس سے مجرد نفی مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے اس صفت کا اس کی ذاتِ اقدس سے منتفی اور نیست و نابود ہونا مراد ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے لیے صفتِ ظلم کی ضد عدل کی صفت بطریقِ کمال ثابت ہوتی ہے کہ وہ کمالِ عدل سے متصف ہے۔

نیکی کی راہوں کی کثرت اور صدقہ کی مختلف صورتیں

(۲۵) عَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَيْضًا، أَنَّ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُورِ بِالْأُجُورِ؛ يُصَلُّونَ كَمَا نُصَلِّي، وَيَصُومُونَ كَمَا نَصُومُ، وَيَتَصَدَّقُونَ بِفُضُولِ أَمْوَالِهِمْ. قَالَ: **((أَوَلَيْسَ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ مَا تَصَّدَّقُونَ؟ إِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةً، وَكُلِّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةً، وَكُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةً، وَكُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةً، وَأَمْرٌ بِمَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنْ مُنْكَرٍ صَدَقَةٌ، وَفِي بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ))** قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَيَأْتِي أَحَدُنَا شَهْوَتَهُ وَيَكُونُ لَهُ فِيْهَا أَجْرٌ؟ قَالَ: **((أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِي حَرَامٍ أَكَانَ عَلَيْهِ وِزْرٌ؟ فَكَذَلِكَ إِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ، كَانَ لَهُ أَجْرٌ))** رَوَاهُ مُسْلِمٌ

ابو ذر رضی اللہ عنہ ہی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! پورا اجر و ثواب تو دولت مند لوگ لے گئے، وہ لوگ ہماری طرح نماز پڑھتے ہیں، ہماری طرح روزہ رکھتے ہیں اور اپنے زائد مالوں سے صدقہ بھی کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ”کیا اللہ نے تمھارے لیے ایسی چیزیں نہیں بنائی ہیں، جن کے ذریعہ تم صدقہ کرو؟ بے شک ہر مرتبہ تسبیح کہنا صدقہ ہے، ہر مرتبہ تکبیر کہنا صدقہ ہے، ہر مرتبہ تحمید کہنا صدقہ ہے، ہر مرتبہ تہلیل کہنا صدقہ ہے، معروف کا حکم دینا صدقہ ہے، منکر سے روکنا صدقہ ہے اور تم میں سے کسی کا اپنی بیوی سے صحبت کرنا صدقہ ہے۔“ لوگوں نے کہا: ہم میں سے کوئی شخص اپنی شہوت پوری کرنے کے لیے آتا ہے تو کیا اس میں بھی اس کے لیے اجر ہے؟ آپ نے فرمایا: ”تمھارا کیا خیال ہے اگر وہ حرام جگہ میں اپنی شہوت پوری کرے تو کیا اس پر گناہ نہیں ہو گا؟ اسی طرح جب اس نے اسے حلال جگہ میں استعمال کیا تو اسے اجر ملے گا۔“ (صحیح مسلم:۱۰۰۶)

شرح و فوائد :

اَلدُّثُور : **دَثْرٌ** کی جمع ہے، اس کے معنیٰ اموال کے ہیں۔ **اَلبُضْعُ** : شادی، نکاح، مہر اور فرج وغیرہ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، یہاں اس کا اطلاق جماع پر کیا گیا ہے۔

جب غریب مہاجرین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ اہلِ ثروت اپنے مال کے ذریعے صدقہ و خیرات کرکے ہم سے آگے نکل گئے تو انھوں نے نیکی میں اضافہ کی خاطر اس قسم کا سوال کیا جو حدیث

میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رشک کرنا جائز ہے جب کہ حسد کرنا حرام ہے۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے مال کو صدقہ کہتے ہیں اور اسے صدقہ اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ کے لیے مال خرچ کرنے والا عملی طور پر اپنے ایمان کے صدق کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ویسے زیادہ تر صدقے کا اطلاق اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اللہ کی راہ میں نفلی طور پر خرچ کرنے والے مال پر ہوتا ہے اور کبھی وجوبی طور پر خرچ کرنے والے مالِ زکاۃ پر بھی ہوتا ہے، علاوہ ازیں زیرِ مطالعہ حدیث اور دیگر صحیح احادیث میں صدقے کو اس کے وسیع ترین مفہوم میں استعمال کرتے ہوئے کئی طرح کے اعمالِ صالحہ پر بھی صدقے کا اطلاق کیا گیا ہے، چناں چہ حدیث میں نیکی کے ہر کام کو بھی صدقہ کہا گیا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ((كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ)) ”ہر نیک کام صدقہ ہے۔“ [صحیح بخاری: ۶۰۲۱، صحیح مسلم: ۱۰۰۵] حتیٰ کہ مسلمانوں کو اذیت دینے سے اپنے آپ کو باز رکھنے کو بھی صدقہ کہا گیا ہے، جیسا کہ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ صَدَقَةٌ)) ”ہر مسلمان پر صدقہ کرنا ہے۔“ لوگوں نے عرض کیا اور اگر کوئی چیز نہ ملے؟ آپ نے فرمایا: ((فَيَعْمَلُ بِيَدَيْهِ، فَيَنْفَعُ نَفْسَهُ وَيَتَصَدَّقُ)) ”پھر وہ اپنے ہاتھوں سے کام کرے اور اس سے خود کو فائدہ پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔“ لوگوں نے عرض کیا: اگر اس کی طاقت نہ رکھے یا یہ بھی نہ کر سکے؟ آپ نے فرمایا: ((فَيُعِينُ ذَا الْحَاجَةِ الْمَلْهُوفَ)) ”پھر وہ ضرورت مند پریشان حال شخص کی مدد کرے۔“ لوگوں نے عرض کیا: اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے؟ آپ نے فرمایا: ”پھر وہ خیر کا حکم دے۔“ یا یہ فرمایا: ”پھر وہ معروف کا حکم دے۔“ لوگوں نے عرض کیا: اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے؟ آپ نے فرمایا: ((فَيُمْسِكُ عَنِ الشَّرِّ؛ فَإِنَّهُ لَهُ صَدَقَةٌ)) ”پھر وہ برائی سے رکا رہے، اس لیے کہ یہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے۔“ [صحیح بخاری: ۶۰۲۲، صحیح مسلم: ۱۰۰۸]

گذشتہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ حدیث میں مذکور اعمالِ صالحہ کو صدقہ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ اعمال بھی صدقہ کی طرح اجر و ثواب کے مستحق ہوتے ہیں گویا بطور مقابلہ انھیں اجر و ثواب میں صدقہ کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی کے پاس مالی حیثیت سے صدقہ و خیرات کرنے کی استطاعت نہ ہو تو وہ دیگر اعمالِ صالحہ کے ذریعہ صدقہ کا ثواب حاصل کر سکتا ہے، چناں چہ تسبیح یعنی

سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے، تکبیر یعنی اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے، تحمید یعنی الحمد للہ کہنا صدقہ ہے، تہلیل یعنی لا الٰہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے، بھلائی کا حکم دینا صدقہ ہے اور برائی سے روکنا صدقہ ہے، حتیٰ کہ اپنی بیوی کے پاس آنا بھی صدقہ ہے۔ اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تعجب ہوا اور انھوں نے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! کیا ہم میں سے کوئی اپنی بیوی سے شہوت پوری کرے تو اس میں بھی اس کے لیے ثواب ہے؟ آپ نے فرمایا: تم لوگوں کی کیا رائے ہے اگر وہ زنا کرے اور حرام طریقے سے شہوت کی تکمیل کرے تو کیا اس پر گناہ نہیں ہو گا؟ صحابہ نے کہا: ہاں، کیوں نہیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح جب وہ حلال طریقے سے شہوت پوری کرے گا تو اجر وثواب کا مستحق ہو گا۔ لہٰذا جماع کا مقصد اگر حقِ زوجیت کی ادائیگی، حکمِ الٰہی کے بموجب عورت کے ساتھ بہترین طرزِ معاشرت اختیار کرنا، نیک اولاد کی طلب، خود کی اور عورت کی پاک دامنی اور نظرِ حرام ڈالنے سے پرہیز کرنا، شہوانی خیالات سے بچنا یا کوئی دیگر صالح مقصد ہو تو یہ بھی عبادت میں شمار ہو گی اور آدمی اجر و ثواب سے نوازا جائے گا۔ آج کل ہمارے یہاں عبادت اور کارِ ثواب کو چند دینی شعائر اور اعمال کی بجا آوری تک محدود کر دیا گیا ہے، جب کہ اپنے رب تبارک وتعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور اس کے اشارے پر چلنا ہی عبادت ہے۔ اگر بندہ اپنے رب کے حکم پر چلتا ہے اور اپنے تمام امور اس کے احکام کے مطابق انجام دیتا ہے تو بندے کا ہر کام عبادت ہے اور وہ اس پر اجر وثواب دیا جائے گا۔ سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا، أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا، فَيَأْكُلُ مِنْهُ طَيْرٌ أَوْ إِنْسَانٌ أَوْ بَهِيمَةٌ، إِلَّا كَانَ لَهُ بِهِ صَدَقَةٌ)) ”جو کوئی مسلمان کوئی پودا لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور اس میں سے کوئی پرندہ یا انسان یا کوئی جانور کچھ کھالیتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہو جاتا ہے۔“ [صحیح بخاری: ۲۳۲۰، صحیح مسلم: ۱۵۵۳]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال و استفسار اور پھر اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو جواب دیا گیا ہے اس سے قیاس کا جواز ثابت ہوتا ہے، چناں چہ قیاس کے جواز کے قائل سوائے اہلِ ظاہر کے سبھی علماء ہیں، نیز تابعین وغیرہ سے قیاس کی مذمت میں جو کچھ منقول ہے اس سے مراد وہ قیاس نہیں ہے، جس پر فقہائے مجتہدین و محدثین کا اعتماد ہے بلکہ اس مذموم قیاس سے مراد قیاس بالعکس ہے۔ اصولیوں کا قیاس پر عمل کرنے کے بارے میں اختلاف ہے، مگر یہ حدیث اس پر عمل کے جائز ہونے کی دلیل ہے

اور یہی زیادہ درست ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

زیرِ مطالعہ حدیثِ مبارکہ میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے جذبۂ عمل، خیر کی طلب اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دُھن کا بیان ہوا ہے اور اس بات کی بھی صراحت موجود ہے کہ نیکی میں پیچھے رہنے کی وجہ سے انھیں رنج و تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ ہمیں بھی اپنے اندر یہی جذبہ اور تڑپ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نیک نیتی اور اچھے ارادے سے کیا جانے والا ہر وہ عمل جو خلافِ شرع نہ ہو اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے حتیٰ کہ شرعی دائرے میں رہ کر فطری خواہشات وعادات کی تکمیل بھی باعثِ اجر ہوتی ہے اور اگر رضائے الٰہی مقصود ہو تو گناہ و معصیت کے کاموں کو ترک کرنا بھی باعثِ اجر و ثواب ہوتا ہے، اس لیے نیک و جائز اعمال کی انجام دہی اور برائیوں سے اجتناب نیک نیتی سے کریں۔

تسبیح و تکبیر، تحمید و تہلیل اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی ایک قسم کا صدقہ ہیں۔ تاہم واضح رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ثواب، تسبیح و تحمید وغیرہ کلماتِ ذکر سے زیادہ ہے، کیوں کہ یہ فرض کفایہ ہے اور تسبیح و تحمید وغیرہ ذکر و اذکار نفل ہیں اور یہ معلوم بات ہے کہ فرض کا اجر نفل کے اجر سے زیادہ ہوتا ہے، جیسا کہ حدیثِ قدسی میں ہے: ((وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ)) "جن اعمال کے ذریعہ بندہ میری قربت حاصل کرتا ہے ان میں میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہیں جن کو میں نے فرض کیا ہے۔" [صحیح بخاری: ۶۵۰۲]

زیرِ مطالعہ حدیث تسبیح و جملہ اذکار سمیت معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے، مباح امور میں بھی نیت کرنے اور بعض پیچیدہ مسائل کے مختصر دلائل کو بیان کرنے کی اہمیت و فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مفتیانِ کرام کو مختصر دلائل بیان کرنا چاہیے اور جو شخص مسئلہ دریافت کر رہا ہے اگر اسے کسی دلیل کے بارے میں کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو وہ بھی وضاحت طلب کر سکتا ہے بس شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی بے ادبی نہ پائی جاتی ہو اور اسے یہ معلوم ہو کہ جس سے سوال کیا جائے گا وہ سوال کرنے کو ناپسند نہیں کرتا ہے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ لازم ہے

(٢٦) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : **((كُلُّ سُلَامَى مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ، كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيهِ الشَّمْسُ، تَعْدِلُ بَيْنَ اثْنَيْنِ صَدَقَةٌ، وَتُعِينُ الرَّجُلَ فِي دَابَّتِهِ فَتَحْمِلُهُ عَلَيْهَا أَوْ تَرْفَعُ لَهُ عَلَيْهَا مَتَاعَهُ صَدَقَةٌ، وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ، وَبِكُلِّ خُطْوَةٍ تَمْشِيهَا إِلَى الصَّلَاةِ صَدَقَةٌ، وَتُمِيطُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ صَدَقَةٌ))** رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ لازم ہوتا ہے۔ تمھارا دو آدمیوں کے درمیان عدل کرنا صدقہ ہے، تمھارا کسی آدمی کی مدد کرتے ہوئے اسے اس کی سواری پر بٹھا دینا یا اس کا سامان اٹھا کر اس کی سواری پر رکھ دینا صدقہ ہے، اچھی بات کہنا صدقہ ہے، ہر وہ قدم جو تُو نماز کے لیے اٹھاتا ہے وہ صدقہ ہے اور راستے سے تمھارا تکلیف دینے والی چیز کو ہٹانا بھی صدقہ ہے۔“ (صحیح بخاری: ۲۹۸۹، صحیح مسلم:۱۰۰۹)

شرح و فوائد :

سُلَامَى : ج: سُلامَیات، اصل میں ہاتھ اور پیروں کی انگلیوں کی ہڈیوں اور پوری ہتھیلی کے لیے بولا جاتا ہے، پھر اس کا استعمال پورے بدن کی ہڈیوں اور جوڑ والی ہڈیوں کے معنیٰ میں ہونے لگا۔ یہ لفظ واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، جب کہ بعض لوگوں نے اسے سُلامیۃ کا جمع کہا ہے۔
خُطْوَةٌ: خاء پر ضمہ اور فتحہ دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں: دو قدموں کا درمیانی فاصلہ، قدم کی ایک حرکت، چلنے کے لیے قدم اٹھانا۔ ج: خُطًی، خُطُوات

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس قدر بے شمار مختلف نعمتوں سے نوازا ہے کہ ان کا احصاء ممکن نہیں ہے اور اگر کوئی ان کا شکریہ ادا کرنا چاہے تو یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ صرف جسمِ انسانی پر غور کریں کہ اللہ نے کتنے زبردست احسانات کیے ہیں، چناں چہ بہترین شکل وصورت اور اچھی بناوٹ دے کر پیدا فرمایا، عقل اور سمجھ بوجھ سے سرفراز فرمایا، دیکھنے، سننے، چلنے پھرنے اور غور وفکر کرنے کی طاقت بخشی وغیرہ۔ زیرِ مطالعہ حدیث میں انہی نعمتوں کی جانب اشارہ کرکے جسمِ انسانی کے ہر جوڑ کی جانب سے

روزانہ صدقہ کرنے کی بات کہی گئی ہے اور صدقے کو صرف مال کے اندر محصور نہیں کیا گیا ہے، بلکہ خیر و بھلائی کی کئی صورتوں کو صدقہ قرار دے کر صدقہ کرنے کے لیے آسان طریقے کی جانب رہنمائی کی گئی ہے۔ دوسری صحیح حدیث میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تین سو ساٹھ (۳۶۰) جوڑ عطا کیے ہیں، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّهُ خُلِقَ كُلُّ إِنْسَانٍ مِنْ بَنِي آدَمَ عَلَى سِتِّينَ وَثَلَاثِمِائَةِ مَفْصِلٍ، فَمَنْ كَبَّرَ اللَّهَ، وَحَمِدَ اللَّهَ، وَهَلَّلَ اللَّهَ، وَسَبَّحَ اللَّهَ، وَاسْتَغْفَرَ اللَّهَ، وَعَزَلَ حَجَرًا عَنْ طَرِيقِ النَّاسِ، أَوْ شَوْكَةً، أَوْ عَظْمًا عَنْ طَرِيقِ النَّاسِ، وَأَمَرَ بِمَعْرُوفٍ، أَوْ نَهَى عَنْ مُنْكَرٍ، عَدَدَ تِلْكَ السِّتِّينَ وَالثَّلَاثِمِائَةِ السُّلَامَى؛ فَإِنَّهُ يَمْشِي يَوْمَئِذٍ وَقَدْ زَحْزَحَ نَفْسَهُ عَنِ النَّارِ)) ”آدم کی اولاد میں سے ہر انسان تین سو ساٹھ جوڑوں پر پیدا کیا گیا ہے۔ سو جس نے اللہ کی بڑائی کی، اللہ کی تحمید کی، لا الہ الا اللہ کہا، سبحان اللہ کہا، استغفر اللہ کہا اور لوگوں کی راہ سے پتھر ہٹا دیا، یا کوئی کانٹا یا ہڈی لوگوں کی راہ سے ہٹا دی یا اچھی بات کا حکم دیا یا بری بات سے روکا، اس نے تین سو ساٹھ جوڑوں کی گنتی کے برابر صدقہ کیا وہ اس دن چل رہا ہے اور اپنی جان کو لے کر دوزخ سے ہٹا لیا۔“ [صحیح مسلم:۱۰۰۷]

مطلب یہ کہ اللہ رب العزت کی عظیم نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت انسانی بدن میں پائے جانے والے جوڑ بھی ہیں اور ان کا سلامت رہنا بھی بڑی عظیم نعمت ہے، ان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ اگر بدنِ انسانی میں موجود ہڈیوں کے جوڑوں میں سے کسی ایک جوڑ کو سلب کر لیا جائے یا وہ سوکھ جائے یا وہ کام کرنا بند کر دے تو انسان کے جسم میں بہت بڑا خلل پیدا ہو جائے گا اور اس کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا اور جینا دوبھر ہو جائے گا، اس لیے روزانہ ہر جوڑ کی طرف سے بطور خاص صدقہ دینا چاہیے تا کہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہر نعمت کی شکر گزاری کی تجدید ہوتی رہے۔

زیرِ مطالعہ حدیث کے ظاہرِ الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ روزانہ تمام جوڑوں کی جانب سے بطور شکر صدقہ دینا واجب ہے، لیکن علماء نے اسے مستحب قرار دیا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”علماء بیان کرتے ہیں کہ یہاں صدقہ سے مراد مستحب و ترغیبی صدقہ ہے، نہ کہ وجوبی اور لازمی صدقہ ہے۔“ [المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج ص:۶۴۲]

ایک دوسری روایت میں بدن کے تمام جوڑوں کی جانب سے صدقہ کے لیے سورج طلوع ہونے

کے بعد چاشت کی دو رکعت پڑھ لینے کو بھی کافی قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((يُصْبِحُ عَلَى كُلِّ سُلَامَى مِنْ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ؛ فَكُلُّ تَسْبِيحَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَحْمِيدَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَهْلِيلَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَكْبِيرَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَيُجْزِئُ مِنْ ذَلِكَ رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا مِنَ الضُّحَى)) ''صبح ہوتی ہے تو تم میں سے ہر کسی کے تمام جوڑوں پر صدقہ کرنا لازم ہوتا ہے۔ پس ہر بار ''سبحان اللہ'' کہنا ایک صدقہ ہے، ہر بار ''الحمدُ لِلَّه'' کہنا ایک صدقہ ہے، ہر بار ''لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ'' کہنا ایک صدقہ ہے، ہر بار ''اللَّهُ اکبر'' کہنا ایک صدقہ ہے، نیکی کا حکم دینا ایک صدقہ ہے، منکر سے روکنا ایک صدقہ ہے اور ان سب سے چاشت کی دو رکعتیں کافی ہو جاتی ہیں، جس کو وہ پڑھ لیتا ہے۔'' [صحیح مسلم:۷۲۰]

اسی طرح ابو ذر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ کر دینے یعنی لوگوں کو تکلیف پہنچانے سے باز رہنے کو اپنی ذات کا صدقہ قرار دیا ہے، فرمایا:

((تَدَعُ النَّاسَ مِنَ الشَّرِّ؛ فَإِنَّهَا صَدَقَةٌ تَصَدَّقُ بِهَا عَلَى نَفْسِكَ)) ''تم لوگوں کو شر سے محفوظ کر دو، کیوں کہ یہ بھی ایک صدقہ ہے جسے تم خود اپنے اوپر کرو گے۔'' اور صحیح مسلم میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((تَكُفُّ شَرَّكَ عَنِ النَّاسِ، فَإِنَّهَا صَدَقَةٌ مِنْكَ عَلَى نَفْسِكَ)) ''تو کسی سے برائی نہ کر، یہی تیرا صدقہ ہے اپنے نفس پر۔'' [صحیح بخاری:۲۵۱۸، صحیح مسلم:۸۴]

تاہم واضح رہے کہ شکر گزاری کے دو درجے ہیں: ① پہلا درجہ وجوبی ہے اور ② دوسرا درجہ مستحب ہے۔ **وجوبی شکر گزاری کا مطلب** یہ ہے کہ آدمی اوامر و واجبات کو ادا کرے اور منہیات و حرام امور سے اجتناب کرے، یہ انتہائی ضروری ہے اور نعمتوں کی شکر گزاری کے لیے کافی ہے، جیسا کہ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب لوگوں نے عرض کیا: اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((فَيُمْسِكُ عَنِ الشَّرِّ؛ فَإِنَّهُ لَهُ صَدَقَةٌ)) ''پھر وہ شر سے رکا رہے، اس لیے کہ یہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے۔'' [صحیح بخاری:۶۰۲۲، صحیح مسلم:۱۰۰۸]

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی شر سے بچا رہے یہی اس کے لیے کافی ہے اور شر سے آدمی اسی وقت بچے گا جب وہ فرائض کو ادا کرے گا اور محارم سے اجتناب کرے گا، کیوں کہ سب سے بڑا شر

فرائض کو ترک کرنا اور حرام امور کا ارتکاب کرنا ہے۔

مستحب شکر گزاری کا مطلب یہ ہے کہ آدمی فرائض کی ادائیگی اور محارم سے اجتناب کے بعد نوافل ادا کرے اور نیکی کی جو صورتیں بیان کی گئی ہیں انھیں انجام دے۔ یہ سابقین مقربین کا درجہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس جانب ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور خود راتوں میں اتنی لمبی نماز پڑھتے تھے کہ پاؤں مبارک میں وَرَم (سوجن) آجاتا تھا، کہا گیا: اللہ نے آپ کے اگلے اور پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے ہیں پھر ایسا کیوں کرتے ہیں؟ آپ ﷺ فرمایا: ((أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا)) ”کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔“ [صحیح بخاری:۴۸۳۶، صحیح مسلم:۲۸۱۹]

نبی کریم ﷺ نے زیرِ مطالعہ حدیث میں چند ایسی آسان صورتیں ذکر کی ہیں جن کے ذریعے ہر جوڑ کی جانب سے صدقہ دیا جاسکتا ہے اور یہ صورتیں **فعلی بھی ہیں، قولی بھی ہیں نیز قاصر بھی ہیں اور متعدی بھی ہیں۔** قاصر ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان کا فائدہ صرف اس کام کے کرنے والے تک محدود رہتا ہے اور متعدی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا نفع دوسروں تک پہنچتا ہے، چناں چہ نبی کریم ﷺ نے اس حدیثِ مبارکہ میں جن صورتوں کو ذکر فرمایا ہے، وہ بطور حصر نہیں ہیں بلکہ بطور تمثیل ہیں۔ مثلاً دو افراد کے درمیان انصاف، فیصلے میں بھی ہوسکتا ہے اور دو جھگڑنے والوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا کے بھی ہوسکتا ہے اور یہ **قولی و متعدی صدقہ** کی مثال ہے اور اس سے ”اصلاح بین الناس“ (لوگوں کے درمیان صلح کرانے) کی اہمیت و فضیلت ثابت ہوتی ہے نیز آدمی کو اس کے چوپائے پر سوار ہونے میں مدد کرنا یا پھر اس کا سامان اٹھا کر اس کے چوپائے پر رکھ دینا **فعلی و متعدی صدقہ** ہے اور اچھی بات کہنے میں ہر طرح کی اچھی گفتگو اور اچھا کلام آجاتا ہے، مثلاً ذکر واستغفار، دعا، قراءت، تعلیم دینا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ اور یہ **قولی قاصر اور قولی متعدی** کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح نماز پڑھنے کے لیے جاتے ہوئے مسلمان کا اٹھنے والا اس کا ہر قدم خود اس کی اپنی ذات پر صدقہ ہے اور یہ **فعلی قاصر صدقہ** کی مثال ہے۔ ایسے ہی راستے سے تکلیف دہ شے کو ہٹا دینا جیسے کانٹا، پتھر یا کوئی شیشہ وغیرہ یہ **فعلی متعدی صدقہ** کی مثال ہے۔

ہر شخص کو مذکورہ صدقات و نوافل کا مداومت کے ساتھ اہتمام کرنا چاہیے، ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ آدمی ایک دن انھیں ادا کرنے کے بعد دوسرے روز انھیں ادا کرنے سے بے نیاز ہوجائے گا اور جوڑوں

کی جانب سے صدقہ ادا ہو جائے گا، کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے ہر روز کہ جس میں سورج طلوع ہوتا ہے صدقہ کرنے کی بات کہی ہے اور پھر رات گزارنے کے بعد ہر روز انسان کو گویا نیند یعنی موت کے بعد ایک نئی زندگی ملتی ہے، جیسا کہ رب العالمین کا فرمان ہے :

﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ...﴾ ''اور وہی ہے جو تمھیں رات کو قبض کرلیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کمایا، پھر وہ تمھیں اس میں اٹھا دیتا ہے، تاکہ مقرر مدت پوری کی جائے۔'' [الأنعام:٦٠]

زیرِ مطالعہ حدیث میں کئی طرح کے نیک اعمال کو صدقہ کہا گیا ہے، جس سے جہاں ان اعمال کو انجام دینے کی ترغیب دی گئی ہے اور باہمی تعاون اور آپسی بھائی چارے کو فروغ دینے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، وہیں ان اعمالِ خیر کی اہمیت و فضیلت بھی واضح ہوتی ہے، ان اعمالِ خیر کی مختصر تفصیل یہ ہے : **لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرانا، اپنے بھائی کی مدد کرنا، مسجدوں کو آباد کرنے کے لیے پیدل چل کر باجماعت نماز میں حاضر ہونا، زبان سے اچھی بات نکالنا اور راستے سے تکلیف دہ اور نقصان پہنچانے والی چیزوں کو ہٹانا۔** تنگ راستوں کو کشادہ کرنا اور بیچ سڑک میں خرید و فروخت اور گفتگو کرنے والوں کو روکنا بھی تکلیف دہ چیزوں کو ہٹانے کے وسیع مفہوم میں داخل ہے۔

آپسی اختلاف کے شکار لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا انتہائی فضیلت کا حامل عمل ہے، اس سے الفت و محبت بڑھتی ہے اور آپسی دشمنیاں ختم ہوتی ہیں جب کہ جانب داری سے فیصلہ کرنے کی صورت میں آپس میں ناچاقی و دشمنی پیدا ہوتی ہے، اس لیے ہر ممکن طریقے سے دو مسلمان بھائیوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرنے اور ان کے درمیان اصلاح کرا دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس حدیث سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ مذکورہ افعال کے ذریعہ آدمی اپنے جوڑوں کا صدقہ دے سکتا ہے، وہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس کسی شخص کے پاس مال و دولت نہ ہو تو وہ مذکورہ افعال کے ذریعہ صدقات و خیرات کا ثواب حاصل کر سکتا ہے۔

نیکی اور بدی کی پہچان

(۲۷) عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ، وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

وَعَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ : ((**جِئْتَ تَسْأَلُ عَنِ الْبِرِّ؟**)) قُلْتُ : نَعَمْ. فقَالَ : ((**اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ، اَلْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ إِلَيْهِ النَّفْسُ، وَاطْمَأَنَّ إِلَيْهِ الْقَلْبُ، وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ، وَإِنْ أَفْتَاكَ النَّاسُ وَأَفْتَوْكَ**)) حَدِيثٌ حَسَنٌ، رَوَيْنَاهُ فِي مُسْنَدَيِ الْإِمَامَيْنِ أَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ وَالدَّارِمِيِّ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ

نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تمھارے دل میں کھٹکے اور تمھیں ناگوار گزرے کہ لوگ اس سے باخبر ہوں۔“ (صحیح مسلم:۲۵۵۳)

نیز وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: ”تم نیکی کے بارے میں پوچھنے آئے ہو؟“ میں نے کہا: ہاں، تو آپ نے فرمایا: ”تم اپنے دل سے پوچھو، نیکی وہ ہے جس پر نفس و دل مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جو نفس میں کھٹکے اور دل میں تردد پیدا ہو، خواہ لوگ تجھ سے (اس کے جواز کا) فتویٰ بیان کریں۔“ (یہ حدیث حسن ہے، اسے امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند (۱۸۰۰۱،۱۷۹۹) میں اور امام دارمی نے اپنی سنن (۲/۲۴۶، برقم:۲۵۷۵) میں حسن سند سے روایت کیا ہے۔) [یہ روایت انقطاع کی وجہ سے سنداً ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے : حاشیہ مسند احمد بتحقیق شعیب ارنؤوط : ۲۹/۵۲۳-۵۲۷-۵۳۲]

شرح و فوائد :

مذکورہ دونوں احادیثِ مبارکہ میں نیکی و بھلائی اور گناہ کی علامت کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلی حدیث میں نیکی کے بارے میں یہ بات کہی گئی ہے کہ نیکی حُسنِ خلق کا نام ہے اور دوسری حدیث میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ نیکی وہ ہے جس پر انسان کا نفس و دل مطمئن ہو جائے۔ حقیقت میں انسان اگر اپنی فطرتِ سلیمہ پر قائم ہو تو اس کے نفس کا اطمینان اچھے اعمال و اقوال پر ہی ہو گا، خواہ وہ اعمال و اقوال اخلاق میں سے ہوں یا پھر ان کے علاوہ دیگر افعال میں سے ہوں۔

عام طور پر حُسنِ خُلق کا مطلب لوگوں کے ساتھ اچھا تعامل کرنا، ان سے خوش روئی وخوش مزاجی سے ملنا اور ان کی دل جوئی کرنا، احکام و معاملات میں عدل سے کام لینا، صدقہ و خیرات دینا، حتی المقدور دنیاوی امور میں کسی کو ناراض نہ کرنا اور انھیں تکلیف و اذیت دینے سے بچنا وغیرہ بیان کیا جاتا ہے۔ جب کہ مختصر لفظوں میں حُسنِ خلق کی تعریف کی جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ کتاب و سنت میں بیان ہوئے تمام اچھے عادات و اطوار اور مؤمنین کی صفات و خصوصیات کو اپنی زندگی میں اس طرح داخل کر لینا کہ یہ انسان کی عادت بن جائیں اور انسان کسی تکلف و پریشانی کے بغیر انھیں انجام دے نیز کتاب و سنت میں بیان ہوئی برائیوں اور بری عادات و خصائل سے بچنا کہ ان سے اجتناب انسانی فطرت بن جائے۔ [حسنِ اخلاق سے متعلق مزید تفصیل کے لیے حدیث نمبر:۱۸ کے فوائد ومسائل ملاحظہ فرمائیں۔]

لفظِ "بِرٌّ" تمام طرح کے اعمالِ خیر اور نیکی کی تمام قسموں کو شامل ہے، لیکن یہاں اس حدیث میں حسنِ خُلُق کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ نے نیکی و بھلائی کو حُسنِ خُلق کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسنِ اخلاق کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کا تعلق صرف بندوں کے ساتھ نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ عام ہے، خواہ اس کا تعلق انسان اور اس کے رب کے ساتھ ہو یا پھر اس کا تعلق بندوں اور دیگر مخلوقات کے ساتھ ہو۔ مثلاً اللہ کے ساتھ حُسنِ اخلاق یہ ہے کہ بندہ پورے شرحِ صدر اور قلبی اطمینان کے ساتھ توحید باری تعالیٰ اور اس کے جملہ احکام و ممنوعات کو قبول کرے اور ان کو قبول کرنے میں کسی طرح کا تکلف و تصنع نہ کرے اور نہ تنگ دلی کا شکار ہو۔ گویا حسنِ خلق کے مفہوم میں ارکانِ اسلام و ایمان، حقوق اللہ، حقوق العباد، صبر و شکر، وفائے عہد، صدق وصفا، امانت و دیانت، عدل وانصاف، صدقہ وخیرات، صلہ رحمی، جہاد، احسان غرض سبھی کچھ شامل ہے۔

یہ اللہ رب العزت کا کرم واحسان ہے کہ اس نے ہم کو ایسی فطرت وطبیعت ودیعت کر رکھی ہے، جو ہمیں برائیوں سے آگاہ ومتنبہ کرتی ہے، فواحش ومنکرات کو انجام دینے سے بچاتی ہے اور اعمالِ صالحہ کی ترغیب دلاتی ہے یعنی اللہ نے فطرتِ انسانی میں نیکی وبدی کی پہچان رکھ دی ہے، لہٰذا فطرت انسانی کا تقاضاہے کہ وہ برائیوں سے دور رہے، بے حیائی کے قریب نہ جائے اور حسنات کی طرف مائل ہو۔ یہ اور بات ہے کہ انسان کسی روک ٹوک اور احساس کے بغیر شعوری یا غیر شعوری طور پر روز افزوں برائیوں

میں لت پت ہوتا چلا جائے، جس کی وجہ سے اس کی قوتِ حس اور ضمیر ہی مردہ ہو جائے اور برائیاں اسے خوبی معلوم ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ”پس آپ یک سو ہو کر اپنا منھ دین کی طرف متوجہ کر دیں۔ اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے سب لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“ [الروم:۳۰]

آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیقی طور سے ہر انسان کی فطرت، توحید و اسلام اور اطاعتِ الٰہی کی طرف مائل ہوتی ہے اور اس میں اچھائیوں کے قبول کرنے کی خو پائی جاتی ہے یہ اور بات ہے کہ ماحول کی خرابی، تربیتِ صحیحہ کے فقدان اور مسلسل گناہوں کی آلائش میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے انسانی فطرت کی آواز دب جائے۔

زیرِ بحث حدیث میں نیکی کی طرح ”إثم“ یعنی گناہ کی بھی دو علامتیں بیان کی گئی ہیں، چناں چہ گناہ کی **پہلی علامت** یہ بیان کی گئی ہے کہ جس کام کے کرنے پر انسان کے دل میں کھٹک پیدا ہو اور اس کے کرنے پر انسان کا دل مطمئن نہ ہو۔ مطلب یہ کہ جس کام کے کرنے پر انسان کے دل میں تردد پائی جائے اور اسے شبہہ لاحق ہو تو وہی گناہ ہے اگرچہ دیگر لوگ یہ کہیں کہ یہ گناہ نہیں ہے بشرط یہ کہ فتویٰ صادر کرنے والا کسی شرعی دلیل کے بغیر محض اپنی رائے و قیاس اور ہوائے نفس کی بنیاد پر فتوی دے رہا ہو۔ گناہ کے تعلق سے دل میں کھٹک اسی وقت پیدا ہو گی جب انسان فطرتِ سلیمہ پر قائم ہو گا اور اس کا سینہ ایمان کی دولت سے معمور ہو گا اور اگر کسی شرعی دلیل کے ساتھ فتوی دیا جائے اور شرعی نصوص کی بنیاد پر کسی کام کو حرام قرار دیا جائے تو ایسے فتوے کو تسلیم کرنا اور اس حرام کام سے بچنا ضروری ہو گا، خواہ انسان کا سینہ اس کے لیے کتنا ہی کشادہ کیوں نہ ہو اور وہ اس کے بارے میں متردد ہو۔ رہے فاسق و فاجر قسم کے لوگ تو انھیں واضح برائی میں بھی خوبی نظر آتی ہے پھر کسی گناہ کے متعلق ان کے دل میں کیسے کھٹک پیدا ہو گی؟ وہ تو گناہ و معصیت کے کام کھلے عام کرتے ہیں اور فخریہ ان کا اظہار بھی کرتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿أَفَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ...﴾ ''تو کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا بُرا عمل مزین کر دیا گیا تو اس نے اسے اچھا سمجھا (اس شخص کی طرح ہے جو ایسا نہیں؟) پس بے شک اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔'' [فاطر:۸] ﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا﴾ ''کہہ دے کیا ہم تمھیں وہ لوگ بتائیں جو اعمال میں سب سے زیادہ خسارے والے ہیں۔ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں ضائع ہو گئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ بے شک وہ ایک اچھا کام کر رہے ہیں۔'' [الکھف:۱۰۳-۱۰۴]

نیز حدیثِ مبارکہ میں گناہ کی **دوسری علامت** یہ بیان کی گئی ہے کہ جس کام کو انجام دیتے ہوئے انسان یہ بات ناپسند کرے کہ دوسرے لوگ اس کے بُرے کام سے باخبر ہوں اور لوگ اس کام کو برا جانیں وہ گناہ ہے، کیوں کہ یہ عام بات ہے کہ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے اچھے کام لوگوں کی نگاہوں میں آئیں اور بُرے کام کی خبر کسی کو نہ لگے اور یہی چیز ریا کا سبب بھی بنتی ہے۔

تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر اس کام کو ترک کر دے جس کے متعلق اس کے دل میں تردد پیدا ہو اور اس کا دل اس پر مطمئن نہ ہو، جیسا کہ نبوی فرمان ہے: ((دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ)) ''وہ چیز چھوڑ دو جس میں تمھیں شک ہو اور وہ چیز اختیار کرو جس میں تمھیں شک نہ ہو۔'' [صحیح/سنن ترمذی: ۲۵۱۸، سنن نسائی: ۵۷۱۱، یہ حدیث پیچھے حدیث نمبر:۱۱ کے تحت گزر چکی ہے، وہاں اس کے شرح وفوائد ملاحظہ فرمائیں۔]

''إِثْم'' کے لغوی معنی تقصیر اور پیچھے رہ جانے کے ہیں، تاہم اس کا اطلاق جان بوجھ کر کیے گئے قابلِ مذمت وملامت کام پر ہوتا ہے اور یہ صغائر وکبائر دونوں طرح کے گناہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس حدیث میں اثم کا اطلاق اس گناہ پر کیا گیا ہے جس سے فطرتِ انسانی نفرت محسوس کرے اور اس کا دل اس پر مطمئن نہ ہو گویا اس کا تعلق عمل سے زیادہ دل سے ہے۔ غور کریں کہ جن کاموں کے متعلق دل میں کھٹکا ہو اور اس کے بارے میں شبہ پیدا ہو جائے وہ کام بھی گناہ ہیں، اسی طرح جن کے جائز اور ناجائز ہونے کے بارے میں کوئی واضح حکم موجود نہ ہو ان مشتبہ امور سے بھی بچنے کی تاکید کی گئی ہے تو پھر جن امور سے واضح الفاظ میں منع کیا گیا ہو ان کے گناہ ہونے میں کیوں کر کلام ہو سکتا ہے؟ جو لوگ واضح محرمات ومنہیات کو اپنی غلط

تاویل کے ذریعہ جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں انھیں اپنے طرزِ فکر میں سدھار لانے کی کوشش کرنی چاہیے اور یہ بات جان لینی چاہیے کہ باطل تاویلات کی وجہ سے گناہ کا کام کارِ ثواب نہیں ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اگر کسی عمل کا مشروع و جائز ہونا شرعی دلائل سے ثابت ہو، مگر کچھ لوگ اسے ناپسند کریں یا اپنی جہالت کی وجہ سے اسے طبعِ انسانی کے خلاف قرار دیں، اسی طرح اگر کوئی برائی عام ہو جائے اور لوگ اسے برا نہ خیال کریں بلکہ الٹا اس سے بچنے والوں کو بُری نگاہ سے دیکھیں تو ایسی صورت میں شرعی دلائل کے مقابلے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی کوئی پروا نہیں کی جائے گی۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شرعی احکام کو سیکھنے اور اسے اپنا دستور العمل بنانے کے بے حد حریص تھے، اسی مقصد کے تحت گاہے بہ گاہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال بھی کیا کرتے تھے اور آپ بھی نہایت بلاغت کے ساتھ مختصر سے آسان جملے میں جواب مرحمت فرماتے جو کہ نہایت عظیم اور وسیع معانی پر مشتمل ہوا کرتا تھا، کیوں کہ اللہ نے آپ کو جوامع الکلم سے نوازا تھا۔

راویِ حدیث کا تعارف :

❀ نوّاس بن سمعان بن خالد بن عبد اللہ بن عمرو کلابِی عامری انصاری رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلۂ بنو کلب سے ہے۔ شام میں سکونت اختیار کی، اس لیے ان کا شمار شامی صحابہ میں ہوتا ہے۔ انھیں اور ان کے والد دونوں کو شرفِ صحابیت حاصل ہے۔ ان کے والد جب خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دعا دی اور ان کی طرف سے پیش کیے گئے ایک جوڑی جوتوں کے ہدیے کو قبول فرمایا۔ ان سے سترہ (۱۷) حدیثیں مروی ہیں۔ ان کی وفات شام ہی میں ۵۰ ہجری کے قریب ہوئی۔

❀ وابصہ بن معبد بن عتبہ بن حارث بن مالک اسدی جہنی رضی اللہ عنہ کا تعلق انصار کے قبیلے اسد بن خزیمہ سے ہے۔ ان کی کنیت ابوقِرصافہ ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابو سالم یا ابو الشعثاء یا ابو سعید اسدی ہے۔ ۹ ہجری میں خدمتِ نبوی میں وفد کی شکل میں نمائندہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے، اسلام قبول کیا اور پھر اپنی قوم میں واپس چلے گئے، کوفہ میں اقامت اختیار کی اور اس کے بعد حیرہ کی طرف چلے گئے۔ یہ بڑے رقیق القلب تھے اور اپنی آنسوؤں پر کنٹرول نہیں رکھ پاتے تھے۔ مقامِ رقہ کے اندر ۹۰ ہجری میں وفات پائی اور ان کی قبر جامع مسجد رقہ کے منارے کے پاس ہے۔ ان سے پانچ (۵) یا گیارہ (۱۱) حدیثیں مروی ہیں۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

سنت کی پیروی اور بدعات سے دوری

(۲۸) عَنْ أَبِي نَجِيحٍ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : وَعَظَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْعِظَةً وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوبُ، وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُونُ، فَقُلْنَا : يَا رَسُولَ اللَّهِ! كَأَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا، قَالَ : ((**أُوصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللَّهِ، وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ تَأَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ، فَإِنَّهُ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ فَسَيَرَى اِخْتِلَافًا كَثِيرًا، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّيْنَ، عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ؛ فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ**))

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ : حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ

ابو نجیح عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے بلیغ انداز میں ہمیں وعظ و نصیحت فرمائی، جس سے دل ڈر گئے اور آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! گویا یہ الوداعی وعظ ہے، پس آپ ہمیں وصیت فرمائیں! آپ نے فرمایا: ”میں تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے، سننے اور اطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں خواہ کوئی غلام تمھارا امیر ہو جائے، اس لیے کہ تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا، پس تم پر میری اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت لازم ہے، سو تم اسے مضبوطی سے تھام لو اور داڑھوں سے پکڑ لو اور دین میں نئے کام جاری کرنے سے بچو، کیوں کہ دین میں ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔“ (سنن أبو داود : ۴۶۰۷، سنن ترمذی: ۲۶۷۶، امام ترمذی نے اسے ”حسن صحیح“ کہا ہے۔)

شرح و فوائد :

بَلِيغَةً: بلیغ، انذار و تخویف میں حدِ کمال کو پہنچا ہوا، یہ بالغ سے ماخوذ ہے۔ ذَرَفَتْ: بہہ پڑیں، ڈبڈبا آئیں، ذَرَفَ يَذْرُفُ ذَرْفًا وذُرُوْفًا وذَرِيْفًا (العَيْنُ): آنکھ سے آنسو جاری ہونا۔ وَجِلَتْ: ڈر گئے، وَجِلَ يَوْجَلُ وَجَلاً وَمَوْجَلاً: ڈرنا، گھبرانا۔ مُوَدِّعٍ: الوداع کہنے والا، رخصت کرنے والا، أَوْدَعَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ عَضُّوا: عَضَّ يَعُضُّ عَضًّا وَعَضِيْضًا: دانتوں

سے پکڑنا، کاٹنا اور النَّوَاجِذ: نَاجِذٌ کی جمع ہے، ڈاڑھ کے دانت۔ عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ کا مطلب ہے اس کو مضبوطی سے تھامنا، اس پر سختی کے ساتھ قائم رہنا، اس کی حفاظت کرنا۔

نبی کریم ﷺ کی اہم ترین وصیت پر مشتمل اس حدیثِ نبوی میں بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے، بلا تفریق رنگ و نسل مسلمان حکمراں کی بات کو سننے اور ماننے نیز سنتِ نبوی اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھامنے اور بدعت سے بچنے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کی وصیتوں کے بڑے حریص رہتے تھے۔ وہ آپ ﷺ سے وصیت کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ چناں چہ آپ ﷺ انھیں ان کے مطالبہ کی وجہ سے یا کبھی ان کے مطالبہ کے بغیر بھی بڑی اہم وصیتیں فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ ذخیرۂ احادیث میں نبی کریم ﷺ کی وصیتوں پر مشتمل متعدد احادیث موجود ہیں۔

یہ حدیث دلائلِ نبوت میں سے ہے۔ آپ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق امت میں شدید اختلاف رونما ہوا اور نت نئے فتنے اور مختلف طرح کے گمراہ فرقے وجود میں آئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، جیسا کہ آئے دن نت نئے فتنے اور گمراہ فرقے ظاہر ہو رہے ہیں۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اختلاف رونما ہونے کی صورت میں اپنی سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھامنے اور امیر کی باتوں کو ماننے اور بدعات و محدثات سے بچنے کا حکم دیا ہے، جو آپسی اختلافات کو ختم کرنے کا سب سے اہم اور عمدہ ذریعہ ہے۔

حقیقت میں بدعات، فکری و عملی گمراہی، فتنہ و فساد اور اختلاف و افتراق کا باعث ہوتی ہیں، امت میں جو اختلاف و انتشار پیدا ہوا اس کی بنیادی وجہ سنت سے دوری اور بدعت سے نزدیکی و شیفتگی ہی ہے، جب کہ ان کے مقابلے میں کتاب و سنت کی روشن تعلیمات اور اس سلسلے میں سلفِ صالحین کی رَوِش نجات کا ضامن نیز امن و سکون اور وحدت و اتفاق کا باعث ہیں اور یہی شرعی و فطری تقاضا بھی ہے کہ کتاب و سنت کی پیروی کی جائے۔

امیر کی اطاعت ضروری ہے جب تک کہ وہ شرعی حدود میں رہ کر کوئی حکم دے، خواہ وہ کسی بھی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو، البتہ خلافِ شرع حکم میں اس کی پیروی نہیں کی جائے گی، جیسا کہ ابن عمر

رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ، مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ، فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ)) "پسند اور ناپسند ہر ایک معاملے میں (امیر کی بات) سننا اور ماننا مسلمان شخص پر واجب ہے، جب تک کہ وہ نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سنے اور نہ اطاعت کرے۔" [صحیح بخاری:۷۱۴۴، صحیح مسلم:۱۸۳۹]

سنت کے لغوی معنیٰ طریقہ، ضابطہ، سیرت خواہ اچھی ہو یا بُری، فطرت، عادت و مزاج، شکل و صورت اور چہرہ کے ہیں، اس کی جمع سُنَن آتی ہے۔ واضح رہے کہ لغوی اعتبار سے حدیث و سنت کے مابین اگرچہ فرق پایا جاتا ہے، مگر اصطلاحی طور پر اور حجت و قابلِ عمل ہونے کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں، ایک دوسرے کے ہم معنیٰ اور مساوی ہیں اور دونوں کا اطلاق ایک دوسرے پر ہوتا ہے بالخصوص جب سنت کا عطف کتاب پر ہو تو وہ حدیث ہی کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ نیز بسا اوقات سنت کا اطلاق کتاب و سنت کی تمام تر تعلیمات پر بھی ہوتا ہے، اس طرح کہ کتاب و سنت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور یہی وہ طریقہ ہے، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاربند رہے۔

اصطلاحی طور پر محدثین کے نزدیک سنت یا حدیث سے مراد وہ قول یا فعل یا تقریر یا وصف ہے، جس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہو، اگر وہ اصولِ حدیث کی قواعد کے مطابق ثابت ہو تو مقبول ہوگی اور اگر ثابت نہ ہو تو مردود ہوگی اور حدیثِ رسول نہیں کہلائے گی۔ تقریر سے مراد وہ اقوال و افعال ہیں، جن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار کی اور انکار نہیں فرمایا یا پسندیدگی کا اظہار کیا۔ **فقہاء کے نزدیک** سنت شرع سے ثابت وہ پسندیدہ عمل ہے، جو نہ فرض ہو اور نہ واجب ہو، یعنی سنت کا لفظ مستحب اور مندوب کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے اور بسا اوقات فقہاء کے یہاں سنت کا لفظ بدعت کے مقابلہ میں بھی بولا جاتا ہے۔ نیز **اصولیوں کے نزدیک** سنت کا اطلاق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال و افعال و تقاریر پر ہوتا ہے جو تشریع اور قانون کا پہلو رکھتے ہیں اور کسی شرعی حکم کی دلیل بن سکتے ہیں۔

محدثینِ کرام، فقہائے عظام اور اصولیوں کے یہاں سنت کی اصطلاحی تعریف میں جو یہ اختلاف پایا جاتا ہے دراصل یہ ان کے اغراض و مقاصد کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ چناں چہ محدثین کی بابرکت جماعت

نے رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات سے متعلق بحث وجستجو کیا اور آپ ﷺ کی مکمل سیرت واخلاق، عادات واطوار، اخبار واقوال اور افعال وتقاریر سے متعلق تمام چیزوں کو پوری امانت ودیانت داری کے ساتھ نقل کر دیا۔ اور اصولیوں نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں مجتہدین کے لیے قانون وضع کرنے اور لوگوں کے لیے دستورِ حیات بیان کرنے کی حیثیت سے تحقیق وجستجو کیا، چناں چہ آپ کے ان اقوال وافعال اور تقریرات کا اہتمام کیا جن سے احکام وقوانین ثابت ہوتے ہیں۔ اور علمائے فقہ نے رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال اور تقریرات کے بارے میں شرعی حکم جاننے سے متعلق تحقیق وجستجو کیا اور مکلفین کے افعال کے تعلق سے شرعی حکم: واجب، حرام، مندوب، مباح اور مکروہ وغیرہ کے بارے میں تلاش وجستجو سے کام لیا ہے کہ ان کے لیے شریعت کا کون سا حکم واجب ہے اور کون سا حکم حرام ہے وغیرہ۔ لیکن یہاں ”میری سنت“ سے مراد نبی کریم ﷺ کی جملہ احادیث ہیں، جن کی اتباع کرنا ضروری ہے یعنی سنت سے مراد محدثین کی اصطلاح ہے اور یہ فقہاءواصولیوں کی تعریف کو بھی شامل ہے۔

خلفائے راشدین سے مراد خلفائے اربعہ یعنی سیدنا ابو بکر صدیق، سیدنا عمر فاروق، سیدنا عثمان غنی اور سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امرِ خلافت اِنہی چاروں خلفاء میں محصور ہے اور ان کے سوا کوئی اور خلیفہ نہیں ہوگا، لہٰذا اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ان کے بعد ہی فوراً ملوکیت ومطلق العنانی کا دور شروع ہو گیا اور اسلامی نظامِ حکومت کا خاتمہ ہو گیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے دورِ خلافت کے بعد بھی کچھ جزئی خرابیوں کے ساتھ اسلامی نظامِ حکومت وخلافت ایک طویل مدت تک قائم رہی اور پوری شان وشوکت کے ساتھ اسلامی خلافت چلتی رہی۔

نیز خلفائے راشدین کی سنت سے مراد ان کے وہ طور طریقے ہیں، جن کو انھوں نے نبی کریم ﷺ کی اتباع اور سنتِ رسول کی روشنی میں انجام دیے، انھوں نے براہِ راست سنت پر عمل کیا یا سنت ہی کی روشنی میں مسائل کا استنباط کیا، اسی لیے حدیث میں ان کی صفت ”اَلرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ“ ”عارفین وعاملینِ حق اور ہدایت یافتہ“ بیان ہوئی ہے۔ البتہ اختلاف کی صورت میں نبی کریم ﷺ کی سنت وحدیث کو ہر حال میں تقدم حاصل ہوگی۔ درحقیقت خلفائے راشدین کی سنت وطریقے کی تین صورتیں ہیں:

”**اوّل:** جس بات پر خلفائے راشدین کا اتفاق ہے یا کسی ایک خلیفۂ راشد سے ثابت ہے اور دوسرے

خلفاء سے اس کی مخالفت ثابت نہیں ہے۔ **دوم:** جس بات پر خلفائے راشدین کا آپس میں اختلاف ہے۔ **سوم:** خلفائے راشدین میں سے کسی خلیفہ سے ایک بات ثابت ہے، لیکن دوسرے صحابۂ کرام کا اس سے اختلاف ہے۔ حدیثِ مذکور میں صرف اول الذکر مراد ہے۔ یاد رہے کہ قرآن و حدیث کے صریح خلاف ہر شخص کی بات مردود ہے چاہے کہنے والا کوئی بھی ہو، لیکن ہر ایرے غیرے کو خلاف قرار دینے کا حق نہیں بلکہ اس کے لیے سلفِ صالحین کی طرف ہی رجوع کرنا پڑے گا۔" [أضواء المصابیح ص:۲۲۳]

خطباتِ جمعہ کے علاوہ بھی نبی کریم ﷺ وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے، بالخصوص نماز کے بعد بھی وعظ کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا خطبہ مختصر، انتہائی جامع اور فصیح و بلیغ ہوا کرتا تھا کہ سننے والوں کی آنکھیں بہہ پڑتی تھیں نیز ضرورت پڑنے پر سامعین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے سوال بھی ہوتا تھا، لہٰذا حسبِ ضرورت و موقع یہ ساری باتیں جائز ہیں۔

اس حدیثِ نبوی سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ مؤثر و بلیغ وعظ کے لیے ضروری ہے کہ وقت اور حالات نیز اختصار اور جامعیت کی رعایت کی جائے، کتاب و سنت کے نصوص کا اہتمام ہو، آسان اور عام فہم اسلوب اپنایا جائے، مناسب الفاظ اور مربوط و چھوٹے جملوں کو استعمال کیا جائے۔ نیز دوسرے نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی قصوں، نبوی حالات اور سلفِ صالحین کے سچے واقعات بیان کیے جائیں اور ضعیف و موضوع احادیث اور من گھڑت واقعات کو بیان کرنے سے مکمل پرہیز کیا جائے۔

اللہ کی کتاب قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کی سنت حدیثِ نبوی اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی اور دینِ اسلام کی اصل بنیاد ہیں۔ ان دونوں کو مضبوطی سے تھامنے ہی میں ہر طرح کی بھلائی و کامیابی ہے۔ جو کوئی خلوصِ نیت اور یقینِ قلب کے ساتھ ان پر عمل کرے گا وہ کبھی گمراہ نہیں ہوگا اور ہر طرح کی فکر و عمل کی کج روی و گمراہی سے محفوظ رہے گا۔ حجت و عمل اور علم و یقین کا فائدہ دینے میں قرآن و حدیث دونوں برابر ہیں۔ حجت و عمل کے سلسلے میں ان کے درمیان تفریق کرنا اور دونوں میں سے کسی ایک کی حجیت کا انکار کرنا یا قرآن کو سنت کے بغیر سمجھنے کا دعویٰ کرنا گمراہی کی علامت اور اہلِ ہوس و بدعت کا شیوہ ہے، جس سے دوری اختیار کرنا ضروری ہے۔

كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ : یہ انتہائی جامع جملہ ہے اور اس میں دین کا نہایت اہم ضابطہ و قاعدہ بیان کر

دیا گیا ہے کہ جس سے کوئی بھی بدعت نکل نہیں سکتی ہے، لیکن بہتیرے مسلمان اپنی جہالت و نادانی یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس اہم ضابطے کو پس پشت ڈال کر نت نئی بدعات میں ڈوبے ہوئے ہیں، جب کہ دین میں ایجاد کیا ہوا ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی کا باعث اور باطل و مردود ہے، خواہ لوگ اسے اچھا سمجھیں اور خلوصِ نیت سے ادا کریں، کیوں کہ کسی بھی عمل کی قبولیت کے لیے عقیدے کی درستی اور اخلاصِ نیت کے ساتھ ساتھ اس کا سنت و شریعت کے موافق ہونا بھی ضروری ہے۔ بدعت کی تقسیم حسنہ اور سیئہ کی طرف کرنا بھی باطل ہے، کیوں کہ شریعت میں بدعتِ حسنہ نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہے اور یہ نبوی فرمان بھی وارد ہے: ((وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ)) "اور ہر گمراہی آگ (جہنم) میں لے جانے والی ہے۔" [صحیح / سنن نسائی: ۱۵۷۸] یعنی بدعت اپنے ایجاد کرنے والے کو اور اس پر عمل کرنے والے کو جہنم میں لے جانے والی ہے۔

راویِ حدیث کا تعارف:

عِرباض بن ساریہ سلمی رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو نجیح ہے اور یہ اصحابِ صفہ میں سے مشہور صحابی ہیں۔ انھوں نے شام میں سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے شامی کہلائے۔ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو اپنی محتاجی کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہو پانے کے سبب صدمے سے چور ہو کر آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہانے لگے اور ان کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی: ﴿وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنفِقُونَ﴾ "اور نہ ان لوگوں پر کہ جب بھی وہ تیرے پاس آئے ہیں، تاکہ تو انھیں سواری دے تو تو نے کہا میں وہ چیز نہیں پاتا جس پر تمھیں سوار کروں، تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی تھیں، اس غم سے کہ وہ نہیں پاتے جو خرچ کریں۔" [التوبة: ۹۲]

سن ۷۰ یا ۷۵ ہجری میں شام کے شہر حمص کے اندر آپ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اور آپ سے مروی احادیث کی تعداد تقریباً اکتیس (۳۱) ہے۔

دخولِ جنت کا سبب بننے والے اور جہنم سے دور کرنے والے اعمال

(۲۹) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قُلْتُ : يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَخْبِرْنِي بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدْنِي مِنَ النَّارِ؟ قَالَ : ((**لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ عَظِيْمٍ، وَإِنَّهُ لَيَسِيْرٌ عَلَى مَنْ يَسَّرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ : تَعْبُدُ اللَّهَ لَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا، وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ، وَتَصُومُ رَمَضَانَ، وَتَحُجُّ الْبَيْتَ**)) ثُمَّ قَالَ : ((**أَلَا أَدُلُّكَ عَلَى أَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ الصَّوْمُ جُنَّةٌ، وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ، وَصَلَاةُ الرَّجُلِ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ**)) ثُمَّ تَلَا : ﴿**تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ**﴾ حَتَّى بَلَغَ ﴿**يَعْمَلُونَ**﴾ ثُمَّ قَالَ : ((**أَلَا أُخْبِرُكَ بِرَأْسِ الْأَمْرِ وَعَمُوْدِهِ وَذِرْوَةِ سَنَامِهِ؟**)) قُلْتُ : بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ : ((**رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ، وَعَمُوْدُهُ الصَّلَاةُ، وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ**)) ثُمَّ قَالَ : ((**أَلَا أُخْبِرُكَ بِمَلَاكِ ذَلِكَ كُلِّهِ؟**)) فَقُلْتُ : بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ! فَأَخَذَ بِلِسَانِهِ وَقَالَ : ((**كُفَّ عَلَيْكَ هَذَا**)) قُلْتُ : يَا نَبِيَّ اللَّهِ! وَإِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهِ؟ فَقَالَ : ((**ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ عَلَى وُجُوهِهِمْ** -أَوْ قَالَ **عَلَى مَنَاخِرِهِمْ- إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ؟!**)) رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ : حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جو مجھے جنت میں داخل کر دے اور جہنم سے دور کر دے؟ آپ نے فرمایا: ”تم نے ایک بہت بڑی بات کے متعلق سوال کیا ہے، لیکن وہ ایسے شخص کے لیے آسان ہے جس پر اللہ اسے آسان فرما دے: تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، زکاۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو۔“ پھر فرمایا: ”کیا میں تمھیں خیر کے دروازوں کے متعلق نہ بتاؤں؟ روزہ ڈھال ہے، صدقہ گناہوں کو ایسے مٹا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اور رات کے دوران میں آدمی کا نماز پڑھنا [گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔]“ پھر آپ نے (سورۂ سجدہ کی آیتِ کریمہ) **تَتَجَافَى** سے **يَعْمَلُونَ** تک تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا: ”کیا میں تمھیں دین کی بنیاد، اس کے ستون اور اس کی چوٹی کے متعلق نہ بتاؤں؟“ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول! ضرور بتائیں؟ آپ نے فرمایا: ”دین کی بنیاد اسلام ہے، اس کا ستون نماز ہے اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔“ پھر فرمایا: ”کیا میں تمھیں ان سب کے اصل کے متعلق نہ بتاؤں؟“ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں، ضرور بتائیں اے اللہ کے نبی! آپ نے اپنی زبان کو پکڑ کر فرمایا: ”اسے روک لو۔“ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! ہم اس سے جو کلام کرتے ہیں کیا اس پر ہمارا مواخذہ ہو گا؟ آپ نے فرمایا: ”معاذ! تیری ماں تجھے گم پائے۔ لوگوں کو ان کی زبانوں کی کاشت ہی ان کے چہروں یا نتھنوں کے بل جہنم میں گرائے گی۔“

(اسے ترمذی[۲٦١٦]نے روایت کیااور فرمایا:یہ حدیث حسن صحیح ہے)

شرح و فوائد :

جُنَّةٌ :ڈھال، ذریعۂ حفاظت ج: جُنَن ، یعنی روزہ دنیا میں روزہ دار کے لیے گناہوں اور اللہ کے غضب سے بچنے کا ذریعہ ہے اور آخرت میں جہنم کی آگ سے ڈھال ہو گا۔ ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ : تمھاری ماں تمھیں گم پائے، حقیقت میں یہ بد دعائیہ جملہ ہے، مگر نبی ﷺ کا مقصود بد دعا کے بجائے انھیں متنبہ اور چوکنا کرنا ہے، جیسا کہ اہلِ عرب تعجب کے اظہار اور مخاطب کے انکار اور اس کی غفلت پر اسے ہوشیار اور چوکنا کرنے کے لیے یہ جملہ بولتے ہیں۔ حَصَائِدُ : حَصِيْدَةُ کی جمع ہے، معنی ہے: کھیتی، کاٹنے کے بعد بچی ہوئی جڑیں جن تک درانتی نہیں پہنچتی۔ حَصَائِدُ الأَلْسِنَة : فضول ولایعنی باتیں، خیر و بھلائی سے خالی بے کار و بے فائدہ کلام۔ ذُرْوَة/ذِرْوَة :ذال پر ضمہ اور کسرہ دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے۔ چوٹی، بلندی ج: ذُرًا۔ کہتے ہیں:هُوَ فِي ذُرْوَةِ النَّسَبِ :وہ اعلیٰ نسب کا ہے۔عَلَا ذُرْوَةَ الشَّرَفِ:وہ عزت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا۔ اَقْبَلَتْ ذُرَا اللَّيلِ:رات کا آغاز ہو گیا۔ سَنَام :اونٹ کے پیٹھ کا وہ حصہ جو بلند ہوتا ہے، جسے کوہان کہتے ہیں۔ کسی بھی چیز کا بالائی حصہ ،ج:اَسْنِمَةٌ. مِلَاكِ/ مَلَاكِ :میم پر کسرہ اور فتحہ دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے، کسی معاملہ کی اصل، روح، جوہر، خلاصہ۔ هَلْ :استفہام انکاری ہے، نفی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ يَكُبُّ : یہ ”كَبَّ يَكُبُّ كَبًّا“ (ن) سے فعل متعدی ہے، جس کے معنی کسی کو اُوندھا گرانا ہے اور اسے ”يُكِبُّ“ بھی پڑھا گیا ہے، جو ”أَكَبَّ يُكِبُّ إِكْبَابًا“ (افعال) سے ہے، أَكَبَّ عَلَى وَجْهِه: اوندھا گرنا، الٹا ہونا، سرنگوں ہونا، یہ مزید فیہ ہونے کے باوجود باب لازم ہے۔

اس حدیث کو بعض اہلِ علم نے منقطع قرار دیتے ہوئے ضعیف قرار دیا ہے، جب کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے ”حسن صحیح“ قرار دیا ہے، شیخ البانی رحمہ اللہ نے مجموعِ طرق کی بنیاد پر اسے حسن قرار دیا ہے۔ [ہدایۃ الرواۃ ۱/ ۷۱] اور مسند احمد کے محققین نے بھی طرق و شواہد کی بنیاد پر اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [مسند احمد مع التحقیق ۳٦/ ۳۴۵] اس روایت کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، مگر اسے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے تابعی کبیر جناب ابو وائل رحمہ اللہ کی وجہ سے منقطع قرار دینا بھی درست نہیں ہے۔ شیخ زبیر علی زئی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”اس حدیث کے راوی ابو وائل شقیق بن سلمہ

رحمہ اللہ (تابعی کبیر) سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت اٹھارہ سال کے نوجوان تھے۔ ابو وائل مدلس نہیں ہیں، لہٰذا سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے ان کی روایت اتصال پر محمول ہے۔ بعض الناس کا اسے منقطع قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ ابو وائل تک سند حسن لذاتہ ہے۔ قاری عاصم بن ابی النجود حسن الحدیث ہیں، جمہور محدثین کرام نے ان کی توثیق کی ہے۔ عاصم بن ابی النجود پر بعض محدثین کی جرح جمہور کے مقابلے میں ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔" [أضواء المصابیح ص:٦٣]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم امورِ دین کو جاننے اور اسے عملی زندگی میں داخل کرنے کے بڑے حریص تھے، یہی وجہ ہے کہ جب بھی انھیں موقع ملتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا سوال کرتے رہتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بڑی عمدگی سے ان کے سوال کا جواب دیتے اور ان کی حرص کو دیکھتے ہوئے مزید نفع بخش باتوں سے بہرہ ور فرماتے۔ اہلِ علم، عوام الناس اور طلبہ کو بھی علم و عمل کا حریص ہونا چاہیے۔

نیکیوں کا کام کرنے اور گناہوں سے بچنے کا مقصد جنت کا حصول اور جہنم سے نجات ہونی چاہیے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جنت میں داخل ہونا اور جہنم سے دور ہونا بہت بڑی چیز ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا اور کتابوں کا نزول فرمایا اور حقیقت میں ہمارا وجود اور ہماری زندگی کا راز یہی ہے کہ دار العمل والے اس دنیا میں رہ کر ہم کچھ ایسے کام کریں کہ ہماری ہمیشہ والی زندگی سنور جائے۔

نیکیوں کا حصول اور گناہوں سے دوری محض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہوتی ہے، لہٰذا نیکیوں کے حصول اور گناہوں سے بچاؤ کے لیے اللہ سے توفیق کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔

جنت میں پہنچانے اور جہنم سے دور کرنے والے اعمال ارکان و شرائعِ اسلام ہیں، ان کی ادائیگی و پابندی اور اللہ کے فضل و کرم ہی سے جنت حاصل ہوگی اور جہنم سے نجات ملے گی، اس سے معلوم ہوا کہ ارکانِ اسلام کی بڑی اہمیت ہے۔ جنت میں داخلہ دلانے والا اور جہنم سے بچانے والا سب سے بڑا عمل اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور شرک سے دوری اختیار کرنا ہے۔ شرک ایسا خطرناک عمل ہے اور اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے انسان جنت میں داخل نہیں ہو سکتا ہے اور نہ اس کی مغفرت ہو سکتی ہے۔[شرک سے متعلق مزید تفصیل حدیث نمبر:۴۲ کے تحت آرہی ہے۔]

نفلی روزے، صدقات اور نمازِ تہجد خیر و نیکی کے دروازے یعنی دنیا میں کامیابی اور آخرت میں نعمتوں

کے حصول کے دروازے ہیں اور ان کے زبردست فوائد ہیں، اس لیے حتی المقدور ان پر عمل کرتے رہنا چاہیے۔ رات کی نماز کے متعلق اس حدیث میں جو یہ بات کہی گئی ہے کہ: وَصَلَاةُ الرَّجُلِ مِنْ جَوْفِ اللَّيْلِ اور آدھی رات کے وقت آدمی کا نماز (تہجد) پڑھنا تو عورتیں بھی اس میں شامل ہیں، یہاں چوں کہ مخاطب سوال کرنے والے مرد تھے اس لیے ان کی مناسبت سے مرد کا ذکر کیا گیا یا یہ کہ تغلیب کے طور پر رجل کا ذکر کیا گیا ہے۔ بہرحال قیام اللیل خیر کا ایک عظیم دروازہ ہے اور رات کی جس گھڑی میں یہ نماز ادا کی جاتی ہے اس وقت بندۂ مومن سب سے زیادہ اللہ کے قریب ہوتا ہے۔ [صحیح / سنن ترمذی:۳۵۷۹] اور نبوی فرمان سے یہ بھی ثابت ہے کہ فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز ہے۔ [دیکھیے: صحیح مسلم:۱۱۶۳] رات ہی کی نماز کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے آپ ﷺ نے بطور دلیل قرآن کریم کی اس آیتِ کریمہ کی تلاوت فرمائی:

﴿تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ ٱلْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ﴾ ”ان کے پہلو بستروں سے جدا رہتے ہیں، وہ اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور طمع کرتے ہوئے پکارتے ہیں اور ہم نے انھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے، اس عمل کی جزا کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے۔“ [السجدۃ:۱۶-۱۷]

تمام دینی کاموں کے لیے اسلام سر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہاں اسلام سے مراد کلمۂ شہادتین کا اقرار اور اس کے تقاضے کو پورا کرنا ہے۔ جس طرح جسم کا وجود بغیر سر کے نہیں رہ سکتا ہے، ویسے ہی توحید ورسالت کے بغیر دین کے کسی کام کا وجود باقی نہیں رہتا ہے اور اس کے بغیر دین کی حیثیت وہی ہوتی ہے، جو سر کاٹنے کے بعد انسان کی رہتی ہے۔ اس کے بعد سب سے اہم عبادت نماز ہے، اسی لیے اسے دینِ اسلام کا ستون قرار دیا گیا ہے اور اس کے بعد جہاد کو دینِ اسلام کے کوہان کی بلندی قرار دیا گیا ہے، جس سے اس کی عظیم الشان اہمیت وعظمت ثابت ہوتی ہے۔ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل میں جہاد کا ارادہ رکھے کہ جب بھی موقع میسر ہوگا اور حالات اجازت دیں گے تو میں جہاد کروں گا اور اگر کسی کے اندر یہ نیت وارادہ نہیں ہے تو اس کی موت نفاق کے ایک حصے پر ہوگی۔ [دیکھیے: صحیح مسلم:۱۹۱۰]

اور ان سب امورِ خیر کی جڑ زبان کی حفاظت ہے، کیوں کہ روزہ وصدقہ اور تہجد وغیرہ کا مکمل ثواب اسی وقت ملے گا جب زبان کو گالی گلوچ، بے ہودہ گوئی، ایذا رسانی، تشہیر بازی اور لایعنی وبے کار قسم کی باتوں سے محفوظ رکھا جائے گا۔ جب کہ بہتیرے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ زبان کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں، جو نامۂ اعمال کو خوب خوب سیاہ کرتی ہے اور منھ کے بل جہنم میں ڈالے جانے کا سبب بنتی ہے۔ یوں تو انسانی جسم کے سبھی اعضاء بڑے معزز ومکرم ہیں اور اپنی جگہ پر نہایت مناسب وپرفیکٹ ہیں کہ اگر ان میں کوئی ظاہری کمی ہو جائے تو عیب دار ہو جائیں گے۔ تاہم تمام انسانی اعضاء میں زبان کو بڑی اہمیت حاصل ہے، آدمی بگڑے ہوئے معاملات کو بھی اپنی میٹھی زبان کے ذریعہ سلجھا سکتا ہے، اس کے بہتر استعمال سے اس کی عقبیٰ بن سکتی ہے اور غلط استعمال نیز کنٹرول میں نہ رکھنے کی صورت میں آخرت برباد بھی ہو سکتی ہے۔ حقیقی مسلمان وہی ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور وہ کسی کی ایذا رسانی کا سبب نہ بنے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ)) ”مسلمان وہی ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔“ [صحیح بخاری: ۱۰، صحیح مسلم: ۴۱]

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ نجات کس چیز میں ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَمْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ، وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ، وَابْكِ عَلَى خَطِيئَتِكَ)) ”اپنی زبان کو اپنے قابو میں رکھو، اپنے گھر کو کافی سمجھو اور اپنے گناہوں پر روتے رہو۔“ [صحیح/سنن ترمذی: ۲۴۰۶، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۸۸۸]

معلوم یہ ہوا کہ زبان کی حفاظت کرنا اور گالی گلوچ، بے ہودہ گوئی، لعن طعن، فحش کلامی اور زبان درازی سے پرہیز کرنا ایک صاحبِ ایمان شخص کے لیے بہت ضروری ہے۔ یاد رہے ہماری زبان سے جو بھی بات اور جو کوئی لفظ ادا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے معزز فرشتے اس کا ریکارڈ تیار کرتے رہتے ہیں اور ہمیں اپنی زبان سے ادا کی ہوئی چھوٹی بڑی تمام باتوں کا ایک دن حساب کتاب دینا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَّا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ ”وہ یعنی انسان کوئی بھی بات نہیں بولتا، مگر اس کے پاس ایک تیار نگراں ہوتا ہے۔“ [ق: ۱۸]

✿ ✿ ❁ ✿ ✿

حقوق و حدودِ الٰہی کی پابندی ضروری ہے

(۳۰) عَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ جُرْثُومِ بْنِ نَاشِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا، وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا، وَحَرَّمَ أَشْيَاءَ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا، وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ رَحْمَةً لَكُمْ غَيْرَ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا**)) حَدِيثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَغَيْرُهُ

ابو ثعلبہ خشنی جُرثوم بن ناشر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے کچھ واجبات فرض کی ہیں، انھیں ضائع نہ کرو اور کچھ حدود مقرر کیے ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزیں حرام کی ہیں ان میں نہ پڑو اور اس نے تم پر رحم کرتے ہوئے بغیر کسی بھول کے کچھ چیزوں سے خاموشی اختیار کی ہے، اس لیے ان کے بارے میں بحث و کرید نہ کرو۔“ (یہ حدیث حسن ہے، اسے دار قطنی [۴/۱۸۴، حاکم ۴/۱۱۵ اور بیہقی ۱۰/۱۲] وغیرہ نے روایت کیا ہے۔)

شرح و فوائد :

اس حدیث کی سند میں انقطاع پایا جاتا ہے، اس لیے اس کی سند ضعیف ہے۔ ابو ثعلبہ الخشنی رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے تابعی امام مکحول رحمہ اللہ کا سماع ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے، امام مسلم بن الحجاج رحمہ اللہ اپنی صحیح [برقم: ۱۹۳۱] میں ان سے جو روایت لائے ہیں تو وہ اصل روایت ذکر کرنے کے بعد متابعت میں لائے ہیں۔ اس لیے زیرِ مطالعہ حدیث کی سند کے متصل ہونے میں شک ہونے کی بنیاد پر سنداً یہ روایت ضعیف قرار پائے گی۔ علامہ البانی اور حافظ زبیر علی زئی رحمہما اللہ وغیرہ نے مذکورہ سبب کی بنیاد پر اس کی تضعیف کی ہے۔ [دیکھیے: ہدایۃ الرواۃ ۱/۱۴۴، أضواء المصابیح ص: ۲۵۷] اور علامہ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے اس کے وجہ ضعف کی دوسری وجہ یہ ذکر کی ہے کہ اس کے مرفوع اور موقوف ہونے میں بھی اختلاف ہے، کیوں کہ مکحول عن ابی ثعلبہ کے طریق سے اسے موقوفاً بھی روایت کیا گیا ہے، جب کہ امام دار قطنی نے اس کے مرفوع ہونے کو ترجیح دی ہے اور اسی کو زیادہ مشہور قرار دیا ہے، لیکن اس کے باوجود بھی امام نووی رحمہ اللہ نے اور ان سے پہلے ابو بکر السمعانی رحمہ اللہ نے اپنے امالی میں اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ [دیکھیے: جامع العلوم والحکم لابن رجب الحنبلی ۲/۱۵۰] علامہ بوصیری نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے نیز حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ عراقی نے اسے حسن کہا ہے اور

علامہ ابن الصلاح نے تو اسے صحیح کہا ہے۔ [الفتوحات الربانیۃ ۷/ ۳۶۵] اس حدیث کو حسن یا صحیح قرار دینے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس مفہوم میں دیگر صحیح احادیث موجود ہیں یعنی اس کی معنوی متابعت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابو الدرداء عویمر بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا أَحَلَّ اللَّهُ فِيْ كِتَابِهِ فَهُوَ حَلاَلٌ، وَمَا حَرَّمَ فَهُوَ حَرَامٌ، وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ عَافِيَةٌ، فَاقْبَلُوا مِنَ اللَّهِ الْعَافِيَةَ فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُنْ نَسِيًّا، ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْآيَةَ : ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾))

"اللہ نے جو کچھ اپنی کتاب میں حلال کیا ہے وہ حلال ہے اور جسے حرام کیا ہے وہ حرام ہے اور جس سے خاموشی اختیار فرمائی ہے وہ معاف ہے، اللہ کی معافی کو قبول کرو، اس لیے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کوئی چیز بھول جائے۔" پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ [مریم: ۶۴] "اور تیرا رب کبھی بھولنے والا نہیں۔" [اسے امام حاکم: ۲/ ۳۷۵، ح: ۳۴۱۹، بزار: ۴۰۸۷، امام طبرانی (نے مسند الشامیین: ۲۱۰۲، میں) اور امام دارقطنی ۲/ ۱۳۷ وغیرہ نے معمولی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام حاکم و ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے، امام ہیثمی اور شیخ البانی وغیرہ نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔ دیکھیے: سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۲۲۵۶، التعلیقات الرضیۃ: ۳/ ۲۴]

نیز سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھی، پنیر اور پوستین کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ((الْحَلَالُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ، وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ، وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ مِمَّا عَفَا عَنْهُ)) "حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے اور جس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے وہ معاف ہے۔" [حسن / سنن ترمذی: ۱۷۲۶، سنن ابن ماجہ: ۳۳۶۷، سنداً یہ حدیث بھی ضعیف ہے، اس میں سیف بن ہارون سخت ضعیف راوی ہے، لیکن شواہد کی بناء پر اسے حسن قرار دیا گیا ہے۔ دیکھیے: تراجع الألبانی: ۴۲۸]

اسی طرح سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً مروی ہے کہ: "كَانَ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يَأْكُلُونَ أَشْيَاءَ وَيَتْرُكُونَ أَشْيَاءَ تَقَذُّرًا، فَبَعَثَ اللَّهُ تَعَالَى نَبِيَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَنْزَلَ كِتَابَهُ، وَأَحَلَّ حَلَالَهُ، وَحَرَّمَ حَرَامَهُ، فَمَا أَحَلَّ فَهُوَ حَلَالٌ، وَمَا حَرَّمَ فَهُوَ حَرَامٌ، وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ عَفْوٌ، وَتَلَا : ﴿قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا﴾ [الأنعام : ١٤٥] إِلَى آخِرِ الْآيَةِ."

"زمانۂ جاہلیت والے کچھ چیزوں کو کھاتے تھے اور کچھ چیزوں کو گھن کی وجہ سے چھوڑ دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ

نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث فرمایا، اپنی کتاب نازل کی، حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دیا، پس اللہ نے جسے حلال کیا ہے وہ حلال ہے اور جسے حرام کر دیا وہ حرام ہے اور جس سے سکوت اختیار فرمایا وہ معاف ہے۔ پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت: ﴿قُلْ لا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا...﴾ "کہہ دو میں اپنی طرف نازل کی گئی وحی میں حرام نہیں پاتا۔" آخر تک تلاوت فرمائی۔ [صحیح الإسناد / سنن أبو داود: ۳۸۰۰]

زیرِ مطالعہ روایت میں بیان ہوئے امور کا بیان کتاب و سنت کے بیش تر نصوص میں ہوا ہے۔ تمام تر دینی احکام اس روایت میں مذکور چاروں قسموں کے تحت آجاتے ہیں: فرائض، محرمات، حدود اور مسکوت عنہ۔ گویا دین کے تمام اصول و فروع کو اس ایک حدیث کے اندر جمع کر دیا گیا ہے۔

فرائض: وہ شرعی احکام وواجبات جنھیں اللہ رب العالمین نے اپنی کتاب قرآن کریم کے ذریعہ یا نبی کریم ﷺ کی حدیثِ مبارکہ کے ذریعہ مکلف بندوں پر لازم وضروری قرار دیا ہے کہ جن کا ادا کرنا واجب ہے اور نہ ادا کرنا گناہ کا باعث ہے۔ بعض فرائض امت کے تمام مکلف افراد پر فرض ہیں اور ہر فرد سے اس کا مطالبہ ہے یعنی وہ فرضِ عین کی حیثیت رکھتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج، زکاۃ وغیرہ اور بعض فرائض ایسے ہیں کہ امت کے چند افراد اگر اسے انجام دے لیں تو باقی دیگر لوگوں کی طرف سے وہ ساقط ہو جائیں گے اور اگر کوئی فرد نہ انجام دے تو سبھی لوگ گناہ گار ہوں گے، جیسے نمازِ جنازہ اور اذان و اقامت وغیرہ، فرض کی اس قسم کو فرضِ کفایہ کہتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا مطلب ہی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ جن باتوں کا حکم دیں انھیں بجالایا جائے، انھیں چھوڑ کر یا ان کے ارکان و شروط میں کمی وبیشی کر کے ضائع نہ کیا جائے اور جن سے روکیں ان کے قریب بھی نہ جایا جائے۔

شرعی نصوص میں فرض کے لیے واجب کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، عمل کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بعض فقہاء نے اصطلاحی طور پر دونوں کے درمیان تفریق کی ہے کہ جو دلیل قطعی یعنی کتاب اللہ سے ثابت ہو وہ فرض ہے اور جو دلیل ظنی یعنی صحیح حدیث سے ثابت ہو وہ واجب ہے، لیکن یہ تفریق درست نہیں ہے، کیوں کہ شرعی نصوص میں ایسی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی ہے اور نبی کریم ﷺ کو اللہ کی جانب سے فرض وواجب اور حلال وحرام قرار دینے کا اختیار و حق حاصل ہے۔

حدود: یہ حَدٌّ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں دو چیزوں کے درمیان پائی جانے والی ایسی رکاوٹ جو

انھیں باہم ملنے سے روک دے اور یہ منع کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے، اسی لیے زنا وغیرہ کی سزاؤں کا نام حد رکھا گیا ہے، کیوں کہ یہ سزائیں انسان کو اُن جرائم کے ارتکاب سے روکتی ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں حدود سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ شرعی احکام وواجبات ہیں جنھیں اس نے بندوں پر اوامر ونواہی کے ذریعہ مقرر کیا ہے اور جن کی حلت و حرمت کو بیان کرکے دونوں کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کر دیا ہے، ان شرعی اَوامر ونواہی سے تجاوز کرنا یعنی حدود الٰہی کو تجاوز کرنا قطعاً درست نہیں ہے۔ حدودِ الٰہی سے تجاوز کرنے کا مطلب ہے شرعی ضابطے کو چھوڑ کر اپنی من مانی کرنا اور شرعی احکام کی مخالفت کرنا، شریعت نے جن کاموں کا حکم دیا ہے اس سے آگے بڑھنا اور جن کاموں سے روکا ہے انھیں انجام دینا۔ اللہ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے والا دراصل دنیا و آخرت کی فلاح و اصلاح پر مبنی حدودِ الٰہی کو پھلانگ کر خود اپنا خسارہ کرتا ہے اور اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہوتا ہے اور جہنم میں رسوا کن عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿تِلْكَ حُدُودُ ٱللَّهِ ۚ وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ يُدْخِلْهُ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ ۝ وَمَن يَعْصِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُۥ يُدْخِلْهُ نَارًا خَٰلِدًا فِيهَا وَلَهُۥ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾ ”یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے وہ اسے جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدوں سے تجاوز کرے وہ اسے آگ میں داخل کرے گا، ہمیشہ اس میں رہنے والا ہے اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔“ [النساء:١٣-١٤]

دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ﴾ ”اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو یقیناً اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔“ [الطلاق:١]

اللہ نے جن کاموں کو حرام قرار دے کر ان کی حدیں مقرر کر دی ہیں، بندوں کو ان حدود سے تجاوز کرنے اور حرام کاموں کے قریب بھی جانے سے روکا گیا ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿...تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا...﴾ ”یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو ان کے قریب نہ جاؤ۔“ [البقرۃ:١٨٧]

دوسری جگہ فرمایا: ﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ ''یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو ان سے آگے مت بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا تو یہی لوگ ظالم ہیں۔'' [البقرۃ:۲۲۹]

اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کو حرام قرار دیا ہے ان کے قریب جانے سے روکا ہے اور ''قریب جانے'' کے لفظ میں نفسِ فعل کی حرمت اور اس فعلِ حرام تک پہنچانے والے وسائل و ذرائع کی حرمت سب شامل ہیں۔ بندۂ مومن تمام محرمات کو ترک کرنے، حتی الامکان ان سے دور رہنے اور ان تمام اسباب کو ترک کرنے پر مامور ہے، جو ان محرمات کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

شرعی اعتبار سے حدود کا اطلاق ان عقوبات اور سزاؤں پر بھی ہوتا ہے، جنھیں بعض حرام کاموں کے ارتکاب کرنے والوں پر نافذ کیا گیا ہے، جیسے غیر شادی شدہ شخص کے زنا کی حد سو کوڑے اور ایک سال کی دربدری اور شادی شدہ شخص کے زنا کی حد رجم ہے، بہتان تراشی کی حد اسّی کوڑے اور چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ چوری کرنے کی حد ہاتھ کاٹنا ہے اور شراب نوشی کی حد چالیس کوڑے ہیں۔ ان سزاؤں کا نام حدود اس لیے رکھا گیا ہے کہ یہ ان قابلِ سزا جرائم کو دوبارہ انجام دینے اور دوسروں کو بھی اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے سے روک دیتی ہیں۔

محرمات: اس سے مراد تمام تر ممنوعات و نواہی، معاصی اور اس کی تمام تر انواع و اقسام ہیں۔ معصیت و نافرمانی میں پڑنے کے بجائے اس کے قریب بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔ کتاب و سنت میں جن امور کو صراحت کے ساتھ حرام قرار دیا گیا ہے یا جن امور سے شدت و وعید کے ساتھ روکا گیا ہے وہ سب کے سب حرام ہیں اور جن امور سے کسی وعید کے بغیر محض روکا گیا ہے ان سے بچنا بھی ضروری ہے، لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر حرام کا لفظ نہ بولا جائے۔ کتاب و سنت کے ماہر علماء ہی کو کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کا حکم لگانا چاہیے، کیوں کہ علم کے بغیر حلت یا حرمت کا حکم لگانا سخت وعید کا باعث ہے۔ قطعی طور پر حرام کیے گئے بہت سے امور کا ذکر کتاب و سنت میں موجود ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے بعض حرام کاموں کے بارے میں فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ

الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ ”کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کہو جو تم نہیں جانتے۔“ [الأعراف:۳۳]

جن سے نکاح کرنا حرام ہے، ان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُم مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُم مِّنْ نِّسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُم بِهِنَّ فَإِنْ لَّمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ ”حرام کی گئیں تم پر تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں اور تمھاری بیویوں کی مائیں اور تمھاری پالی ہوئی لڑکیاں، جو تمھاری گود میں تمھاری ان عورتوں سے ہیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، پھر اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور تمھارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمھاری پشتوں سے ہیں اور یہ کہ تم دو بہنوں کو جمع کرو، مگر جو گزر چکا۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔“ [النساء:۲۳]

حرام تجارت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ﴿...وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ...﴾ ”اور اللہ نے بیع یعنی تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔“ [البقرة:۲۷۵]

نیز بعض حرام چیزوں کی تجارت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ((...إِنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيرِ وَالْأَصْنَامِ...)) ”بے شک اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مُردار، سور اور بتوں کی تجارت کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔“ [بخاری:۲۲۳۶، مسلم:۱۵۸۱]

کھانے پینے کی حرام چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ

وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَن تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ۚ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ...﴾ ”تم پر مردار حرام کیا گیا ہے اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے والا جانور اور جسے چوٹ لگی ہو اور گرنے والا اور جسے سینگ لگا ہو اور جسے درندے نے کھایا ہو، مگر جو تم ذبح کرلو اور جو تھانوں پر ذبح کیا گیا ہو اور یہ کہ تم تیروں کے ساتھ قسمت معلوم کرو۔ یہ سراسر نافرمانی ہے۔...“ [المائدۃ:۳]

مسکوت عنہ: اللہ تعالیٰ نے محض اپنی رحمت و مہربانی سے بعض امور و معاملات سے متعلق خاموشی اختیار کی ہے اور ایسا صرف اور صرف بندوں کی آسانی کے لیے کیا ہے، لہٰذا جن امور کے بارے میں شریعت میں خاموشی اختیار کی گئی ہے، ان سے متعلق بہت زیادہ بحث و کرید نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی کسی معاملے میں بلاضرورت بال کی کھال اتارنی چاہیے، اس لیے کہ جن امور کے حلال و حرام ہونے کے بارے میں کوئی حکم موجود نہیں ہے، ان میں بہت زیادہ بحث و کرید کرنے کی وجہ سے ان کے حلال یا حرام ہونے کا پختہ اعتقاد انسان کے دل و دماغ میں راسخ ہو سکتا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی علم و حکمت کے تحت ان سے خاموشی اختیار کی ہے اور ایسے امور معاف کر دیے ہیں یعنی ان کے کرنے یا نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مسکوت عنہ کو دلیل بنا کر دین میں کمی و بیشی کرنا اور شریعت سازی کرتے ہوئے بدعت ایجاد کرنا جائز ہے۔ دین و شریعت میں بدعات کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ ان سے خاموشی اختیار کی گئی ہے بلکہ یہ سب کچھ حرام ہے، جیسا کہ کتاب و سنت کے واضح دلائل سے معلوم ہوتا ہے۔

اس بات پر اہل علم کا اجماع و اتفاق ہے کہ حلت و حرمت سے متعلق شرعی نصوص پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء اور معاملات کے بارے میں اصل یہ ہے کہ وہ جائز و مباح ہیں جب تک کہ ان کی حرمت و ممانعت سے متعلق کوئی شرعی دلیل نہ پائی جائے اور عبادات کے تعلق سے خاص دلیل کا ہونا ضروری ہے، کوئی بھی عبادت اگر دلیل سے خالی ہو گی تو وہ بدعت قرار پائے گی۔

محدثین و محققین، فقہاء و مجتہدین اہلِ علم کا کتاب و سنت کے مسائل و احکام پر بحث و تحقیق کرنا اور

پیش آمدہ نئے نئے مسائل پر بحث و جستجو اور تحقیق کرنا ممنوع بحث و کرید میں داخل نہیں ہے، تاہم علم و فقاہت کے بغیر محض ادعائے علم کے بل بوتے پر دینی مسائل کے بارے میں کلام کرنا اور نئے نئے مسائل پر بحث و گفتگو کرنا قطعاً درست نہیں ہے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

راویِ حدیث کا تعارف :

ابو ثعلبہ خُشَنی شامی رضی اللہ عنہ اپنی کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ ان کے نام کے بارے میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے کم و بیش چالیس اقوال مروی ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے یہاں اختلافات کی طرف اشارہ کیے بغیر بالجزم ان کا نام جُرثوم بن ناشر لکھاہے تاہم دوسرے باب میں یہ وضاحت کی ہے کہ ان کے اور ان کے باپ کے نام کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ قبیلہ خزاعہ سے ان کا تعلق تھا اور اسی کی ایک شاخ خُشَین بن نَمِر کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے خُشَنی کہلائے اور یہ بڑا معروف قبیلہ تھا۔ صلح حدیبیہ اور بیعتِ رضوان وغیرہ میں شریک تھے اور جب علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جنگ چھڑی تو یہ کسی کی جانب سے نہیں لڑے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ان کی قوم کی طرف دعوت کے لیے بھیجا تھا تو وہ سب اسلام لے آئے تھے۔ ۷۵ ہجری میں ان کی وفات ہوئی جب کہ وہ سجدے کی حالت میں تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ۴۰ ہجری کے بعد خلافتِ معاویہ کے اوائل میں ان کی وفات ہوئی۔ ان سے کم و بیش چالیس (۴۰) حدیثیں مروی ہیں۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

اللہ اور لوگوں کی نگاہوں میں محبوب بننے کا گر

(۳۱) عَنْ أَبِي الْعَبَّاسِ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ : يَا رَسُولَ اللَّهِ! دُلَّنِي عَلَى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِيَ اللَّهُ وَأَحَبَّنِيَ النَّاسُ؛ فَقَالَ : ((**اِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللَّهُ، وَازْهَدْ فِيْمَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ**)) حَدِيْثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَغَيْرُهُ بِأَسَانِيدَ حَسَنَةٍ

ابو العباس سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے ایسے عمل کی رہنمائی فرمائیں کہ جب میں اسے انجام دوں تو اللہ مجھے پسند فرمائے اور لوگ بھی مجھے پسند کریں؟ تو آپ نے فرمایا: ”دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ اللہ تم سے محبت کرے گا اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے نیاز ہو جاؤ تو لوگ بھی تم سے محبت کریں گے۔“ (یہ حدیث حسن ہے، اسے ابن ماجہ (ح: ۴۱۰۲) وغیرہ نے حسن سند سے روایت کیا ہے۔)

شرح و فوائد :

اس حدیث کی سند انتہائی ضعیف ہے، کیوں کہ اس کی سند میں ابو سعید خالد بن عمرو قرشی اُموی کوفی انتہائی ضعیف راوی ہے، اسے جھوٹ سے متہم کیا گیا ہے اور اس کی طرف وضع حدیث کی نسبت کی گئی ہے، لیکن اس روایت کی کئی متابعات و شواہد ہیں اور جید سند کے ساتھ ایک مرسل روایت بھی موجود ہے، جس کی بنا پر شیخ البانی رحمہ اللہ نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، اس لیے سنداً ضعیف ہونے کے باوجود یہ روایت صحیح اور قابلِ عمل ہے۔ [شیخ البانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: **وجملة القول أن الحديث صحيح بهذا الشاهد المرسل، والطرق الموصولة المشار إليها. والله أعلم** حدیث کی سند پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: **سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۹۴۴**]

اس مختصر سی جامع حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے جامع عمل کی طرف رہنمائی فرمائی ہے، جس کی وجہ سے بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ بن سکتا ہے اور اس عمل کے ذریعہ لوگوں کی محبت بھی حاصل کر سکتا ہے اور وہ عمل زہد اختیار کرنا ہے۔

آخرت سے غافل کرنے والے تمام تر فضولیات سے پرہیز کرتے ہوئے ایسے تمام امور کو ترک کر

دینا جو دین و آخرت کے لیے مفید نہ ہوں زہد ہے۔ زہد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی دنیا اور اہلِ دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو کر رَہبانیت اختیار کرلے۔ اسلام میں ترکِ دنیا اور رہبانیت کو حرام قرار دیا گیا ہے، شریعت کے حدود و دائرے میں رہ کر حلال روزی تلاش کرنا، اللہ تعالی سے رزق میں کشادگی طلب کرنا اور اللہ سے اس کی امید رکھنا، مال و دولت کے حصول کی کوشش کرنا اور لوگوں سے میل جول رکھنا قطعاً زہد کے منافی نہیں ہے، کیوں کہ شرعی طور پر یہ جائز و مطلوب ہے کہ آدمی حرام کمائی سے پرہیز کرے اور حلال کمائی پر اکتفا کرے، ہاں اس سے بڑھ کر ایک چیز ہے کہ آدمی دنیاوی امور کے ساتھ چمٹ کر نہ رہ جائے، نہ اسے مال و دولت کی حرص ہو، نہ وہ جاہ و منصب کا طلب گار ہو، نہ وہ مقام و مرتبے کی خواہش رکھے، بلکہ ہمہ وقت احکامِ الٰہی کی پاسداری کو ملحوظِ خاطر رکھے، حلال و حرام کا پاس ولحاظ رکھے اور دنیا و اہلِ دنیا سے اتنا ہی تعلق رکھے جتنے سے اس کی زندگی کا گزارہ ہو جائے یہی زہد و ورع ہے اور یہ اللہ کی محبت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ و نسخہ ہے۔ انسان کے اندر اگر یہ خوبی پیدا ہو جائے تو وہ اللہ کا محبوب بندہ قرار پائے گا اور دنیا کی ساری چیزیں اپنی چمک دمک کے باوجود اسے ہیچ نظر آئیں گی۔ جو شخص دنیا سے بے رغبتی اختیار کرے گا لازمی طور پر اس کی رغبت آخرت کے بارے میں ہوگی اور جب آخرت کی رغبت پیدا ہوگی تو وہ اللہ کی رضا و خوشنودی والی راہوں کو اختیار کرے گا، حلال آمدنی اور حلال ذرائع سے کمائی کرنے پر اکتفا کرے گا، حرام امور سے بچے گا اور لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے دوری اختیار کرے گا اور یہ چیز اللہ کے نزدیک محبوب بننے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اس سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوگا کہ وہ لوگوں کی نگاہوں میں محبوب اور معزز ہو جائے گا۔

دنیا سے بے رغبتی یا زہد اختیار کرنے کے بارے میں کچھ لوگ افراط و تفریط کے شکار ہوتے ہیں، چناں چہ بہت سے لوگ دنیا کمانے میں اس قدر مست و مگن ہو جاتے ہیں کہ انھیں حلال و حرام کی پروا نہیں رہتی اور وہ آخرت کو بھول کر دنیا ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیتے ہیں، مال و دولت کے پجاری بن کر صرف اسی کے پیچھے لگے رہتے ہیں، ایسے لوگ خائب و خاسر ہوتے ہیں اور ہلاکت ان کا مقدر ہوتی ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تَعِسَ عَبْدُ الدِّينَارِ وَالدِّرْهَمِ وَالْقَطِيْفَةِ وَالْخَمِيْصَةِ، إِنْ أُعْطِيَ رَضِيَ، وَإِنْ لَمْ يُعْطَ لَمْ يَرْضَ)) "ہلاک ہو جائے دینار و درہم، عمدہ ریشمی کمبل و چادر کا بندہ کہ اگر اسے دیا جائے تو وہ خوش

ہو جاتا ہے اور اگر نہ دیا جائے تو ناخوش رہتا ہے۔" [صحیح بخاری:۲۸۸۶، ۶۴۳۵]

آخرت کی دائمی زندگی کے بالمقابل دنیا محض کھیل تماشا ہے اور اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پَر برابر بھی نہیں ہے، سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللَّهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ، مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ))

"اگر دنیا اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پَر کے برابر ہوتی تو وہ کسی کافر کو اس سے ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتا۔" [صحیح / سنن ترمذی:۲۳۲۰، سنن ابن ماجہ:۴۱۱۰، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ:۶۸۶، ۹۴۳]

جب کہ مذکورہ گروہ کے برخلاف کچھ لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے نفس پر بے جا سختی کرتے ہیں، حلال چیزوں کو بھی اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں اور محتاجی وقلاشی اور علائقِ دنیا سے دوری ہی کو زہد وورع کا نام دے کر مکمل طور پر دنیا اور اہلِ دنیا سے بے زار ہو جاتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وطریقے کے خلاف ہے، آدمی پر اس کے نفس کا بھی حق ہے کہ اسے آرام دیا جائے اور کھانے پینے کی چیزوں سے دوری اختیار کر کے اسے مشقت میں نہ ڈالا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كُلُوا وَاشْرَبُوا، وَالْبَسُوا وَتَصَدَّقُوا فِي غَيْرِ إِسْرَافٍ وَلَا مَخِيْلَةٍ)) "اسراف اور تکبر کے بغیر کھاؤ اور پیو، پہنو اور صدقہ کرو۔" [صحیح بخاری، کتاب اللباس قبل الحدیث:۵۷۸۳، تعلیقًا]

ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے تین افراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق جانکاری حاصل کرنے کے لیے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے گھروں کی طرف آئے، جب انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روزانہ کا معمول معلوم ہوا تو انھوں نے اسے کم سمجھا اور کہنے لگے کہ ہمارا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا مقابلہ ہے؟ ان کے تو اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے ہیں، ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ میں تو ہمیشہ پوری پوری رات نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا کبھی بے روزہ نہیں رہوں گا اور تیسرے نے کہا کہ میں تو عورتوں سے جدا رہوں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ گویا انھوں نے محض اپنی زہد وعبادت کی خاطر مشروع حد سے تجاوز کرنا چاہا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ان سے مخاطب ہوئے:

((أَنْتُمُ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَا وَاللَّهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لَكِنِّي أَصُومُ

وَأُفْطِرُ، وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي)) ''تم لوگوں نے ایسی اور ایسی باتیں کی ہیں؟ دیکھو، اللہ کی قسم! میں تم لوگوں سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں، لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، میں نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، جس نے میری سنت سے بے رغبتی کی وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔'' [صحیح بخاری:۵۰۶۳، صحیح مسلم:۱۴۰۱]

معلوم یہ ہوا کہ زہد وورع کے لیے حلال اشیاء کو ترک کرنا، متعلقین سے منہ موڑنا نبوی طریقے کے خلاف ہے، حلال اشیاء اور علائقِ دنیا کو نہ تو سرے سے ترک کرنا درست ہے اور نہ اس میں اسراف کرنا اور نہ حد سے تجاوز سے کرنا درست ہے۔

ہر شخص کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی نگاہوں میں محبوب رہے، لوگ اسے محبوب و عزیز رکھیں اور اس سے نفرت نہ کریں، یہ کوئی معیوب خواہش نہیں ہے اور یہ چیز حاصل کرنے کی کوشش بھی بری نہیں ہے، بلکہ بجا طور پر یہ ایک مستحب خواہش ہے اور اس کے لیے کوشش کرنا بھی درست ہے، بلکہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنا تو واجب ہے اور ایمان کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔
سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى تُؤْمِنُوا، وَلَا تُؤْمِنُوا حَتَّى تَحَابُّوا، أَوَلَا أَدُلُّكُمْ عَلَى شَيْءٍ إِذَا فَعَلْتُمُوهُ تَحَابَبْتُمْ؟ أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَهُمْ)) ''تم جنت میں داخل نہیں ہوگے جب تک کہ مومن نہ بن جاؤ اور تم (کامل) مومن نہیں بنوگے جب تک کہ ایک دوسرے سے محبت نہ کرنے لگو۔ کیا میں تمھیں وہ کام نہ بتاؤں جس کے کرنے سے تم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو؟ آپس میں سلام کو عام کرو۔'' [صحیح مسلم:۵۴] یعنی سلام کرنے کو رواج دو اور ایک دوسرے سے ملتے ہی سلام کرو۔

باہمی محبت کو بڑھاوا دینے اور ایک دوسرے کی محبت حاصل کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دینے اور باہم مصافحہ و معانقہ کرنے کی بھی تلقین فرمائی ہے۔ [موطا امام مالک: ۲۶۴۱]

ایمان وعقیدہ کی بنیاد پر محض اللہ کے لیے باہم محبت کرنا بڑی فضیلت والا عمل ہے بلکہ یہ ایک عظیم عبادت ہے، ایسے لوگوں سے اللہ بھی محبت کرتا ہے اور انھیں قیامت کے دن اپنے عرش کے نیچے سایہ

دے گا جب کہ اس دن کوئی سایہ نہیں ہو گا، اس دن انھیں نور حاصل ہو گا، وہ نور کے منبروں پر براجمان ہوں گے اور انھیں کوئی خوف و غم لاحق نہیں ہو گا، اللہ انھیں اپنے قریب جگہ دے گا اور ایسے ہی لوگ ایمان کی حلاوت و چاشنی کی لذت سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اللہ کے لیے صالحین اور اہلِ خیر و تقویٰ کے ساتھ محبت کرنے کی وجہ سے بندۂ مؤمن اپنے سے بلند مرتبہ اہلِ خیر کے مقام و مرتبے تک پہنچ جاتا ہے، قیامت کے دن اللہ اسے بھی اپنے فضل و کرم سے ان کے ہم رتبہ کر کے اسے ان کے ساتھ ملا دے گا، خواہ اس کے اپنے اعمال ایسے نہ ہوں کہ وہ ان کے مقام و مرتبے تک پہنچ سکے۔[دیکھیے: صحیح / سنن أبو داود: ۳۵۲۷، المعجم الأوسط للطبراني، دیکھیے: سلسلة الاحادیث الصحیحة: ۳۲۷۳، صحیح مسلم: ۲۵۶۶، سنن دارمی: ۲۷۹۹، موطأ امام مالک: ۲۷۴۱، مسند احمد: ۸۴۵۵، صحیح بخاری: ۶۶۰، صحیح مسلم: ۱۰۳۱]

لوگوں کی نگاہوں میں محبوب بننے کا بہترین طریقہ اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی اپنے دل میں کسی طرح کی حرص و خواہش نہ رکھے، لوگوں کے پاس جو نعمتیں ہیں ان کا طلب گار نہ ہو، لوگوں کے مالوں سے بے نیاز رہے، کسی سے امید نہ رکھے کہ وہ مجھے عطا کریں، کیوں کہ کسی انسان سے مال و متاع کی امید رکھنا حرص ہے اور اس کی وجہ سے آدمی ذلیل ہو جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر اپنے مال و جائداد کو بہت عزیز و محبوب رکھتا ہے اور یہی پسندیدہ چیز اگر اس سے طلب کی جائے تو ظاہر سی بات ہے کہ وہ طلب کرنے والے کو ناپسند کرے گا اور پھر دھیرے دھیرے اس کی ناپسندیدگی نفرت میں تبدیل ہو جائے گی، اس لیے دوسروں کے مال و متاع سے بے نیاز ہو کر جو کچھ اپنے پاس ہو اسی پر قناعت کریں، اس سے عزت ملے گی اور لوگ بھی ایسے شخص کو محبوب و عزیز رکھیں گے، کیوں کہ جب آدمی کسی سے اس کی محبوب چیز طلب نہیں کرے گا تو وہ اسے محبوب رکھیں گے۔ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے آدمی ذلیل ہو جاتا ہے اور اس کی کوئی وقعت و حیثیت نہیں رہتی ہے اور پھر جس سے مانگا جاتا ہے وہ بھی ناراض ہو جاتا ہے، اس لیے ہر چیز کا سوال اللہ سے کرنا چاہیے، کیوں کہ اس کے فضل و کرم کا دروازہ ہر وقت بندۂ مومن کے لیے کھلا رہتا ہے اور اللہ سے جتنا ہی مانگا جائے وہ اتنا ہی خوش ہوتا ہے بلکہ وہ تو نہ مانگنے سے ناراض ہوتا ہے۔

تاہم لوگوں کی نگاہوں میں عزیز و محبوب بننے کے لیے دو رخی پالیسی اختیار کرتے ہوئے چغل خوری کرنا یا مال و طاقت اور اپنی زبان درازی کے بل پر لوگوں سے اپنی عزت کروانا انتہائی معیوب اور

ناپسندیدہ عمل ہے۔ ہمارے سماج و معاشرے میں ایسے بہت سے لوگ پائے جاتے ہیں، جو ہر ایک کی نگاہ میں اچھا بننا چاہتے ہیں اور اس کے لیے جھوٹ و فریب کا سہارا لیتے ہوئے مصلحت کوشی سے کام لیتے ہیں اور منہ دیکھی باتیں کرتے ہیں۔ ایسی دوہری شخصیت کے مالک دوغلے لوگ جب کسی سے ملتے ہیں تو خود کو ان کا قریبی اور خیر خواہ قرار دیتے ہیں اور دوسروں کی برائی کر کے خود کو ان کا مخالف باور کراتے ہیں اور جب دوسروں کے پاس حاضری دیتے ہیں تو ان کے پاس بھی خوب بڑھا چڑھا کر یہی تاثر دیتے ہیں، اس طرح اپنی مقصد بر آری کے لیے دونوں فریقوں کو آپس میں ایک دوسرے سے عداوت و دشمنی پر ابھارتے رہتے ہیں اور بسا اوقات اسی وجہ سے دو فریقوں کے درمیان سرد جنگ اور نہ رکنے والی لڑائی شروع ہو جاتی ہے اور آپس ہی میں لوگ ایک دوسرے کے لیے بہی خواہ ہونے کے بجائے سخت دشمن بن جاتے ہیں۔ ایسے دو رُخے لوگوں کے لیے حدیث میں بڑی سخت مذمت و وعید آئی ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ شَرَّ النَّاسِ ذُو الْوَجْهَيْنِ، الَّذِي يَأْتِي هَؤُلَاءِ بِوَجْهٍ، وَهَؤُلَاءِ بِوَجْهٍ)) ”بے شک لوگوں میں بدترین ہے وہ آدمی، جو دو رُخا ہو۔ ان کے پاس ایک منہ سے آئے اور دوسروں کے پاس دوسرے منہ سے جائے۔“ [صحیح بخاری:۷۱۷۹، صحیح مسلم:۲۵۲۶]

نیز جامع ترمذی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **((إِنَّ مِنْ شَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذَا الْوَجْهَيْنِ))** ”بے شک قیامت کے دن اللہ کے نزدیک لوگوں میں بدترین شخص دو چہروں والا ہو گا۔“ [صحیح / سنن ترمذی:۲۰۲۵، صحیح الجامع الصغیر:۲۲۲۶]

اسی طرح دو رُخوں کے اُخروی انجام کے متعلق سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **((مَنْ كَانَ لَهُ وَجْهَانِ فِي الدُّنْيَا كَانَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لِسَانَانِ مِنْ نَارٍ))** ”جو شخص دنیا میں دو رُخا ہو گا، قیامت کے روز اس کی دو آگ کی زبانیں ہوں گی۔“ [صحیح / سنن أبو داود: ۴۸۷۳، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۸۹۲]

جو لوگ محض اپنی زبان درازی اور شر و فتنہ کی وجہ سے لوگوں میں محبوب بننا چاہتے ہیں ان کے متعلق ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ مِنْ شِرَارِ النَّاسِ الَّذِينَ يُكْرَمُونَ اتِّقَاءَ أَلْسِنَتِهِمْ)) ”بے شک لوگوں میں سب سے برے لوگ وہ ہیں، جن کی تکریم محض ان کی زبانوں سے بچنے کے لیے کیا جائے۔“ اور مسند احمد کی روایت میں ہے: ((اِتِّقَاءَ شَرِّهِمْ)) ”ان کے شر سے بچنے کے لیے“ [سنن أبو داود: ۴۷۹۳، مسند احمد: ۲۴۷۹۸، سلسلہ سند میں شَریک اور اَعْمَش کے مدلس ہونے کی وجہ سے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے، تاہم حدیث صحیح ہے، جیسا کہ مسند احمد کے محققین نے اس کی تصحیح کی ہے۔ دیکھیے مسند احمد محقق: ۴۱/۳۰۷]

زیرِ مطالعہ حدیث سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت و فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ وہ لوگ برابر دنیا و آخرت کی بھلائی سے متعلق سوال کیا کرتے تھے اور وہ لوگ دین پر قائم رہنے کے بے حد حریص تھے، نیز جواب دینے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی خوبی ایجاز بیانی کا ثبوت ملتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مختصر لفظوں میں بہت زیادہ معانی کو سمیٹ لیتے تھے۔

زیرِ مطالعہ حدیث سے اللہ رب العالمین کے لیے صفتِ محبت کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ اپنے بندوں سے حقیقت میں محبت کرتا ہے، جو اسی کی عظیم ذات کے شایانِ شان ہے اور اس کا اپنے مخصوص بندوں سے محبت کرنا بندوں کی آپسی محبت کے مشابہہ نہیں ہے۔

راویِ حدیث کا تعارف:

صحابیِ رسول سیدنا سہل بن سعد بن مالک بن خالد بن ثعلبہ ساعدی انصاری خزرجی رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو العباس ہے اور والدہ کا نام اُبَیّہ بنت حارث ہے۔ ان کی ولادت ہجرت سے پانچ سال پہلے ہوئی۔ اِنھیں اور ان کے والد دونوں کو شرفِ صحابیت حاصل ہے اور یہ مشہور صحابہ میں سے ہیں۔ قبولِ اسلام سے پہلے ان کا اصل نام ”حزن“ تھا جس کے معنٰی ”سخت“ کے ہوتے ہیں، لیکن جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بدل کر ”سہل“ رکھ دیا، جس کا معنٰی ”آسان“ ہے۔ وفاتِ نبوی کے وقت یہ پندرہ سال کے جوانِ رعنا تھے اور ان کی وفات ۸۸ ہجری میں مدینہ میں ہوئی جب کہ ان کی سن وفات کے تعلق سے یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ ۹۱ ہجری یا اس کے بعد ہوئی، کہا جاتا ہے کہ مدینہ میں وفات پانے والوں میں سب سے آخری صحابی یہی ہیں۔ صاحبِ مرعاۃ المفاتیح علامہ عبید اللہ رحمانی مبارک پوری رحمہ اللہ کے بقول ان سے مروی احادیث کی تعداد تقریباً (۱۸۸) ہے، جب کہ بعض محدثین نے ان کی مرویات کی تعداد سو (۱۰۰) بتائی ہے۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

تکلیف پہنچانے کی ممانعت

(۳۲) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ سَعْدِ بْنِ مَالِكِ بْنِ سِنَانٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ**)) حَدِيثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالدَّارَقُطْنِيُّ وَغَيْرُهُمَا مُسْنَدًا، وَرَوَاهُ مَالِكٌ فِي الْمُوَطَّإِ عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى عَنْ أَبِيهِ عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم مُرْسَلًا، فَأَسْقَطَ أَبَا سَعِيدٍ، وَلَهُ طُرُقٌ يُقَوِّي بَعْضُهَا بَعْضًا

ابو سعید سعد بن مالک بن سنان خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہ ضرر اٹھانا جائز ہے اور نہ ضرر پہنچانا جائز ہے۔"

(یہ حدیث حسن ہے، اسے ابن ماجہ (ح: ۲۳۴۰) اور دار قطنی (۲۲۸/۴) وغیرہ نے مسند روایت کیا ہے اور امام مالک نے موطأ (ح: ۲۱۷۱) میں عن عمرو بن یحيٰ المازني عن ابیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مرسل روایت کیا ہے، انھوں نے ابو سعید کے واسطہ کو ساقط کر دیا ہے، لیکن اس کے کئی طرق ہیں، جن سے ایک دوسرے کو تقویت ملتی ہے۔)

شرح و فوائد :

یہ حدیث مرسل بھی روایت کی گئی ہے اور سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے علاوہ ابن عباس، عبادہ بن صامت، ابوہریرہ، جابر بن عبد اللہ، ثعلبہ بن مالک اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم سے موصولاً بھی روایت کی گئی ہے۔ حدیث کی سند پر کلام کیا گیا ہے، لیکن جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے اشارہ کیا کہ اس کی بہ کثرت طرق و شواہد موجود ہیں، جن سے ایک دوسرے کو تقویت ملتی ہے، لہٰذا سنداً ضعیف ہونے کے باوجود بھی معناً و متناً یہ حدیث صحیح اور قابل حجت ہے۔ شیخ البانی اور ڈاکٹر بشار عواد رحمہا اللہ وغیرہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور مسند احمد کے محققین نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ [حدیث کی سند اور اس کے طرق و شواہد سے متعلق تفصیلی معرفت کے لیے ملاحظہ کریں: سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۲۵۰ اور مسند احمد کے محققین کی تحقیق : ۵/۵۵-۵۶ برقم: ۲۸۶۵]

یہ حدیث اسلامی احکام و اخلاق کے عظیم قاعدے پر مبنی ہے، جس سے بہت سارے احکام و مسائل اور جزئیات مستنبط ہوتے ہیں اور یہ حدیث باہمی تنازعات اور تعامل کا اہم ضابطہ و اصول فراہم کرتی ہے کہ ضرر کو باقی نہ رہنے دو، نہ خود ضرر اٹھاؤ اور نہ دوسروں کو ضرر پہنچاؤ، لہٰذا انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کو نیز مسلمانوں کے دینی معاملات کو نقصان پہنچانے والے تمام تر وسائل سے دوری اختیار کی جانی چاہیے۔

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ضَرَر اور ضِرَار کا لفظ استعمال فرمایاہے کہ اسلام میں ضرر اور ضرار نہیں ہے یعنی اسلام میں ناحق تکلیف ونقصان اٹھانے اور پہنچانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

ضَرَر اور ضِرَار دونوں کا مفہوم ایک ہے یا دونوں کے درمیان کوئی تفریق پائی جاتی ہے؟ اس سلسلے میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ دونوں ہم معنیٰ ہیں اور تاکید کے طور پر دونوں کو یکجا ذکر کیا گیاہے اور ضرار مبالغہ کا صیغہ ہے، جس سے مزید تاکید ہوتی ہے، لیکن عطف کے ساتھ تاکید کا آنا درست نہیں ہے، اس لیے بہتر رائے یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تفریق پائی جاتی ہے، کیوں کہ عطف مغایرت پر دلالت کرتاہے۔ دونوں کے درمیان پائے جانے والے فرق کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ضَرَرَ، نفع کی ضد ہے۔ کسی کے جان ومال، جاہ وجلال اور عزت وآبرو وغیرہ میں سے کسی ایک میں کوئی کمی اور نقص واقع ہونے کو کہتے ہیں اور حدیث میں ضرر کی جو نفی کی گئی ہے اس سے شرعی نفی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شرعی طور پر نفسِ ضرر یعنی ایسی حرکت جس سے خود اپنی یا کسی مسلمان بھائی کی عزت وآبرو یا جان ومال میں کسی طرح کی کمی اور نقص لازم آئے ممنوع ہے اور جب یہ ممنوع ہے تو اس کو اپنی ذات سے اور دوسرے مسلمان بھائیوں کی ذات سے دور کرنا واجب ہوگا۔

اور ضِرَار کے معنی ہیں زیادتی کرنا، تکلیف پہنچانا، کسی کو نقصان پہنچانا اور حدیث میں ضِرَار کی جو نفی کی گئی ہے اس سے بھی شرعی نفی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوسرے مسلمان بھائیوں کو نقصان پہنچانا شرعاً ممنوع ہے، نقصان پہنچانے کی کوئی بھی صورت اپنائی جائے، سب ممنوع اور حرام قرار پائیں گی، خواہ قصداً کسی کو نقصان پہنچایا جائے یا نقصان پہنچانے کا قصد وارادہ کیے بغیر کسی کو نقصان پہنچایا جائے، از خود پہل کرتے ہوئے نقصان پہنچایا جائے یا بدلہ لیتے ہوئے نقصان پہنچایا جائے، اپنی ذات سے نقصان پہنچایا جائے یا دوسروں کے ذریعے نقصان پہنچایا جائے، کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے نقصان پہنچایا جائے یا کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر محض ضد اور دشمنی میں نقصان پہنچایا جائے، خود اپنے آپ کو نقصان پہنچایا جائے یا کسی دوسرے کو نقصان پہنچایا جائے، ہر صورت ممنوع ہے۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ زیرِ مطالعہ حدیث کی رو سے ضرر کو باقی رکھنا یا کسی کو ضرر پہنچانا اپنی تمام صورتوں سمیت ممنوع ہے، بلکہ پوری کی پوری شریعتِ اسلامیہ اس کے سخت خلاف ہے۔ اس لیے

ضروری ہے کہ شرعی تعلیمات کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور نرمی کریں، خیر خواہ بنیں اور جو اپنے لیے پسند کریں وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کریں، دوسروں کی جانب سے اپنے لیے جس رویے کی خواہش رکھیں وہی رویہ دوسروں کے لیے بھی اختیار کریں اور یہ بات یاد رکھیں کہ سچا و پکا مسلمان وہی ہے، جس سے کسی مسلمان بھائی کو کوئی نقصان اور تکلیف نہ پہنچے۔ جیسا کہ سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ)) ”(کامل) مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔“ [صحیح بخاری:۱۰، صحیح مسلم:۴۱]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک سچا و پکا مسلمان وہ ہے، جس کے زبان و ہاتھ یعنی قول و فعل سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، یہاں زبان و ہاتھ کا خصوصی تذکرہ اس لیے ہوا ہے، کیوں کہ زیادہ تر انھیں دونوں سے کسی کو ایذا دی جاتی ہے، ورنہ حدیث کا واضح مفہوم یہی ہے کہ ایک کامل مسلمان کسی بھی طرح سے کسی مسلمان بھائی کو تکلیف نہیں دے سکتا ہے، کیوں کہ کسی مومن کی جانب محض غلط بات منسوب کر کے اسے ناحق ایذا دینا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ رب العالمین کا فرمان ہے :

﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا﴾ ”اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف دیتے ہیں، بغیر کسی گناہ کے جو انھوں نے کمایا ہو تو یقیناً انھوں نے بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔“ [النساء:۵۸]

زیرِ مطالعہ حدیث سے یہ درس ملتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے آپسی معاملات عدل و انصاف اور حسنِ اخلاق کے ساتھ طے کرنا چاہیے، کسی کو تکلیف یا نقصان پہنچا کر کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہیے، حتیٰ کہ اپنا جائز حق وصول کرتے ہوئے بھی حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے اور نہ سامنے والے کو کسی طرح کے نقصان اور تکلیف میں ڈالنا چاہیے، اس لیے کہ اس حدیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگوں سے ہر قسم کے ضرر کو دور رکھنا ضروری ہے اور کسی کو ضرر پہنچانا حرام ہے، حتیٰ کہ کسی ضرر کو زائل کرنے کے لیے بدلے میں زائد ضرر پہنچانا بھی درست نہیں ہے۔ چناں چہ کسی مسلمان بھائی کی جانب سے کوئی تکلیف اور ضرر پہنچے تو بدلہ لینے کی اجازت تو ہے، مگر اسی قدر جتنا ضرر اس سے پہنچا ہے اور اگر عفو و در

گزر سے کام لیتے ہوئے صبر کریں تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿...فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ ''پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' [البقرۃ:۱۹۴] دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ﴾ ''اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہے اور بلاشبہ اگر تم صبر کرو تو یقیناً وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔'' [النحل:۱۲۶]

یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ ناحق کسی کو مشقت میں ڈالنے اور ضرر پہنچانے کا وبال خود انسان کے اوپر بھی آئے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ کسی کو ضرر پہنچائیں اور اس کا اثر آپ پر نہ ہو، جیسا کہ سیدنا ابو صِرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شدید وعید فرمائی ہے:

((مَنْ ضَارَّ أَضَرَّ اللَّهُ بِهِ، وَمَنْ شَاقَّ شَقَّ اللَّهُ عَلَيْهِ)) ''جس نے ضرر پہنچایا اللہ اس کی وجہ سے اسے ضرر پہنچائے اور جس نے کسی کو مشقت میں ڈالا اللہ اسے مشقت میں ڈالے۔'' [حسن بشواہدہ / سنن أبو داود:۳۶۳۵، سنن ترمذی:۱۹۴۰، سنن ابن ماجہ: ۲۳۴۲، مسند احمد:۱۵۷۵۵، إرواء الغليل:۸۹۶]

جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ یہ حدیثِ نبوی ایک بنیادی قاعدہ و ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا دورِ جدید کے ایسے مسائل کہ جن میں ضرر و ضرار کا پہلو پایا جائے انھیں اسی اصول کے تحت حل کیا جائے گا اور ایسے امور سے بچنا ضروری ہو گا۔ کتاب و سنت میں اس کی بہت سی نظیریں ملتی ہیں کہ ضرر و نقصان پہنچنے کی وجہ سے بالجزم بہت سے امور سے روکا گیا ہے۔ مثلاً:

❁ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ ۚ﴾ ''نہ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے ضرر پہنچائی جائے اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف پہنچائی جائے۔'' [البقرۃ:۲۳۳] ''ماں کو تکلیف دینا یہ ہے کہ وہ مثلاً اپنے بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہے، مگر باپ زبردستی چھین لے یا یہ کہ اسے دودھ پلانے پر مجبور کرے اور خرچہ نہ دے اور باپ کو تکلیف دینا یہ ہے کہ ماں بچے کا سارا بوجھ اس پر ڈال دے یا دودھ پلانے سے انکار کر دے یا بھاری اخراجات کا مطالبہ کرے، جو باپ کی

وسعت سے باہر ہوں۔" [تفسیر القرآن الکریم ۱/۱۹۱]

❁ طلاق کے احکام کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ .....﴾ "اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو اور انھیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکے رکھو، تاکہ ان پر زیادتی کرو اور جو ایسا کرے سو بلاشبہ اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ۔" [البقرۃ: ۲۳۱] میاں بیوی کے درمیان آپسی ناچاقی شدت اختیار کرلے اور دونوں کا ایک ساتھ گزران مشکل ہو جائے تو شریعت نے مرد کو طلاق دینے اور عورت کو خلع لینے کی رخصت دی ہے۔ طلاق رجعی دینے کے صورت میں عدت کے دوران مرد کو رجوع کرنے کا اختیار حاصل ہے، لیکن اگر اس سے عورت کو ضرر پہنچانا مقصود ہو تو پھر اس سے روکا گیا ہے اور اسے ظلم وزیادتی اور آیاتِ الٰہی کے ساتھ مذاق کرنا قرار دیا گیا ہے۔

❁ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿...وَ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ...﴾ "اور نہ کسی لکھنے والے کو تکلیف دی جائے اور نہ کسی گواہ کو" [البقرۃ:۲۸۲] یہ ترجمہ "وَلَا يُضَآرَّ" فعل مجہول کی صورت میں ہے۔ یہ فعل معروف بھی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں ترجمہ ہو گا "نہ لکھنے والا نقصان پہنچائے اور نہ گواہ" مثلاً لکھنے والا غلط بات لکھ دے، جس سے صاحبِ حق یا مقروض کو نقصان پہنچے یا گواہ شہادت میں ہیر پھیر کر کے غلط گواہی دے۔ کاتب اور گواہ کو نقصان پہنچایا جانا یہ ہے کہ انھیں ان کی مشغولیت کے وقت تنگ کر کے بلایا جائے یا غلط شہادت پر مجبور کرنے کے لیے خوف زدہ کیا جائے وغیرہ۔ [تفسیر القرآن الکریم: ۱/۲۳۴] واضح رہے کہ آیت کریمہ میں وارد کلمہ "يُضَآرَّ" فعل معروف ہونے کی صورت میں اصل میں "لَا يُضَارِرْ" ہو گا اور فعل مجہول ہونے کی صورت میں اصل میں "لَا يُضَارَرْ" ہو گا۔

❁ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿...مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ...﴾ "اس وصیت کے بعد جو کی جائے یا قرض (کے بعد)، اس طرح کہ کسی کا نقصان نہ کیا گیا ہو۔" [النساء: ۱۲] "وصیت میں نقصان پہنچانا ایک تو یہ ہے کہ تہائی مال سے زیادہ وصیت کرے، اس صورت میں تہائی

سے زائد وصیت کا نفاذ نہیں ہو گا، مگر یہ کہ ورثاء اجازت دے دیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی وارث کو مزید رعایت سے زائد مال دلوایا جائے، اس کا بھی اعتبار نہیں ہو گا، الّا یہ کہ تمام وارث برضا و رغبت اسے قبول کر لیں۔ قرض میں نقصان پہنچانا یہ ہے کہ محض وارثوں کا حق تلف کرنے کے لیے مرنے والا اپنے ذمے کسی ایسے قرض کا اقرار کرے جو حقیقت میں اس کے ذمے نہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''وصیت میں نقصان پہنچانا کبیرہ گناہ ہے۔'' (السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۰/ ۶۰، ح: ۱۱۰۲۶، وسندہ صحیح) [تفسیر القرآن الکریم: ۱/ ۳۴۵]

یہ صرف نمونہ کے طور پر چار مثالیں ذکر کی گئی ہیں ورنہ ایسی بہت سی مثالیں کتاب و سنت میں موجود ہیں، لہٰذا جہاں کہیں ضرر کا پہلو کسی بھی صورت میں پایا جائے گا وہ حرام قرار پائے گا اور اس سے اجتناب کرنا ضروری ہو گا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر ایک کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، حسنِ اخلاق سے پیش آیا جائے اور اپنی ذات سے ناحق کسی کو تکلیف نہ دی جائے، حتیٰ کہ جہاد و قتال کے اہم موقع پر بھی زیادتی کرنے سے روکا گیا ہے۔ مثلاً: کوئی اس موقع پر کلمہ پڑھے تو اسے نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، بوڑھوں اور بچوں کو قتل نہیں کیا جائے گا وغیرہ، اسی طرح کسی کے معبودانِ باطلہ کو بھی برا بھلا نہیں کہا جائے گا کہ وہ پلٹ کر نعوذ باللہ اللہ ہی کو گالی دینے لگے۔ موجودہ دور میں عام طور پر یہ خوبی لوگوں کے یہاں سے ناپید ہوتی جا رہی ہے، معافی اور صبر سے کام لینا معیوب سمجھا جاتا ہے اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے یا تکلیف دینے ہی کو کامیابی تصور کی جاتی ہے۔

راویِ حدیث کا تعارف:

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا نام و نسب: سعد بن مالک بن سنان بن عبید بن ثعلبہ بن عبید بن ابجر خدرہ انصاری خزرجی ہے اور والدہ کا نام انیسہ بنت ابی حارثہ ہے۔ انصار کے قبیلہ خزرج سے ان کا تعلق تھا اور اسی قبیلے کی ایک معروف شاخ خدرہ ہے، جس کی طرف یہ منسوب ہیں اور یہ اپنی کنیت ابو سعید خدری ہی سے معروف ہیں اور ان کا شمار کبار صحابہ میں ہوتا ہے۔ یہ سب سے پہلے غزوۂ خندق میں شریک ہوئے اور اس کے بعد کے غزوات میں بھی شریک ہوتے رہے۔ ان کے والد غزوۂ احد میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے تقریباً ۸۶ برس کی عمر پائی اور ۷۴ ہجری کے آغاز میں مدینہ کے اندر فوت ہوئے اور بقیع قبرستان میں دفن ہوئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی وفات ۶۳ یا ۶۴ یا ۶۵ ہجری میں ہوئی۔ ان سے تقریباً (۱۱۷۰) حدیثیں مروی ہیں۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

اثباتِ دعویٰ اور ثبوت کی پیشی

(۳۳) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**لَوْ يُعْطَىٰ النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعَى رِجَالٌ أَمْوَالَ قَوْمٍ وَدِمَاءَهُمْ، وَلٰكِنِ الْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي، وَالْيَمِينُ عَلَى مَنْ أَنْكَرَ**)) حَدِيثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ وَغَيْرُهُ هَكَذَا، وَبَعْضُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر لوگوں کو محض ان کے دعویٰ کرنے کی وجہ سے دے دیا جائے تو بہت سے لوگ قوم کے دیگر لوگوں کے اموال اور ان کے خون کا دعویٰ کریں گے، لیکن دعویٰ کرنے والے کے ذمہ ثبوت پیش کرنا ہے اور جس سے دعویٰ کیا جائے اگر وہ انکاری ہو تو اس کے ذمہ قسم کھانا ہے۔“ (یہ حدیث حسن ہے، اسے بیہقی[۱۰/۲۵۲]وغیرہ نے اسی طرح روایت کیا ہے اور اس کا بعض حصہ صحیحین[صحیح بخاری : ۴۵۵۲، صحیح مسلم:۱۷۱۱]میں بھی ہے۔)

شرح و فوائد :

یہ حدیث دلائل و قرائن سے عاری دعوے کو قبول نہ کرنے کا ایک اہم اصول فراہم کرتی ہے۔ اس حدیث کی بنیاد پر ہر اس شخص کا دعویٰ جو دلائل و قرائن اور شواہد سے خالی ہو رد کر دیا جائے گا چاہے اس دعوے کا تعلق حقوق و معاملات سے ہو یا پھر وہ ایمان و علم کے مسائل سے متعلق ہو۔ اس طرح کا کوئی دعویٰ پیش ہونے کی صورت میں مُدَّعِی یعنی دعویٰ کرنے والے سے دلیل طلب کی جائے گی مُدَّعَی علیہ یعنی جس کے اوپر دعویٰ پیش کیا جائے اس کے انکار کی صورت میں خود انکار کرنے والے سے قسم لی جائے گی تاکہ حق و انصاف کا تقاضا پورا ہو نیز جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ہو سکے۔

”قسامت“ یعنی دعوائے دم کا معاملہ مذکورہ بالا دعویٰ کے شرعی قاعدہ سے قدرے مختلف ہے، اس میں مدعی یعنی مقتول کے اولیاء سے ثبوت نہ پیش کرنے کی صورت میں پچاس افراد کی قسمیں لی جائیں گی اور اگر وہ قسم کھا کر یہ گواہی دے دیں کہ قاتل یہی ہے تو فیصلہ ان کے حق میں دیا جائے گا، چوں کہ قسامت نص صریح [دیکھیے: بخاری: ۶۱۴۲، ۶۸۹۸، ۷۱۹۲، مسلم:۱۶۶۹وغیرہ] سے ثابت ہے اس لیے یہ جائز ہو گا تاہم قسامت (یعنی مقتول کے ورثاء کی جانب سے خون کا دعویٰ کرنا) کے سوا بقیہ اور حدود و مقدمات کے معاملے میں محض قسم لے کر مُدَّعِی کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔

اپنے کسی حق کو دوسرے فریق کی جانب نسبت کرنے کو دعویٰ کہتے ہیں اور دعویٰ پیش کرنے والے فریق کو مُدَّعِی اور جس کے خلاف دعویٰ پیش کیا جائے اسے مُدَّعَی علیہ کہتے ہیں اور بَیِّنَہ یعنی ثبوت ہر اس شے کو کہتے ہیں جس سے حق واضح ہو کر سامنے آ جائے۔

فوری طور پر مدعی کوئی ثبوت نہ پیش کر سکے اور مُدَّعَی علیہ کے قسم کھانے کی وجہ سے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے تو یہ فیصلہ درست ہو گا تاہم یہ فیصلہ وقتی طور پر قطعِ نزاع کے لیے ہو گا، لہٰذا اگر بعد میں مدعی کی جانب سے کوئی پختہ ثبوت پیش کر دیا جائے تو اس کے حق میں فیصلہ دیا جائے گا، کیوں کہ قسم حق کو ختم نہیں کرتی ہے بلکہ وقتی طور پر نزاع کو ختم کرتی ہے۔ تاہم محض جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی مسلمان بھائی کے مال کو ہتھیانا بھی سخت گناہ کا باعث ہے اور ایسے شخص کے متعلق حدیث میں بڑی سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ سیدنا ابو امامہ حارثی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

((مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِيَمِينِهِ فَقَدْ أَوْجَبَ اللَّهُ لَهُ النَّارَ، وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ))

”جس نے کسی مسلمان آدمی کا حق اپنی قسم کے ذریعہ مار لیا تو اللہ اس کے لیے دوزخ واجب کر دے گا اور اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔“ ایک شخص نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر کوئی معمولی چیز ہو تب بھی؟ آپ نے فرمایا: ((وَإِنْ قَضِيبًا مِنْ أَرَاكٍ)) ”اگرچہ پیلو کی ایک شاخ ہو۔“ [صحیح مسلم: ۱۳۷]

قسم کے ذریعہ ہتھیائی جانے والی معمولی چیز بھی حرام ہے اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے، کیوں کہ اس پر دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے۔ اسی طرح ناحق کسی دوسرے شخص کی چیز کا دعویٰ کرنا بھی سخت گناہ کا باعث ہے، جیسا کہ سیدنا ابو ذر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

((وَمَنِ ادَّعَى مَا لَيْسَ لَهُ فَلَيْسَ مِنَّا، وَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)) ”جس شخص نے ایسی چیز کا دعویٰ کیا جو اس کی نہیں ہے تو وہ ہم میں سے نہیں ہے، اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔“ [صحیح مسلم: ۶۱]

معلوم یہ ہوا کہ اسلامی شریعت لوگوں کے مال و دولت، زمین و جائداد اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہے اور ان کے ساتھ کسی کو کھلواڑ کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس طرح کے اصول و قوانین کے ذریعہ شریعتِ اسلامیہ کا مقصود فتنہ و فساد کے دروازوں کو بند کرنا ہے۔ اسی لیے کسی بھی دعویٰ کے لیے ثبوت پیش کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے دعویٰ بلا دلیل باطل قرار پائے گا اور اگر صرف

محض دعویٰ کرنے کی وجہ سے دعوے دار کے دعوے کو پورا کر دیا جائے تو پھر لوگ یوں ہی ایک دوسرے کے خلاف دعویٰ پر دعویٰ پیش کرنے لگیں گے، جس سے معاشرتی نظام درہم برہم ہو گا اور سماج ومعاشرے میں فتنہ وفساد برپا ہو گا۔

زیرِ بحث حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کا دعویٰ مقبول اور قابلِ سماع ہو گا، لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں دعویٰ سے مراد ممکن دعویٰ ہے، لہٰذا ناممکن دعویٰ پیش کرنے کی صورت میں فوراً ہی اسے خارج کر دیا جائے گا اور مُدَّعیٰ علیہ کے حق میں فیصلہ دیا جائے گا، اس طرح کے ناممکن دعویٰ کے لیے کسی طرح کی شنوائی کی ضرورت ہی نہیں ہو گی۔ مثلاً کوئی پچاس سالہ شخص کسی تیس سالہ شخص سے متعلق یہ دعویٰ کرے کہ وہ اس کا باپ ہے تو اس کے دعویٰ کو فوراً خارج کر دیا جائے گا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قاضی اپنی ذاتی رائے اور علم کی بنیاد پر یا محض مدعی کی چرب زبانی کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کرے گا بلکہ وہ حق کو پہچاننے کے بعد دلیل وثبوت کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کرے گا۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قاضی تین طرح کے ہوتے ہیں: ایک جنتی اور دو جہنمی۔ رہا جنتی تو وہ ایسا شخص ہو گا جس نے حق کو جانا اور اس کے موافق فیصلہ کیا۔ وہ شخص جس نے حق کو جانا اور اپنے فیصلے میں ظلم کیا تو وہ جہنمی ہے اور وہ شخص جس نے جہالت کی بنیاد پر لوگوں کا فیصلہ کیا تو وہ بھی جہنمی ہے۔'' [صحیح / سنن أبو داود: ۳۵۷۳، سنن ترمذی: ۱۳۲۲، سنن ابن ماجہ: ۲۳۱۵، إرواء الغلیل: ۲۶۱۴]

مدعی کے ذمہ ثبوت پیش کرنے اور مُدَّعیٰ علیہ کے ذمہ قسم کھانے کی حکمت یہ ہے کہ مدعی کا پہلو کمزور ہوتا ہے، کیوں کہ وہ ظاہر کے خلاف دعویٰ پیش کرتا ہے، لہٰذا اسے پختہ ثبوت پیش کرنے کا مکلف بنایا گیا تاکہ ثبوت کے ذریعہ اس کی دعوے داری کا موقف مضبوط ہو جائے اور مُدَّعیٰ علیہ کا موقف مضبوط ہوتا ہے کیوں کہ بنیادی طور پر وہ کسی طرح کی ذمہ داری سے بری ہوتا ہے، اس لیے اسے قسم کھانے یعنی کمزور حجت پیش کرنے کا مکلف بنایا گیا کیوں کہ قسم کے ذریعہ وہ اپنے اوپر آنے والے ضرر کو دفع کر کے ذاتی فائدہ اٹھائے گا۔

✿ ✿ ❁ ✿ ✿

اہلِ ایمان کے درجات ومراتب اور انکارِ منکر کے آداب

(٣٤) عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : ((**مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "تم میں سے جو شخص کوئی برا کام ہوتا دیکھے تو وہ اسے اپنے ہاتھ سے پھیر دے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھے تو اپنے دل سے برا جانے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔" (صحیح مسلم:۴۹)

شرح و فوائد :

رَأَى : دیکھنا، یہ افعال قلوب میں سے ہے، اس کا مفہوم صرف آنکھ سے دیکھنا نہیں ہے بلکہ علم میں آنا ہے، خواہ برائی کو آنکھوں سے دیکھے یا نہ دیکھے۔ مُنْكَرًا : برائی، گناہ اور معصیت کے وہ تمام امور جو شریعت کے مخالف ہوں، خواہ ان کا تعلق کبائر سے ہو یا صغائر سے ہو۔ فَلْيُغَيِّرْهُ : (تفعیل) پس چاہیے کہ وہ اسے بدل دے۔ یہ حکم شرعاً وجوب کے لیے ہے یعنی منکر کو بدلنا فرض ہے، اس پر امت کا اجماع ہے، عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا بھی یہی ہے، تاہم یہ فرضِ کفایہ ہے۔ اگر چند لوگ اسے انجام دے لیں تو باقی لوگوں سے یہ فریضہ ساقط ہو جائے گا اور اگر کوئی انجام نہ دے تو وہ تمام افراد گناہ گار ہوں گے جو اس کے اہل ہیں۔

اس حدیثِ نبوی سے معلوم ہوا کہ برائی کو روکنے کے تین درجات ہیں:

❶ پہلا درجہ برائی کو ہاتھ سے روکنا ہے۔ ہاتھ سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ جنھیں قوت و طاقت حاصل ہو وہ بزور طاقت برائی کو ختم کریں۔ مثلاً امراء و حکام، والدین اور اساتذہ و معلمین اور دیگر سرکردہ افراد اپنے ماتحت لوگوں کے اندر پائی جانے والی برائی کو سزا دے کر یا سزا کی دھمکی دے کر اور اسی طرح شراب اور لہو ولعب کے آلات وغیرہ کو توڑ کر یہ فریضہ انجام دیں گے۔

❷ دوسرا درجہ زبان سے روکنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وعظ و نصیحت اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ نیز سختی و نرمی کے ساتھ برائی کے نقصان اور اس کی اُخروی سزاؤں سے متنبہ کرکے اس فریضے کی

ادائیگی کی جائے۔ یاد رہے کہ بہت سی جگہوں پر تیر و تلوار کے بجائے زبان و بیان کی حلاوت و شرینی زیادہ نفع بخش ہوتی ہے، اس لیے حکمت و مصلحت، اچھی نصیحت اور اچھے ماحول میں رہ کر باہمی گفتگو کے ذریعہ لوگوں کو برائیوں سے روکا جائے۔

❸ تیسرا اور آخری درجہ دل میں برا جاننا ہے اور اگر یہ بھی نہیں پایا جاتا ہے تو گویا ایسا شخص ایمان سے خالی ہے۔ دل سے برا جاننے یا دل سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ برائی کی حمایت کرنے سے بچا جائے، خلافِ شرع کام پر دلی تکلیف ہو اور یہ عزم و حوصلہ رکھا جائے کہ جب بھی موقع ملے گا اور وسعت و طاقت ہوگی اس برائی کو ختم کر کے رہیں گے۔ دل سے برا جاننے کو ایمان کا کم تر درجہ بتایا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایمان کا کمزور ترین ثمرہ اور درجہ ہے۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان کے کئی درجے اور مراتب ہیں اور ایمان گھٹتا اور بڑھتا ہے، ایمان کبھی زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم ہو جاتا ہے۔ اسی مفہوم کی دوسری حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کبھی رائی کے دانے کے برابر رہ جاتا ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللَّهُ فِي أُمَّةٍ قَبْلِي، إِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ أُمَّتِهِ حَوَارِيُّونَ، وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُونَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُونَ بِأَمْرِهِ، ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوفٌ، يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ، وَيَفْعَلُونَ مَا لَا يُؤْمَرُونَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) ”اللہ نے مجھ سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا کہ اس کی امت میں سے اس کے حواری اور اصحاب نہ ہوں، جو اس کے طریقے پر چلتے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے۔ [یعنی ہر نبی کے انصار و مددگار ضرور ایسے گزرے ہیں، جنھوں نے اپنے نبیوں کی سنتوں کی اور ان کے احکام کی پیروی کی ہے۔] پھر ان کے بعد ایسے نالائق لوگ پیدا ہوتے ہیں، وہ جو کہتے ہیں خود اس پر عمل نہیں کرتے اور ان کاموں کو کرتے ہیں، جن کا حکم انھیں نہیں دیا گیا، لہٰذا جو کوئی ان سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ (کامل) مومن ہے اور جو کوئی ان سے اپنی زبان سے جہاد کرے وہ (کامل) مومن ہے اور جو کوئی ان سے اپنے دل سے جہاد کرے وہ (کامل) مومن ہے اور اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔“ [صحیح مسلم:۵۰]

بعض لوگ صرف نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکنا ضروری نہیں سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ

جب لوگوں میں نیکی پائی جائے گی تو وہ برائی سے خود بخود رک جائیں گے، لیکن زیرِ مطالعہ حدیثِ نبوی کی روشنی میں یہ طرزِ عمل غلط ہے۔ درست بات یہی ہے کہ برائی سے روکنا بھی ضروری ہے، کیوں کہ معروف کا حکم دینا، منکر سے روکنا اور اللہ پر ایمان رکھنا اس امت کی امتیازی خصوصیت میں سے ہے اور اسی امتیازی شان و خصوصیت کی وجہ سے انھیں اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سب سے بہترین امت قرار دیا گیا ہے۔ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ لعنت و غضبِ الٰہی کے مستحق اسی وجہ سے ہوئے کہ انھوں نے اللہ کی نافرمانی کی، حد سے آگے بڑھے، برے کاموں پر ڈٹے رہے اور ایک دوسرے کو برائیوں سے روکنا ترک کر دیا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿كَانُوا۟ لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا۟ يَفْعَلُونَ﴾ ”وہ ایک دوسرے کو کسی برائی سے، جو انھوں نے کی ہوتی، روکتے نہ تھے، بے شک برا ہے، جو وہ کیا کرتے تھے۔“ [المائدۃ:۷۹]

قدرت ہونے کے باوجود برائی پر خاموش رہنا اور اس پر نکیر نہ کرنا، گناہ و عقاب کا موجب ہے، کیوں کہ اس میں بہت بڑے مفاسد پنہاں ہیں، مثلاً:

❶ برائی پر سکوت اختیار کرنا بذات خود برائی ہے خواہ سکوت اختیار کرنے والا برائی میں ملوث نہ ہو، اس لیے کہ جس طرح معصیت سے اجتناب فرض ہے اسی طرح برائی کے مرتکب پر نکیر کرنا ضروری ہے۔

❷ برائی پر سکوت اختیار کرنا اور برائی سے نہ روکنا گناہوں کو معمولی سمجھنے اور ان کو زیادہ اہمیت نہ دینے پر دلالت کرتی ہے۔

❸ اس طرح فُسّاق و فُجّار میں کثرت سے گناہ کرنے کی جرأت بڑھ جاتی ہے۔ جب ان کو گناہوں سے روکا نہ جائے تو شر میں اضافہ ہو جاتا ہے، دینی اور دنیاوی مصائب بڑھ جاتے ہیں اور شوکت و غلبہ شریر لوگوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے، اہلِ خیر کمزور پڑ جاتے ہیں اور وہ اہلِ شر کا مقابلہ نہیں کر سکتے، حتیٰ کہ انھیں اتنی سی قدرت بھی حاصل نہیں رہتی جتنی ابتدا میں تھی۔

❹ منکر پر نکیر ترک کرنے سے علم مٹ جاتا ہے اور جہالت بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ جب معصیت بہت سے لوگوں سے بہ تکرار صادر ہوتی ہے اور اس پر اہلِ علم اور دین پسند لوگوں کی طرف سے نکیر نہیں ہوتی تو اس کے بارے میں گمان گزرتا ہے کہ یہ معصیت نہیں، بسا اوقات جاہل لوگ اسے مستحسن

عبادت سمجھ لیتے ہیں۔ اس سے بڑی کون سی برائی ہو سکتی ہے کہ کسی ایسی چیز کو حلال قرار دے دیا جائے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ نفوس پر حقائق بدل جائیں اور انھیں باطل حق نظر آنے لگے۔

❺ نافرمان لوگوں کی معصیت پر سکوت سے بسا اوقات معصیت لوگوں کے دلوں میں مزین ہو جاتی ہے اور برائی میں لوگ ایک دوسرے کی پیروی کرنے لگ جاتے ہیں، اس لیے کہ انسان اپنے گروہ اور ابنائے جنس کی پیروی کا شیفتہ ہوتا ہے۔ [تفسیر سعدی ص:۱۷۷]

آج اس امت کا بھی یہی حال ہو رہا ہے، کسی کے اندر برائی دیکھتے ہوئے نہ اس سے روکتے ہیں اور نہ اسے برا جانتے ہیں بلکہ درپردہ اس کی مدد و معاونت بھی کرتے ہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص زبردستی کسی کی زمین و جائداد ہڑپ کر رہا ہو یا کھلے عام کبائر و معاصی کا ارتکاب کر رہا ہو تو بہت سے لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور قدرت رکھنے کے باوجود برائی سے روکنے کے بجائے از خود جھوٹی گواہی دینے اور بُروں کی پشت پناہی کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اللہ اس امت کی حالتِ زار پر رحم فرمائے۔ آمین!

حسبِ طاقت نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا اور برائیوں کو ختم کرنا واجب ہے، لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ آدمی جس بات کا حکم دے اس کے بارے میں اسے اچھی طرح معلوم ہو کہ یہ معروف اور نیکی کا کام ہے اور جس سے روکے اس کے بارے میں بخوبی معلوم ہو کہ یہ منکر ہے، بصورتِ دیگر وہ خود گناہ گار ہوگا۔ آج کل یہ وبا عام ہو چکی ہے کہ شرعی علوم حاصل کیے بغیر بہت سے لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور اپنی جہالت کے باوصف اپنے غلط فتوؤں کے ذریعہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔ اس فریضے کی ادائیگی کے لیے زیرِ مطالعہ حدیث اور کتاب وسنت کے دیگر دلائل سے دوسری شرط یہ معلوم ہوتی ہے کہ منکر کو ختم کرنے اور اسے بدلنے کی طاقت حاصل ہو اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دل میں برا جاننا ضروری ہے اور اگر یہ وصف بھی نہیں پائی جا رہی ہے تو آدمی کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔

شرعی احکام پر عمل اور اوامر و نواہی کی پابندی کرتے ہوئے دیگر لوگوں کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی خود بھی متنبہ رہے گا اور معاشرے میں بہت زیادہ بگاڑ نہیں پیدا ہوگا اور اگر اس فریضے کو ترک کر دیا جائے تو لوگ بالخصوص نوجوان طبقہ مختلف

فتنوں میں پڑ کر بے راہ روی کا شکار ہو گا، نتیجتاً سبھی لوگ تباہی و بربادی کے شکار ہو کر عذابِ الٰہی کے مستحق ہوں گے، اللہ ایسے لوگوں کی دعاؤں کو قبول نہیں فرمائے گا اور ایسی بستی پر اللہ کا عذاب نازل ہو سکتا ہے، جیسا کہ سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ، أَوْ لَيُوشِكَنَّ اللَّهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْهُ ثُمَّ تَدْعُوْنَهُ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ)) "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تم پر اپنا عذاب بھیج دے پھر تم اللہ سے دعا کرو اور تمھاری دعا قبول نہ کی جائے۔" [صحیح / سنن ترمذی:۲۱۶۹، مسند احمد:۲۳۳۰۱، ۲۳۳۲۷]

سیدنا جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

((مَا مِنْ رَجُلٍ يَكُونُ فِي قَوْمٍ يُعْمَلُ فِيهِمْ بِالْمَعَاصِي يَقْدِرُونَ عَلَى أَنْ يُغَيِّرُوا عَلَيْهِ فَلَا يُغَيِّرُوا، إِلَّا أَصَابَهُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَمُوتُوا)) "جو کوئی شخص کسی ایسی قوم میں ہو کہ ان میں اللہ کی نافرمانیاں کی جارہی ہوں اور لوگ ان کے بدلنے پر قادر ہوں، پھر بھی وہ برائی نہ بدلیں تو اللہ ان سب کو ان کے مرنے سے پہلے عذاب دے گا۔" [حسن / سنن أبو داود:۴۳۳۹]

معلوم یہ ہوا کہ بذاتِ خود برائی سے بچ کر برائی پر سکوت اختیار کرنا قطعاً درست نہیں ہے، اس لیے کہ جس طرح برائی سے بچنا ضروری ہے اسی طرح برائی کرنے والے پر نکیر کرنا اور برائی کو روکنا بھی ضروری ہے یعنی شریعت کے اوامر ونواہی کی پابندی کے ساتھ ساتھ معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا بھی ضروری ہے اور رہی بات اس فرمانِ الٰہی کی: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ عَلَيۡكُمۡ أَنفُسَكُمۡۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا ٱهۡتَدَيۡتُمۡۚ إِلَى ٱللَّهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيعٗا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمۡ تَعۡمَلُونَ﴾ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم پر اپنی جانوں کا بچاؤ لازم ہے، تمھیں وہ شخص نقصان نہیں پہنچائے گا جو گمراہ ہے، جب تم ہدایت پا چکے، اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔" [المائدۃ:۱۰۵] تو صحیح قول کے مطابق اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی صرف اپنے کام اور عمل سے سروکار رکھے اور اسے دوسروں کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، خواہ وہ کچھ بھی کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی عاقبت کا

خیال رکھیں، اپنی اصلاح کی فکر کو مقدم رکھیں اور راہِ ہدایت پر گامزن رہیں اور اس حقیقت پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ اپنی اصلاح کرنے اور راہِ ہدایت پر گامزن رہنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ صاحبِ ایمان شخص لوگوں کو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے، اس لیے کہ یہ بھی ایک فریضہ ہے، جس کا وہ مکلف بنایا گیا ہے اور جملہ احکام کی ادائیگی کی صورت میں دوسروں کی گمراہی اور ان کے گناہ نقصان دہ نہیں ہوں گے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا: ”اے لوگو! تم اس آیت ﴿عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ﴾ کو پڑھتے ہو اور اس کا غلط مطلب لیتے ہو، جب کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

”جب لوگ ظالم کو دیکھیں، پھر اس کے ہاتھوں کو نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ ان سب پر عذاب لے آئے۔“ اور اسی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی نقل کیا گیا ہے: ”جس کسی قوم میں اللہ کی نافرمانی کے کام ہوں اور لوگ انھیں روکنے پر قادر ہوتے ہوئے نہ روکتے ہوں تو قریب ہے کہ اللہ اس کی وجہ سے ان سب کو اپنے عقاب کی لپیٹ میں لے لے۔“ [صحیح/ سنن أبو داود: ۴۳۳۸، نیز جامع ترمذی: ۲۱۶۸، ۳۰۵۷، سنن ابن ماجہ: ۴۰۰۵ اور مسند احمد: ۱، ۱۶، ۲۹، ۳۰، ۵۳ میں بھی یہ روایت مختصراً مروی ہے۔]

اور اگر کوئی شخص نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے، لیکن سامنے والا اسے تسلیم نہ کرے تو برائی کرنے والا گناہ گار ہو گا اور برائی سے روکنے والا گناہ گار نہیں ہو گا، اس لیے کہ اس کی ذمہ داری صرف حق کو واضح کرنا اور حجت قائم کرنا ہے، اسے قبول کروانا یا ہدایت دینا مومن کی ذمہ داری نہیں ہے اور پھر ذکر و نصیحت سے اہلِ ایمان کو نفع حاصل ہوتا ہے، اسی لیے قرآن کریم میں کہا گیا ہے:

﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ”اور نصیحت کرو، کیوں کہ یقیناً نصیحت ایمان والوں کو نفع دیتی ہے۔“ [الذاریات: ۵۵] اور فرمایا: ﴿مَّا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ ۗ...﴾ ”رسول کے ذمے صرف پہنچا دینا ہے۔“ [المائدۃ: ۹۹]

معلوم یہ ہوا کہ معروف کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا فریضہ محض اس بنیاد پر ساقط نہیں ہو گا کہ لوگ قبول نہیں کریں گے اور اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ یہ فریضہ انجام دینے والا شخص

مکمل طور پر پابندِ شرع ہو، جن باتوں کا حکم دے ان پر عمل پیرا ہو اور جن سے روکے اس پر عمل پیرا نہ ہو، کیوں کہ انسان فرشتہ نہیں ہو سکتا ہے، اس سے خطا و لغزش ہو سکتی ہے، لہٰذا اگر شریعت کی مکمل پابندی کو شرط قرار دے دیا جائے تو پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے معصیت کے باوجود بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے بارے میں فرمانِ الٰہی: ﴿أَتَأْمُرُونَ ٱلنَّاسَ بِٱلْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ...﴾ ''کیا لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔'' [البقرة:۴۴] کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''معروف کا حکم دینا اور اسے عملی جامہ پہنانا واجب ہے، علمائے سلف و خلف کے صحیح ترین قول کے مطابق ان دونوں میں سے کسی ایک کے ترک کرنے سے دوسرا ساقط نہیں ہو گا اور بعض اہل علم اس جانب گئے ہیں کہ معاصی کا ارتکاب کرنے والا دوسروں کو اس سے نہیں روکے گا، حالاں کہ یہ کمزور رائے ہے اور اس سے بھی زیادہ کمزور بات آیتِ کریمہ سے اس بات کی دلیل پکڑنا ہے، جب کہ اس میں ان کے لیے کوئی حجت نہیں ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ عالم معروف کا حکم دے گا اگرچہ وہ اس پر عمل نہ کرتا ہو اور منکر سے روکے گا اگرچہ وہ اس کا مرتکب ہو۔'' [تفسیر ابن کثیر ۱/۲۴۷]

ہاں! البتہ یہ بات ضرور ہے کہ داعیِ دین کو باعمل ہونا چاہیے اور اس کے قول و عمل میں یکسانیت پائی جانی چاہیے، کیوں کہ لوگوں کو معروف کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، لیکن خود اس پر عمل نہ کرنا گناہ کا باعث ہے۔ سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

((يُؤْتَى بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيُلْقَى فِي النَّارِ، فَتَنْدَلِقُ أَقْتَابُ بَطْنِهِ، فَيَدُورُ بِهَا كَمَا يَدُورُ الْحِمَارُ بِالرَّحَى، فَيَجْتَمِعُ إِلَيْهِ أَهْلُ النَّارِ، فَيَقُولُونَ: يَا فُلَانُ! مَا لَكَ؟ أَلَمْ تَكُنْ تَأْمُرُ بِالْمَعْرُوفِ، وَتَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ؟ فَيَقُولُ: بَلَى، قَدْ كُنْتُ آمُرُ بِالْمَعْرُوفِ وَلَا آتِيهِ، وَأَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ وَآتِيهِ)) ''قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا اور اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا، اس کے پیٹ کی انتڑیاں باہر نکل جائیں گی، پھر وہ اس کے ساتھ اسی طرح چکر لگائے گا جس طرح گدھا چکی کے ارد گرد چکر لگاتا ہے۔ اس کے پاس جہنمی لوگ اکٹھا ہوں گے اور کہیں گے اے فلاں! تجھے کیا ہوا؟ کیا تو بھلائی کا حکم اور برائی سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا: کیوں نہیں، میں بھلائی کا حکم دیتا تھا اور خود اسے

نہیں کرتا تھا اور برائی سے روکتا تھا اور خود اس میں ملوّث رہتا تھا۔" [صحیح بخاری:۷۰۹۸،۳۲۶۷، صحیح مسلم:۲۹۸۹]

زیرِ مطالعہ حدیث سے معلوم ہوا کہ انکارِ منکر ہر شخص پر حسبِ امکان و قدرت واجب ہے، یہ ذمہ داری صرف امراء اور حکام ہی کی نہیں ہے کہ وہی منکر کو بدلیں گے اور لوگوں کو برائیوں سے روکیں گے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے اسلامی حکومت و سلطنت کا ہونا شرط نہیں ہے۔ لہٰذا جس کسی کو معروف و منکر کا علم حاصل ہو اسے حسبِ طاقت یہ فریضہ انجام دینا چاہیے، حتیٰ کہ اگر امراء اور حکام کے اندر کوئی کمی پائی جائے تو ان پر بھی شرعی طریقے سے تنبیہ ہونی چاہیے۔ حدیث میں ظالم حکمراں کے سامنے حق بات کہنے کو سب سے افضل جہاد کہا گیا ہے، جیسا کہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَابِرٍ أَوْ: أَمِيرٍ جَائِرٍ)) "افضل جہاد ظالم حاکم یا ظالم امیر کے رُوبَرو انصاف کی بات کہنا ہے۔" [صحیح / سنن أبو داود:۴۳۴۴، سنن ترمذی:۲۱۷۴، سنن ابن ماجہ : ۴۰۱۱]

چوں کہ ظالم حکمرانوں کے سامنے حق اور سچ بات کہنے کی صورت میں ان کی جانب سے شدید ردِ عمل کا ہونا یقینی ہوتا ہے اور پھر انسان پر مغلوبیت کا خوف بھی طاری رہتا ہے، اس لیے اسے افضل جہاد قرار دیا گیا ہے۔ تاہم یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ انکارِ منکر یا اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ منبر و محراب اور لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اکٹھا کر کے اُنھیں امراء اور حکام کے خلاف ابھارا جائے، حُکّام کے عیوب کو عام کیا جائے اور ان کے خلاف مسلح کارروائی کی جائے۔ یہ اس حدیث کا مصداق نہیں ہے اور نہ انکارِ منکر کا طریقہ ہے، اس لیے کہ اس سے فتنہ و فساد بپا ہوتا ہے، بغاوت پھیلتی ہے اور نافرمانی کے مواقع پیدا ہوتے ہیں، اس طرح نتیجتاً فائدہ کے بجائے نقصان ہی نقصان حاصل ہوتا ہے۔ دراصل اس طرح کا رویہ اختیار کرنا خارجیت کی راہ اپنانا ہے۔ درحقیقت افضل جہاد کی فضیلت حکام کے رُوبَرو بالمشافہہ گفتگو کر کے حق بات کہنے سے حاصل ہوگی، کیوں کہ حدیث میں جو "عند" کا لفظ وارد ہے، وہ حضور اور موجودگی کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، لہٰذا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ظالم حکمراں کے پاس حاضر ہو کر بالمشافہہ کلمۂ حق کہنا ہی افضل جہاد ہے، یہی ہمارے سلفِ صالحین کا منہج و طریقہ رہا ہے۔ سیدنا عیاض بن غنم فہری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((مَنْ أَرَادَ أَنْ يَنْصَحَ لِذِيْ سُلْطَانٍ فِي أَمْرٍ فَلَا يُبْدِهِ عَلَانِيَةً وَلَكِنْ لِيَأْخُذْ بِيَدِهِ فَيَخْلُوَ بِهِ فَإِنْ قَبِلَ مِنْهُ فَذَاكَ وَإِلَّا كَانَ قَدْ أَدَّى الَّذِيْ عَلَيْهِ لَهُ)) "جو شخص کسی حکمران کو کسی معاملے میں نصیحت کرنا چاہے تو علانیہ نصیحت نہ کرے، تاہم ہاتھ سے پکڑ کر تنہائی میں لے جا کر نصیحت کرے، اگر وہ اس کی بات قبول کرلے تو بہتر ہے بصورتِ دیگر اس نے اپنی ذمہ داری ادا کردی ہے۔" [تخریج کتاب السنة للألباني : ١٠٩٧ وصححه] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حکام کو کسی بات پر تنبیہ اور نصیحت کرنے کی ضرورت ہو تو ان کے روبرو کی جائے اگر وہ قبول کرلیں تو ٹھیک ہے بصورتِ دیگر آدمی بری الذمہ ہو جاتا ہے، یہی معاملہ دیگر مسلمانوں کے ساتھ بھی کیا جائے گا۔ تاہم یہ بات ضرور ہے کہ ایسے امراء و حکام اور سربراہ قسم کے لوگوں کی صحبت و ہم نشینی سے دوری اختیار کی جائے، کسی بھی طرح سے ان کا ساتھ نہ دیا جائے اور نہ ان کی مدد و معاونت کی جائے۔ جیسا کہ سیدنا ابو سعید خدری اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَيَأْتِيَنَّ عَلَيْكُمْ أُمَرَاءُ يُقَرِّبُونَ شِرَارَ النَّاسِ، وَيُؤَخِّرُونَ الصَّلَاةَ عَنْ مَوَاقِيْتِهَا، فَمَنْ أَدْرَكَ ذَلِكَ مِنْكُمْ فَلَا يَكُونَنَّ عَرِيفًا، وَلَا شُرْطِيًا، وَلَا جَابِيًا، وَلَا خَازِنًا)) "ضرور تم پر ایسے امراء مسلط ہوں گے، جو بدترین لوگوں کو اپنے قریب کریں گے اور نماز کو اس کے وقت سے مؤخر کریں گے، پس جو آدمی ان کا دور پائے تو وہ نہ ان (کی حکومت کا) منتظم بنے، نہ سپاہی، نہ وصول کنندہ اور نہ خزانچی بنے۔" [حسن / صحیح ابن حبان : ٤٥٨٦، وحسنه الألباني في الصحيحة برقم : ٣٦٠]

اس حدیث سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اگر ہمارے امراء و حکّام اور رہبرانِ قوم و ملت میں کسی طرح کی شرعی خرابی آجائے اور انھیں روکنے اور نصیحت کرنے کی طاقت و ہمت نہ ہو تو دل میں برا جانتے ہوئے ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی جائے اور ان سے کسی طرح کا ربط و تعلق نہ رکھا جائے، کیوں کہ ان سے ربط و تعلق رکھنا ان کے بُرے کاموں پر ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہوگا اور عام لوگوں کی نگاہوں میں بھی ان کے بُرے کام مستحسن قرار پائیں گے، جب کہ ہمارے معاشرے کے بیش تر افراد کا عمل اس حدیث کے برخلاف ہے۔ اکثر لوگوں کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ وہ ظالموں اور برائیوں میں لت پت افراد کا ساتھ دیتے ہیں اور انھیں ان کی برائی سے روکنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، جس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی برائی میں شریک ہوتے ہیں۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

اُخوتِ اسلامی اور اس کے تقاضے

(۳۵) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : **((لَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَنَاجَشُوا، وَلَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ، وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا، اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ، وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَكْذِبُهُ، وَلَا يَحْقِرُهُ، اَلتَّقْوَى هَاهُنَا،** وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، **بِحَسْبِ امْرِئٍ مِّنْ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ : دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ))** رَوَاهُ مُسْلِمٌ

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، آپس میں ایک دوسرے کے لیے دھوکے سے قیمتیں نہ بڑھاؤ، ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے کو پیٹھ نہ دکھاؤ یعنی قطع تعلقی نہ کرو، کوئی کسی دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے اور اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے، نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ اس کی تحقیر کرتا ہے۔ تقویٰ یہاں ہے اور آپ نے اپنے سینے کی طرف تین مرتبہ اشارہ فرمایا، آدمی کے بُرا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے، ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، مال اور عزت و آبرو حرام ہے۔" (صحیح مسلم:۲۵۶۴)

شرح و فوائد :

زیرِ مطالعہ حدیثِ مبارکہ میں اسلامی اُخوت و بھائی چارے کی تعلیم دی گئی ہے اور عام طور پر معاشرے میں پائی جانے والی ایسی برائیوں سے روکا گیا ہے کہ جن کی وجہ سے ایک معاشرے کا امن و امان تہ و بالا ہو جاتا ہے اور آپس میں لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ایک پُر امن و مستحکم اور مثالی مسلم معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں پر بسنے والے لوگ آپس میں الفت و محبت کے ساتھ رہیں، ایک دوسرے کے ہمدرد اور خیر خواہ بنیں، اپنی فیض رسانی کو عام رکھیں، کوئی کسی کو نقصان نہ پہنچائے، حسد، بغض، کینہ و کپٹ سے اپنے دلوں کو پاک رکھیں، کسی مسلمان بھائی کو دھوکا نہ دیں، ایک دوسرے سے قطع تعلقی نہ کریں، خود کو بڑا سمجھ کر کسی کی تحقیر نہ کریں اور مسلمانوں کے تمام افراد پر خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے اور امیر ہوں یا غریب، دوسرے مسلمانوں کا خون و مال اور عزت و آبرو حرام ہے۔ یاد رکھیں

دوسرے مسلمانوں کو حقیر سمجھنا تکبر کی علامت ہے، اس سے آدمی کی عزت ووقار میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا، بلکہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھنے والا شخص بدترین انسان قرار پائے گا، اس لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں، حسنِ اخلاق سے پیش آئیں اور اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں اور نہ کسی کا کچھ نقصان کریں تاکہ لوگ آپ سے خیر کی امید رکھیں اور ہرگز ہرگز ایسے اخلاق و کردار کو نہ اپنائیں کہ جس کی وجہ سے لوگوں کی عزت و آبرو اور جان ومال کو خطرہ لاحق ہو جائے اور لوگ آپ سے خیر و بھلائی کی امید رکھنا چھوڑ دیں، اگر ایسا ہوا تو آپ بدترین مخلوق قرار پائیں گے۔

<u>لَا تَحَاسَدُوا :</u> ''ایک دوسرے سے حسد نہ کرو۔'' اللہ نے بندوں میں سے کسی کو جو دینی یا دنیاوی نعمت عطا کر رکھی ہے اس نعمت کے چھن جانے کی تمنا کرنا ''حسد'' کہلاتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے کسی کو مالی، علمی اور فضل و کرامت کی حیثیت سے کمزور بنایا ہے تو اس کے متعلق یہ تمنا رکھنا کہ اس کی حالت نہ بدلے، یا آدمی کسی تگ و دو میں لگا ہوا ہے اس کے بارے میں یہ آرزو کرنا کہ اسے کامیابی نہ ملے وغیرہ بھی حسد میں داخل ہیں۔ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل شدہ موجود نعمت پر حسد کی جاتی ہے اور دوسری صورت میں متوقع نعمت پر حسد کی جاتی ہے اور حسد کی یہ دونوں صورتیں انتہائی مذموم و مبغوض ہیں، نیز کسی کی نعمت کے متعلق صرف یہ خواہش رکھنا کہ بعینہٖ اس کی وہی نعمت اس سے چھن کر مجھے مل جائے یہ بھی حسد ہی کی مذموم صورت ہے۔

حسد کی ایک صورت رشک و غبطہ کی ہے، جسے مجازاً حسد کہہ دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے کسی کو کوئی نعمت عطا کر رکھی ہے تو اس نعمت کے زوال کی خواہش نہ رکھتے ہوئے صرف یہ آرزو و تمنا کرنا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اسی طرح کی نعمت سے نواز دے، جس طرح فلاں پر اپنی نعمتیں نچھاور کی ہیں تاکہ میں بھی اسی طرح کے اچھے اچھے کام کروں وغیرہ، یعنی اسی کے مثل نعمت کی خواہش کرنا جائز و مستحسن اور پسندیدہ امر ہے بس شرط یہ ہے کہ وہ مباح چیزوں میں ہو۔ اسی کو رشک یا غبطہ کہتے ہیں، جو جائز ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''حسد (رشک) جائز نہیں ہے، مگر دو شخصوں کے بارے میں: ایک وہ، جسے اللہ نے مال سے نوازا اور وہ راہِ حق میں اسے خرچ کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ دوسرے وہ، جسے اللہ نے حکمت سے نوازا اور وہ

اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور اس کی تعلیم دیتا ہو۔" [صحیح بخاری:۷۳، صحیح مسلم:۸۱۶]

حسد ایک ایسی دلی و نفسیاتی بیماری ہے، جس کی وجہ سے معاشرے میں آپسی عداوت و دشمنی بڑھتی ہے، لوگ خوش گوار زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں، نیز غیبت و چغل خوری، ظلم و سرکشی اور ناانصافی کا گراف بڑھتا ہے، اسی حسد ہی کی وجہ سے معاشرے میں قتل و خوں ریزی اور چوری و ڈاکہ زنی جیسے حادثات پیش آتے ہیں۔ چناں چہ افرادِ معاشرہ اگر حسد سے دور رہیں اور ان کے دلوں میں کسی کے خلاف حسد نہ پایا جائے تو معاشرہ میں بدامنی نہیں ہو گی، کسی طرح کا کوئی خلفشار نہیں ہو گا، لوگ امن و چین اور خیر و بھلائی میں ہوں گے اور لوگوں پر خیر و برکت کا نزول ہو گا۔ سیدنا ضَمْرَہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ، مَالَمْ يَتَحَاسَدُوا)) "لوگ برابر خیر و بھلائی میں رہیں گے، جب تک کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے حسد نہ کرنے لگیں۔" [اس کی اسناد جید ہے / المعجم الکبیر للطبرانی: ۸۱۵۷، دیکھیے: صحیح الترغیب والترھیب:۲۸۸۷، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ:۳۳۸۶]

حسد ابلیس لعین کا شیوہ، یہود و نصاریٰ کی خصلت اور کفار و مشرکین و منافقین کی عادت ہے، جو کہ انتہائی مذموم و قبیح اور رذالت سے پُر انتہائی گری ہوئی خصلت ہے، جس کسی کے اندر یہ بری خصلت پائی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں پر راضی و قانع نہیں ہوتا ہے۔ گویا حسد انسان کے دین و ایمان کا صفایا کر دیتی ہے اور آپسی الفت و محبت کو نفرت و دشمنی میں بدل دیتی ہے۔ سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تمھارے اندر پہلی امتوں کا ایک مرض در آیا ہے اور وہ حسد اور بغض کی بیماری ہے۔ یہ مونڈنے والی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ سر کا بال مونڈنے والی ہے، لیکن یہ دین کو مونڈنے والی ہے۔ اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم لوگ جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہوگے، جب تک کہ ایمان نہ لے آؤ اور تم اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے، جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرنے لگو۔ کیا میں تمھیں ایسی بات نہ بتاؤں جس کے کرنے سے تمھارے درمیان محبت پیدا ہو جائے؟ آپس میں سلام کو پھیلاؤ" [حسن / سنن ترمذی: ۲۵۱۰، مسند احمد: ۱۴۱۲، شیخ زبیر علی زئی نے اس روایت کی تضعیف کی ہے

(أنوار الصحیفۃ، ص: ۲۶۰) جب کہ شیخ البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ السراج المنیر ۲/ ۹۸۵، سلام سے متعلق حدیث کا ٹکڑا صحیح مسلم: ۵۴ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔]

نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنا حسد نہیں ہے، یہ جائز ہی نہیں مستحب اور پسندیدہ عمل ہے، کتاب و سنت میں اس کی ترغیب دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿...فَٱسْتَبِقُوا۟ ٱلْخَيْرَٰتِ...﴾ ”پس نیکیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔“ [البقرۃ:۱۴۸]

وَلَا تَنَاجَشُوا : ”ایک دوسرے کے لیے دھوکے سے قیمتیں نہ بڑھاؤ۔“ تناجش کا معنی ہے دھوکا دینے کے لیے بیع وغیرہ میں بڑھ چڑھ کر بولی لگانا اور مبالغہ کی حد تک اشیاء کی تعریف کرنا یعنی آدمی سامان خریدنے کا ارادہ نہ رکھے بلکہ سامان کو مارکیٹ میں عام کرنے کی نیت سے اس کی تعریف کرے اور اس کے اوصاف گنائے یا صرف گاہک کو دھوکا دینے کے لیے زیادہ قیمت لگائے تاکہ کوئی ضرورت مند پھنس جائے اور زیادہ قیمت دینے پر راضی ہو جائے۔ عام طور پر ایسے لوگ دکان دار کے پالتو ایجنٹ ہوتے ہیں جو کمیشن لیتے ہیں اور محض مول بھاؤ کر کے سامان کی قیمت بڑھاتے ہیں۔ یہ دھوکا دہی اور ظلم ہونے کی بنا پر حرام ہے، اس کی وجہ سے ضرورت مند خریدار کو ضرر پہنچتا ہے، کئی حدیثوں میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ فقہی اصطلاح میں اسے ”بیع مُزایدہ“ کہتے ہیں۔ تاہم اگر کوئی حقیقت میں سامان خریدنے کے لیے بولی لگائے اور سامان کی قیمت بڑھائے تو یہ جائز ہے۔

وَلَا تَبَاغَضُوا : ”ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو۔“ باہم دشمنی رکھنے اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے کو تباغض کہتے ہیں۔ دراصل بغض اس دلی کیفیت کا نام ہے، جسے انسان ایک دوسرے سے عداوت و دشمنی کی بنیاد پر اپنے دل میں رکھتا ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور دشمنی رکھنا ایمان کے منافی ہے اور اسلامی اُخوت کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تو شیطانی حربہ ہے کہ جس کے ذریعہ وہ مؤمنین کے درمیان بغض وعداوت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسلامی اُخوت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے سے محبت کریں، ایسے اقوال و افعال سے بچیں جن سے دلوں میں کدورت اور بغض پیدا ہو اور اگر دو لوگوں کے درمیان اختلاف یا لڑائی ہو جائے تو باہم صلح کرا دیں۔ اللہ نے فرمایا: ﴿إِنَّمَا

الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ...﴾ ”مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ۔“ [الحجرات: ۱۰] اسی اُخوت کو بڑھاوا دینے کے لیے جن امور سے باہمی الفت و محبت پیدا ہوتی ہے انھیں اپنانے کا حکم دیا گیا ہے اور جن سے نفرت وعداوت اور دلوں میں دوری پیدا ہوتی ہے یا جو اسباب باہمی بغض و عناد کی طرف لے جانے والے ہیں ان سے قطعی طور پر روک دیا گیا ہے اور ان کی طرف لے جانے والے راستوں کو بھی اسلام نے بند کر دیا ہے۔ آپس میں محبت کرنا کمالِ ایمان کا ذریعہ ہے، اس لیے اسے واجب قرار دیا گیا ہے اور غیبت و چغل خوری اور باہم لگائی بُجھائی سے نفرت پیدا ہوتی ہے، اس لیے اس سے روکا گیا ہے۔ جان لیں کہ آپس میں دشمنی رکھنا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ بندے کی مغفرت نہیں فرماتا ہے جب تک کہ وہ آپس میں صلح نہ کر لیں۔ [دیکھیے: صحیح مسلم: ۲۵۶۵] لیکن اگر اس طرح کا مقاطعہ اور آپسی میل جول اور گفتگو کا ترک کرنا محض اللہ کے لیے ہو تو اس پر یہ وعید جاری نہیں ہو گی۔

<u>وَلَا تَدَابَرُوا :</u> ”ایک دوسرے کو پیٹھ نہ دکھاؤ یعنی قطع تعلقی نہ کرو۔“ تدابر کے معنی ہیں ایک دوسرے سے اعراض و قطع تعلقی کرنا اور باہم دشمن ہونا۔ باہم قطع تعلقی کرنا اسی ممانعت کی بنیاد پر حرام ہے، لہٰذا جب ایک دوسرے کا سامنا ہو تو سلام کرو ایسا نہ ہو کہ سلام کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے منھ پھیر لو اور اگر کبھی آپس میں ناچاقی، تنگ مزاجی اور زود رنجی ہو جائے تو سلام کرنے میں پہل کرو، کیوں کہ شرعی عذر کے بغیر آپسی اختلاف کی وجہ سے باہمی مقاطعہ کو تین دن سے زیادہ طول دینا حرام ہے، اس لیے اختلاف ہونے کی صورت میں تین دن کے اندر ہی باہم میل ملاپ کر لینا چاہیے، اس سے زیادہ طول دینا شدید وعید کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

◙ ”کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین رات سے زیادہ قطع تعلقی رکھے۔ جب دونوں ملیں تو یہ اپنا منھ پھیر لے اور وہ اپنا منھ پھیر لے۔ ان دونوں میں بہتر انسان وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔“ [صحیح بخاری: ۶۰۷۷، صحیح مسلم: ۲۵۶۰]

◙ ”کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین (دن) سے زیادہ قطع تعلقی رکھے۔ پس جو تین (دن) سے زیادہ قطع تعلقی رکھے اور (توبہ کے بغیر اسی حالت میں) مر جائے تو وہ جہنم میں

داخل ہو گا۔" [صحیح / سنن أبو داود: ۴۹۱۴، مسند احمد: ۹۰۹۲]

◙ "جس نے اپنے بھائی سے ایک سال تک قطع تعلقی رکھا تو یہ اس کے خون بہانے کی طرح ہے۔" [صحیح / سنن أبو داود: ۴۹۱۵، مسند احمد: ۱۷۹۳۵]

تاہم اللہ کے لیے کفار و مشرکین، اہلِ بدعت و ضلالت اور منکرینِ اسلام سے قطع تعلقی کرنا اور ان سے بغض و نفرت رکھنا واجب ہے اور یہ ایمان کا حصہ ہے۔ اسی طرح کسی شرعی عذر کی وجہ سے یا بسا اوقات گناہ گار مسلمانوں سے یا بطور تادیب اولاد و ازواج سے مقاطعہ کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ کسی شرعی عذر کے بغیر غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے تین صحابۂ کرام سے نبوی حکم کے بموجب پچاس دنوں تک مقاطعہ اور بائیکاٹ کیا گیا تھا۔ [دیکھیے: التوبۃ : ۱۱۸، صحیح بخاری: ۴۴۱۸، صحیح مسلم: ۲۷۶۹] اسی طرح نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ازواجِ مطہرات سے مسلسل ایک ماہ تک بائیکاٹ کیا تھا۔ [دیکھیے: صحیح بخاری: ۲۴۶۸]

وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ : "تم میں سے کوئی کسی دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔" سودے پر سودا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کوئی چیز خرید رہا ہے اور وہ کہتا ہے: میں اس سامان کی اتنی قیمت دوں گا اور ابھی دونوں کے درمیان بات چیت چل رہی ہو کہ دوسرا آدمی اس سے زیادہ قیمت پیش کرنے لگے تاکہ پہلا آدمی دھوکا کھا کر وہ سامان زیادہ قیمت پر خرید لے یا خود ہی زیادہ قیمت دے کر وہ خود سامان خرید لے اور پہلا محروم ہو جائے۔ اسی طرح سودے پر سودا کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص خریدنے والے سے کہے: تو نے جو چیز خریدی ہے واپس کر دے، میں تجھے وہی چیز اس سے کم قیمت پر دوں گا، یا بیچنے والے سے کہے: جو چیز تم نے بیچی ہے واپس لے لو، میں تمھیں اس سے زیادہ قیمت دوں گا۔ دھوکا پر مشتمل بیع کی یہ صورتیں ممنوع قرار پائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب خریدنے اور بیچنے والے کسی قیمت پر متفق ہو جائیں یا خرید و فروخت سے متعلق دونوں کے درمیان گفتگو چل رہی ہو تو ان کے درمیان کسی تیسرے فرد کو دخل دینا قطعاً جائز نہیں ہے۔ تاہم دونوں کے درمیان سودا طے نہ ہو پائے اور خرید و فرخت کی بات ختم ہو جائے تو پھر تیسرا فرد ان سے مول بھاؤ کر سکتا ہے۔

وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا : "اور اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔" ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہوتا ہے، اس کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی پر نہ ظلم کرے، نہ

اسے بے یار و مدد گار چھوڑے اور نہ اس کی تحقیر و تذلیل کرے، بلکہ ممکن حد تک اپنی ذات سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے اور اللہ کی بندگی کرتے ہوئے اس طرح رہے کہ لوگ اس سے خیر و بھلائی اور نفع کی امید رکھیں۔ اللہ کا بندہ بننے کا مطلب عبودیتِ خاصہ کا اہتمام کرنا ہے یعنی اللہ کی عبادت اور اس کی اطاعت و فرماں برداری کرنا، رہی بات عبودیتِ عامہ کی تو ساری خِلقت اللہ کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں۔ اللہ کی بندگی اسی وقت پوری ہوگی جب ایمانی اخوت کی رعایت کی جائے گی۔

وَلَا يَخْذُلُهُ : "اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔" **خَذَلَ يَخْذُلُ خُذْلَانًا**، کے معنی ہیں: مدد و اعانت سے ہاتھ کھینچ لینا، بے یار و مددگار چھوڑ دینا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَإِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ﴾ "اور اگر وہ تمھارا ساتھ چھوڑ دے تو وہ کون ہے جو اس کے بعد تمھاری مدد کرے گا۔" [آل عمران: ۱۶۰] حدیث کے اس ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو ایسے موقع پر بے یار و مددگار نہ چھوڑیں جب کہ اسے مدد کی ضرورت ہو۔ اُخوتِ اسلامی کا تقاضا ہے کہ جب کبھی کسی مسلمان بھائی کو کسی بھی ناحیہ سے مدد کی ضرورت ہو اور آپ کے پاس مدد نہ کرنے کا کوئی شرعی عذر نہ ہو اور آپ کے لیے مدد کرنا ممکن بھی ہو تو اپنے مسلمان بھائی کی مدد و اعانت کرنا ضروری ہے۔ مظلوم مسلمانوں کی مدد نہ کرنا، سچی گواہی کو چھپانا اور فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی پاداش میں ستائے جانے والے علماء و دعاۃ کی مدد نہ کرنا وغیرہ خذلان کی صورتیں ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس جرم کا شکار نظر آتی ہے۔ جب کہ اللہ نے نیکی اور تقویٰ کی بنیاد پر ایک دوسرے کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے۔ [المائدہ: ۲] اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے بھائی کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس پر ایک صحابیِ رسول نے دریافت فرمایا: اے اللہ کے رسول! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کروں گا، لیکن ظالم کی کس طرح مدد کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اسے اس کے ظلم سے روک دو، یہی اس کی مدد ہے۔" [صحیح بخاری: ۲۴۴۴، ۶۹۵۲، صحیح مسلم: ۲۵۸۴]

اَلتَّقْوَى هَاهُنَا، وَيُشِيْرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ : نبی کریم ﷺ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہے یعنی تقویٰ کا محل سینے میں موجود دل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دل میں اللہ کی عظمت و ہیبت، خوف و خشیت اور خلوص و نیک نیتی کا پایا جانا اور اس کی کامل نگرانی کا اعتقاد

رکھنا۔ خلوص و تقویٰ کے بغیر محض اعمالِ صالحہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور ظاہری اقوال و اعمال میں کجی و انحراف دل کے تقویٰ کے ضعف و کمزوری کی علامت ہے۔ ظاہری اقوال و اعمال اور دلی تقویٰ میں یگانگت کا پایا جانا اور دونوں کا درست ہونا کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ اس بات کی صراحت نبی ﷺ کے اس فرمان میں پائی جاتی ہے:

((إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ))

”یقیناً اللہ تمھاری صورتوں اور تمھارے مالوں کو نہیں دیکھتا، لیکن وہ تمھارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔“ [صحیح مسلم : ۲۵۶۴]

اس سے یہ معلوم ہوا کہ تقویٰ کا تعلق انسان کے اندرونی معاملے سے ہوتا ہے، جس کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں ہوتا ہے، اس لیے اپنے آپ کو زہد و ورع کا پیکر سمجھتے ہوئے کسی مسلمان بھائی کی تحقیر نہیں کرنی چاہیے، ممکن ہے کہ جس کو حقیر سمجھا جا رہا ہے وہ اللہ کے نزدیک حقیر سمجھنے والے شخص سے بہتر و برتر ہو۔ چند معاشرتی برائیوں پر قدغن لگاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا يَسۡخَرۡ قَوۡمٞ مِّن قَوۡمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُواْ خَيۡرٗا مِّنۡهُمۡ وَلَا نِسَآءٞ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيۡرٗا مِّنۡهُنَّۖ وَلَا تَلۡمِزُوٓاْ أَنفُسَكُمۡ وَلَا تَنَابَزُواْ بِٱلۡأَلۡقَٰبِۖ بِئۡسَ ٱلِٱسۡمُ ٱلۡفُسُوقُ بَعۡدَ ٱلۡإِيمَٰنِۚ وَمَن لَّمۡ يَتُبۡ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ۝ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱجۡتَنِبُواْ كَثِيرٗا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعۡضَ ٱلظَّنِّ إِثۡمٞۖ وَلَا تَجَسَّسُواْ وَلَا يَغۡتَب بَّعۡضُكُم بَعۡضًاۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمۡ أَن يَأۡكُلَ لَحۡمَ أَخِيهِ مَيۡتٗا فَكَرِهۡتُمُوهُۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَۚ إِنَّ ٱللَّهَ تَوَّابٞ رَّحِيمٞ ۝ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقۡنَٰكُم مِّن ذَكَرٖ وَأُنثَىٰ وَجَعَلۡنَٰكُمۡ شُعُوبٗا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓاْۚ إِنَّ أَكۡرَمَكُمۡ عِندَ ٱللَّهِ أَتۡقَىٰكُمۡۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٞ﴾

ترجمہ: ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور اپنے لوگوں پر عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو، ایمان کے بعد فاسق ہونا برا نام ہے

اور جو توبہ نہ کریں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے بچو، بے شک بعض گمان گناہ ہیں اور ٹوہ میں نہ لگو اور تم میں سے کوئی کسی دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ سو تم خود اس کو ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہے۔ اے لوگو! بے شک ہم نے تمھیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تمھیں قومیں اور قبیلے بنا دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سب سے عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے۔" [الحجرات:۱۱-۱۳]

زیرِ مطالعہ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی آدمی کے برا ہونے کے لیے صرف یہی کافی ہے کہ وہ دوسرے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے اور اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھے، جب کہ ہر مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کا جان ومال اور عزت و آبرو قابلِ احترام ہیں۔ چناں چہ کسی مسلمان کی جان لینا یا اسے زخمی کرنا، اس کا مال ہڑپ کرنا یا اسے کسی طرح سے ذلیل کرنا یا ذلیل سمجھنا اور ناحق کسی مسلمان بھائی کو کسی بھی طرح سے اذیت دینا حرام ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بلا وجہ کسی بھی مومن شخص کے اذیت دینے کو بہت بڑا بہتان اور صریح گناہ قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا﴾ "اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف دیتے ہیں، بغیر کسی گناہ کے جو انھوں نے کمایا ہو تو یقیناً انھوں نے بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" [الأحزاب:۵۸]

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ، وَأَمْوَالَكُمْ، وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا، فِي شَهْرِكُمْ هَذَا)) "پس بے شک تمھارا خون، تمھارے اموال اور تمھاری عزتیں تم پر اسی طرح حرام ہیں، جس طرح اس دن (یوم النحر) کی حرمت تمھارے اس مہینے (ذوالحجہ) اور اس شہر (مکہ) میں ہے۔" [صحیح بخاری:۱۷۳۹، صحیح مسلم:۱۶۷۹]

چند اعمالِ صالحہ کی ترغیب و فضیلت

(۳۶) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ. وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ، يَسَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. وَاللَّهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ. وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا، سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ بِهِ طَرِيْقًا إِلَى الْجَنَّةِ. وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللَّهِ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ، وَيَتَدَارَسُونَهُ فِيمَا بَيْنَهُمْ؛ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللَّهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ. وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ بِهَذَا اللَّفْظِ

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ”جس شخص نے کسی مومن کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کی تو اللہ اس سے قیامت کے دن کی کوئی تکلیف دور کرے گا اور جس شخص نے کسی تنگ دست پر آسانی کی تو اللہ اس پر دنیا و آخرت میں آسانی فرمائے گا، جس نے کسی مسلمان کی عیب پوشی کی تو اللہ دنیا و آخرت میں اس کی عیب پوشی فرمائے گا اور اللہ بندے کی مدد میں رہتا ہے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے اور جس شخص نے طلبِ علم کے لیے کوئی سفر کیا تو اللہ اس وجہ سے اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔ جب کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں اکٹھے ہو کر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور آپس میں پڑھتے پڑھاتے ہیں تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے، رحمت اُنھیں ڈھانپ لیتی ہے، فرشتے انھیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ اپنے پاس موجود فرشتوں میں ان کا تذکرہ فرماتا ہے اور جس کے عمل نے اسے پیچھے کر دیا تو اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکتا۔“ (صحیح مسلم : ۲۶۹۹)

شرح و فوائد :

نَفَّسَ : (تفعیل) غم و تکلیف دور کرنا، دل کو تسلی اور سکون بخشنا، کسی کو آسودہ اور خوش حال کرنا۔
كُرْبَةً : غم، رنج و ملال، ایسی تکلیف جس سے دل پریشان ہو۔ ج: كُرَب۔ يَسَّرَ : (تفعیل) آسانی کرنا، کسی کے لیے کوئی چیز فراہم کرنا۔ مُعْسِرٍ : مفلس و تنگ دست، تنگ حال ((وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى

مُعْسِرٍ)) "جو تنگ دست پر آسانی کرے" اس کا مطلب یہ ہے کہ مقروض و مفلس کی مالی معاونت کی جائے کہ اس سے اس کی پریشانی دور ہو جائے، خود کا معاملہ ہو تو قرض کو معاف کر دیا جائے یا ادائیگی میں مہلت دے دی جائے یا واجب الحق مال میں سے کچھ حصہ چھوڑ دیا جائے، یہ نہایت ہی نیک اور مستحب عمل ہے۔ سَلَكَ : سَلَكَ يَسْلُكُ سَلْكًا وَسُلُوكًا : داخل ہونا، چلنا۔ طَرِيقًا : راستہ خواہ قریب ہو یا بعید ہو۔ يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا : جس میں علم کو تلاش کرے، یہاں عِلْمًا نکرہ ہے، جو دینی علوم کی تمام قسموں کو شامل ہے خواہ کم ہو یا زیادہ، جب کہ اس سے ثواب، نفع اٹھانے اور نفع پہنچانے کی نیت کی جائے، اس سے حصولِ علم کے لیے رختِ سفر باندھنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔ اَلسَّكِينَةُ : اطمینان و سکون، سنجیدگی و وقار۔ بَطَّأَ : (تفعیل) کسی کو کام سے ہٹا دینا، سست بنا دینا، دیر کرنا اور مسند احمد و ابن ماجہ وغیرہ کی کچھ روایتوں میں بَطَّأَ کے بجائے أَبْطَأَ (افعال) وارد ہے، دونوں کا مفہوم ایک ہے۔

یہ انتہائی جامع حدیث ہے۔ اس میں بہت سے نیک اعمال کی ترغیب دی گئی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "یہ انتہائی عظیم حدیث ہے، علوم و قواعد اور آداب کی مختلف انواع کو سموئے ہوئے ہے۔" [المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج ص:۱۵۹۱] حقیقت یہ ہے کہ اگر اس حدیث پر عمل ہو جائے تو عام معاشرتی مسائل ختم ہو جائیں گے، آپسی اختلاف و ناچاقی اور ناخوش گواری کی جگہ الفت و محبت اور ایثار و ہمدردی پیدا ہو جائے گی اور باہمی معاملات سدھر جائیں گے، جس سے دنیا امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے گی۔

بنیادی طور یہ حدیث باہمی الفت و محبت پر ابھارتی ہے، چناں چہ مسلمانوں کی حاجات و ضروریات کا خیال رکھنا اور مال و دولت، علم و ہنر، باہمی تعاون اور نصیحت و خیر خواہی کے ذریعہ ان کی مدد کرنا، ہر طرح سے ان کو نفع پہنچانا، ان کی تکلیف و پریشانی کو دور کر کے ان کے کام آنا، تنگ دستوں کے لیے سہولت و آسانی فراہم کرنا اور مسلمانوں کے عیوب کی پردہ پوشی کرنا بڑی فضیلت والا عمل ہے، اللہ تعالیٰ ایسوں کی مدد فرماتا ہے، ان کی ضروریات کو پوری کرتا ہے، ان کے عیوب کی پردہ پوشی فرماتا ہے اور آخرت میں بھی اُنھیں اجرِ عظیم سے نوازے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اعمال کے جنس کے اعتبار سے بدلہ ملتا ہے، جیسا کہ اور دیگر روایات میں بھی یہ مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اعمالِ صالحہ کا بدلہ صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی دیا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور کمالِ عدل ہے

کہ وہ عمل سے کہیں زیادہ بدلہ وثواب عطا فرماتا ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کا ثواب دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک بلکہ اس سے زیادہ بھی دیتا ہے اور نیکی کے ارادے پر بھی ثواب دیتا ہے۔

قیامت کا دن اور اس کا منظر بڑا ہولناک ہو گا، ہر شخص نفسی نفسی میں مبتلا ہو گا اور کافروں پر یہ دن انتہائی سخت ہو گا، مگر مؤمنین پر ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کے مطابق اللہ تعالیٰ آسانی فرمائے گا، اس لیے اپنے پریشان حال تنگ دست بھائیوں پر آسانی کریں تاکہ آپ پر بھی آسانی کی جائے۔

واضح رہے کہ مسلمان بھائی کی مدد صرف نیکی کے کاموں میں کرنی چاہیے، غلط کاموں میں ان کا معاون نہیں بننا چاہیے، تاہم غلط کام میں مدد کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسے اس غلط کام اور گناہ سے حتی المقدور روکا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ﴾ ”اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔“ [المائدۃ:۲]

نیز سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا)) ”تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم“ ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جب وہ مظلوم ہو، میں اس کی مدد کروں گا، لیکن اگر وہ ظالم ہو تو پھر میں اس کی مدد کس طرح کروں؟ فرمایا: ((تَحْجُزُهُ - أَوْ تَمْنَعُهُ - مِنَ الظُّلْمِ، فَإِنَّ ذَلِكَ نَصْرُهُ)) ”اس وقت اس کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روک دو۔“ [صحیح بخاری:۶۹۵۲]

❁ مسلمان کی پردہ پوشی کا مطلب یہ ہے کہ پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنے اور غیبت کرنے سے بچا جائے، اس کی پوشیدہ باتوں اور کوتاہیوں کی ٹوہ میں لگ کر اس کی تشہیر نہ کی جائے، اس کی ایسی باتوں کو منظرِ عام پر نہ لایا جائے جس سے اسے تکلیف یا نقصان پہنچے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ لوگوں کے عام و سماجی جرائم کی پردہ پوشی کی جائے یا ان کی دینی و اخلاقی خرابیوں سے صرفِ نظر کر کے ان کے حق میں جھوٹی گواہی دی جائے، چناں چہ اگر کسی کی غلطیاں، جرائم، تباہ کن عقائد و نظریات عام ہوں تو لوگوں کو اس سے دور رکھنے کے لیے اس کا بیان کرنا جائز ہے، جس طرح حدیث کی صحت و ضعف کی معرفت کے لیے رُواۃ کی تجریح یا تعدیل کرنا واجب ہے۔ مظلوم کا ظالم کے خلاف شکایت کرتے ہوئے اس کے عیوب

کو ظاہر کرنا یا مشورہ دیتے وقت کسی کے عیوب کی نشاندہی کرنا یا استفتاء کے وقت مفتی کے سامنے حالات کو بیان کرنا جائز ہے اور اگر کوئی شخص کسی کے منکَر کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے تو کسی ایسی شخصیت سے اس کا ذکر کرنا جو اسے روک سکے جائز ہو گا، اسی طرح جو لوگ علانیہ طور پر گناہوں کا ارتکاب کریں اور اس پر شرمندہ ہونے کے بجائے فخر محسوس کریں تو ان کی برائی کو بھی بیان کرنا جائز ہے تاکہ عام مسلمان اس کے شرور و فتن سے محفوظ رہیں۔ البتہ خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان بھائی میں کوئی کمی پائی جاتی ہے تو پہلے خود ہی حکمت کے ساتھ اسے اس کے اندر پائی جانے والی برائی سے روکا جائے۔

❁ اس حدیث سے علم، اہلِ علم اور طلبِ علم کے لیے سفر کرنے کی اہمیت و فضیلت ثابت ہونے کے علاوہ اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ حصولِ علم، تقربِ الٰہی اور دخولِ جنت کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ حصولِ علم کے لیے حسی راہوں کو اپنانا مثلاً علماء کی مجلسوں میں چل کر جانا، طلبِ علم کے لیے سفر کرنا اور علمی حلقات و مجالس میں شریک ہونا یا معنوی راہوں کو اختیار کرنا مثلاً کتاب و سنت کے نصوص کو یاد کرنا، مذاکرہ کرنا، مطالعہ کرنا، لکھنا پڑھنا اور شرعی نصوص کے معنیٰ و مفہوم کو سمجھنے کے لیے ان میں غور و فکر کرنا وغیرہ دونوں کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ یہاں علم سے مراد کتاب و سنت پر مشتمل شرعی علم ہے اور یہ فضیلت اسی وقت حاصل ہو گی جب حصولِ علم کا مقصود و مطلوب خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی ہو، جیسا کہ دیگر نصوص سے معلوم ہوتا ہے، بلکہ ہر عمل کی قبولیت کا انحصار نیت کی درستی پر ہے۔ جب کہ ہمارے اس دور میں عوام تو درکنار اہلِ علم کا ایک بڑا طبقہ بھی اخلاصِ نیت کے معاملے میں غفلت کا شکار ہے۔ اللہ رب العزت ہماری نیتوں میں خلوص وللّٰہیت اور پاکیزگی عطا فرمائے۔ آمین!

❁ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت اور اس کی تعلیم و تدریس کے لیے مساجد میں اکٹھا ہونا انتہائی فضیلت والا عمل ہے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو روحانی طمانیت اور اپنی بے پایاں کلی رحمت سے نوازتا ہے، فرشتے ان کی مجلسوں میں حاضر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے مقرب فرشتوں میں ان کا ذکرِ خیر فرماتا ہے، اسی طرح صحیح مسلم [برقم : ۲۷۰۰] کی ایک دوسری روایت کی عمومیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کے علاوہ مکاتب و مدارس، دینی معاہد و جامعات اور دیگر مقامات پر جمع ہو کر قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے درس و تدریس سے بھی یہ فضیلت حاصل ہو گی۔ ان شاء اللہ

❁ اللہ کے یہاں عملِ صالح کی قدر و منزلت ہے، خاندانی برتری کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے، جس کا عمل کم یا ناقص ہو گا وہ نیک عمل کرنے والے کے مقام و مرتبے کو نہیں پا سکتا ہے، اس لیے حسب و نسب کی برتری سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ روزِ قیامت حسب و نسب کی بلندی سے کوئی رتبہ یا جہنم سے نجات نہیں ملنے والی ہے، بلکہ انسان کا اپنا عملِ صالح کام آئے گا۔ گویا اُخروی شرف و فضیلت کا دار و مدار صرف اور صرف نیک اعمال پر ہے نہ کہ حسب و نسب پر ہے، لہٰذا یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیں کہ جہنم سے نجات اور جنت میں داخلہ صرف اور صرف درست ایمان اور اعمالِ صالحہ سے حاصل ہو گی۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خاندان والوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہوئے اپنی لختِ جگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے واضح طور پر فرمایا کہ اے میری بیٹی فاطمہ! میرے مال سے جو چاہو مانگ لو میں اللہ کے یہاں تیرے کچھ کام نہیں آؤں گا۔ [صحیح بخاری: ۲۷۵۳، صحیح مسلم: ۲۰۶] اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے فاطمہ! اپنے آپ کو (جہنم کی) آگ سے بچا لو، میں اللہ کے سامنے تمھارے لیے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا تمھارے ساتھ رشتہ ہے، اسے میں اسی طرح نبھاؤں گا جس طرح نبھانا چاہیے۔“ [صحیح مسلم: ۲۰۴]

البتہ ایمان و عمل کی درستی کے ساتھ شرفِ نسب ثواب میں اضافہ کا باعث تو نہیں ہوتی ہے، مگر شریعت کے بعض احکام میں اختصاص کا پہلو رکھتی ہے۔ مثلاً خلافت کے لیے قریش کو اوّلیت دینا اور بنو ہاشم پر صدقے کا حرام ہونا وغیرہ۔ دراصل انسان افضل و اشرف نسب کی بنیاد پر اسی وقت معزز ہو گا جب اللہ اسے دین کی سمجھ بوجھ سے بھی نوازے گا اور اس کے مطابق عمل کی توفیق دے گا ورنہ بہترین نسب ہونے کے باوجود وہ اللہ کے نزدیک معزز و مکرم مخلوق کا درجہ نہیں پا سکتا بلکہ عمل میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے دوسروں کے بالمقابل انتہائی بدترین مخلوق ہو گا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الإِسْلَامِ إِذَا فَقُهُوا)) ”تم میں سے جو لوگ زمانہ جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہوں گے بشرطیکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔“ [صحیح بخاری: ۳۳۷۴، صحیح مسلم: ۲۳۷۸]

نیکی اور برائی سے متعلق اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم

(۳۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا يَرْوِيهِ عَنْ رَبِّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى، قَالَ : ((**إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ، ثُمَّ بَيَّنَ ذَلِكَ، فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللَّهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً، وَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللَّهُ عِنْدَهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ إِلَى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ إِلَى أَضْعَافٍ كَثِيرَةٍ، وَإِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللَّهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً، وَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللَّهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ فِي صَحِيْحَيْهِمَا بِهَذِهِ الْحُرُوْفِ

ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب تبارک و تعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے بیان فرمایا: ”بے شک اللہ نے نیکیوں اور برائیوں کو لکھ دیا ہے، پھر انھیں واضح طور پر بیان کر دیا ہے، پس جس کسی نے نیکی کا اردہ کیا، لیکن اس پر عمل نہیں کیا تو اللہ نے اسے اس کے لیے اپنے پاس ایک پوری نیکی لکھ دی اور اگر نیکی کا اردہ کیا اور اس پر عمل بھی کر لیا تو اللہ نے اس کے لیے اسے اپنے یہاں دس گنا سے سات سو گنا تک یا اس سے زیادہ گنا تک نیکیاں لکھ لیا اور جس کسی نے کسی برائی کا اردہ کیا اور اس کا ارتکاب نہیں کیا تو اللہ نے اس کے لیے اسے ایک پوری نیکی لکھ دی اور اگر اس نے برائی کا اردہ کیا اور اس پر عمل بھی کر لیا تو اللہ نے اسے اس کے لیے ایک برائی لکھ دی۔“ (اسے امام بخاری [برقم: ۶۴۹۱] اور امام مسلم [برقم: ۱۳۱] نے انھیں الفاظ کے ساتھ اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔)

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ”میرے بھائی! اللہ ہمیں اور آپ کو نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔ ذرا اللہ تعالیٰ کے لطفِ عظیم کو دیکھیں اور ان الفاظ پر غور کریں! عِنْدَهُ : ”اپنے پاس“ اس سے اعمال کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔ كَامِلَةً : ”مکمل“ یہ لفظ تاکید کے لیے ہے اور اعمال کی شدتِ اہمیت کو واضح کر رہا ہے۔ مزید لطف و کرم دیکھیے کہ انسان جس برائی کا ارادہ کرنے کے بعد اسے ترک کر دے، اس کے بارے میں فرمایا: اللہ اسے اپنے پاس مکمل نیکی درج کرتا ہے۔ یہاں بھی لفظِ ”كَامِلَةً“ کے ذریعہ اسے مؤکد کیا ہے اور اگر گناہ کر بیٹھے تو اسے صرف ایک گناہ لکھتا ہے اور اس کے لیے ”وَاحِدَةً“ کا تاکیدی لفظ استعمال کر کے گناہ کی قلت کو واضح کیا ہے اور اس کے ساتھ ”كَامِلَةً“ کا تاکیدی لفظ نہیں استعمال کیا ہے۔ ہر قسم کی تعریف اور احسان اللہ سبحانہ کے لیے ہے، ہم کماحقہ اس کی ثنا نہیں کر سکتے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔“

شرح و فوائد :

اس ربانی حدیث میں نیکی کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ورأفت اور برائی کرنے والوں پر اس کے عدل کا بیان ہوا ہے، جو وہ دنیا میں اپنے بندوں کے ساتھ کرتا ہے۔ بندۂ مومن اگر نیکی کا پختہ ارادہ کرلے اور اسے انجام بھی نہ دے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور جب نیکی کو انجام دے لے تو ربِ کائنات اس نیکی میں کم از کم دس گنا اضافہ فرماتا ہے اور بندے کے حسنِ اسلام، خوف و خشیت اور کمالِ اخلاص کی بدولت نیکی کو سات سو گنا تک بڑھا دیتا ہے بلکہ اللہ نیکی کو سات سو گنا سے زیادہ بھی بے حساب بڑھا دیتا ہے، جیسا کہ اسی حدیث میں کئی گنا تک بڑھانے کی بات کہی گئی ہے نیز قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرنے والے کی مثال ایک دانے کو سات سو دانوں تک بڑھانے کے ساتھ اس سے بھی زیادہ بڑھانے کی بات فرمائی ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿...وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ...﴾ ”اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔“ [البقرة:٢٦١] ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے صابرین کی نیکیوں پر بے حساب اجر دینے کی بات کہی ہے، فرمایا: ﴿...اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ ”صرف صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر پورا پورا دیا جائے گا۔“ [الزمر:١٠]

اس حدیث میں وارد کلمہ ”هَمّ“ یعنی ارادہ سے مراد عزم اور پختہ ارادہ ہے، اس سے محض وسوسۂ نفس مراد نہیں ہے۔ رہی بات عام وساوس اور بُرے خیالات کی خواہ وہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری وہ بھی معاف ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا ٱكْتَسَبَتْ ۗ...﴾

”اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا، جو نیکی وہ کرے گا وہ اسی کے لیے ہے اور جو برائی وہ کرے گا اس کا وبال اسی پر ہے۔“ [البقرة:٢٨٦]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّ اللَّهَ تَجَاوَزَ لِي عَنْ أُمَّتِي مَا وَسْوَسَتْ بِهِ صُدُورُهَا، مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَكَلَّمْ)) ”اللہ تعالیٰ نے میرے لیے میری امت کے سینوں میں پیدا ہونے والے وسوسوں کو معاف کر دیا ہے، جب تک کہ وہ ان پر عمل نہ کریں یا زبان

پر نہ لے آئیں۔“ [صحیح بخاری:۲۵۲۸، صحیح مسلم:۱۲۷]

زیرِ مطالعہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکیوں اور برائیوں کے وقوع اور ان کے اجر اور عقاب کو اللہ نے لکھ دیا ہے اور اسی لکھی تقدیر کے مطابق بندے اپنی مشیت و ارادے سے اچھائیاں یا برائیاں کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے اسی کے شایانِ شان افعال کا اثبات بھی ہوتا ہے کہ اس نے لکھا، خواہ فرشتوں کو لکھنے کا حکم دیا یا خود اپنے ہاتھ سے لکھا، جیسا کہ ایک نبوی فرمان میں ہے:

((كَتَبَ لَكَ التَّوْرَاةَ بِيَدِهِ)) ”تیرے لیے تورات کو اپنے ہاتھ سے لکھا۔“ [صحیح مسلم:۲۶۵۲]

نیز اس سے یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ نامۂ اعمال کا رجسٹر تیار کرنے والے فرشتے اعمالِ ظاہرہ کے علاوہ اعمالِ قلوب کو بھی لکھتے ہیں اور جو کچھ آدمی اپنے دل میں ارادہ کرتا ہے وہ اس سے باخبر ہوتے ہیں خواہ اللہ انھیں فوری باخبر کرتا ہو یا انھیں ایسے علم سے نواز رکھا ہو، جس سے وہ انسانوں کے دلی احوال کا ادراک کر لیتے ہوں۔

نیک عمل کرنے والے اور نیک عمل کا عزم و ارادہ رکھنے والے عمل کے اصل اجر میں تو برابر ہوں گے، مگر جیسا کہ زیرِ مطالعہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں یہ فرق پایا جاتا ہے: نیکی کا پختہ ارادہ رکھنے والے اجر کے مستحق تو ہوں گے، مگر ان کے اجر و ثواب میں بڑھوتری کی بات نہیں کہی گئی ہے، جب کہ نیکی کا عمل کرنے والوں کے اجر و ثواب میں اضافہ در اضافہ کی بات کہی گئی ہے یعنی ثواب میں اضافہ عمل کرنے والوں کے ساتھ مختص ہے۔

زیرِ بحث حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعمال میں خلوصِ نیت کا دخل ہوتا ہے اور انسان محض اپنی نیتِ صالحہ ہی کے اعتبار سے اجر و ثواب کا مستحق ہو جاتا ہے، خواہ وہ کسی وجہ سے اپنے ارادے کے مطابق عمل سے قاصر ہی کیوں نہ رہے۔ اس حدیث کے علاوہ کتاب و سنت کے بہت سے نصوص میں اس بات کی صراحت پائی جاتی ہے۔ چناں چہ بندۂ مومن اگر کبھی کسی برائی کے کرنے کا ارادہ کر لے، لیکن اللہ کے خوف سے اللہ واسطے اسے ترک کر دے اور عمل میں نہ لائے تو اس پر بھی اسے کامل نیکی ملے گی، اس حدیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ محض ارادۂ بد کو ترک کرنے پر نیکی لکھ دی جاتی ہے، لیکن سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے مروی اسی روایت کے ان الفاظ: ((وَإِنْ تَرَكَهَا مِنْ أَجْلِي))

”اور اگر اس برائی کو میری وجہ سے چھوڑ دے۔“ [صحیح بخاری:۷۵۰۱] سے یہ بات خاص ہو جاتی ہے کہ محض اللہ کے واسطے ترک کرنے کی وجہ سے نیکی لکھی جاتی ہے یعنی اللہ کے خوف سے برائی کا ترک کرنا بھی نیکی ہے، جو برائی کے ارادے کا کفارہ بن جاتی ہے۔

حدیث میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ بندہ اگر اپنے ارادے کے مطابق کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو یہ اللہ کا کامل عدل واحسان ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں فقط ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔ اللہ نے فرمایا: ﴿وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ ”اور جو برائی لے کر آئے گا سو اسے جزا نہیں دی جائے گی، مگر اسی کی مثل اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“ [الانعام:۱۶۰]

لیکن بسا اوقات وقت، جگہ اور مختلف حالات کی وجہ سے برائی کی شناعت وقباحت بڑھ جاتی ہے اور اس کے برے نتائج میں بھی نمایاں فرق آجاتا ہے، جیسے زنا حرام ہے، مگر یہی چیز اگر ہم سائے کی بیوی، بہن، بیٹی وغیرہ کے ساتھ ہو تو اس کی حرمت مزید بڑھ جاتی ہے اور اگر محرمات کے ساتھ ہو تو اس کی شناعت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے، اسی طرح بڑھاپے کی عمر میں بدکاری نیز حدودِ حرم اور حرام مہینوں میں گناہ کی قباحت مزید دوچند ہو جاتی ہے۔

اور بسا اوقات مختلف حسنات کی وجہ سے برائیوں کو بھی اللہ تعالیٰ مٹا دیتا ہے، جیسا کہ مختلف نصوص میں یہ بات کہی گئی ہے اور اسی زیرِ مطالعہ روایت کے دوسرے طریق میں امام مسلم رحمہ اللہ کے یہاں یہ اضافہ بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے: ((وَمَحَاهَا اللَّهُ، وَلَا يَهْلِكُ عَلَى اللَّهِ إِلَّا هَالِكٌ)) ”یا اللہ اس کو بھی مٹا دے گا اور اللہ کے یہاں کوئی ہلاک نہ ہو گا، مگر جو ہلاک ہونے والا ہے۔“ [صحیح مسلم: ۱۳۱، ترقیم دار السلام: ۳۳۹] یعنی ہلاکت وتباہی اسی کا مقدر ہو گی جو اس قدر الٰہی فضل ورحمت کے باوجود خود کو ہلاکت سے نہ بچا سکے۔

یہ سب اس امت کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عظیم رحمت کی وسعت کی دلیل ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے اور اس نے بندوں کو نیکی کمانے کے بہت سے مواقع عطا کر رکھے ہیں۔

بندہ اگر بھول وغفلت کی وجہ سے بُرے ارادے کو ترک کر دے تو وہ مذکورہ فضیلت کا مستحق نہیں

ہو گا اور گناہ گار بھی نہیں ہو گا تاہم محض مخلوق کے ڈر یا ریا ونمود کی خاطر اپنے بُرے ارادوں سے باز رہے اور نیت میں کسی طرح کا فتور ہو تو وہ سخت گناہ کا مرتکب ہو گا، اسی طرح اگر وہ برائی کا پختہ عزم و ارادہ کرلے اور دنیوی اسباب ووسائل کی وجہ سے پوری کوشش کے باوجود اپنے پختہ ارادہ وپلان کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تو وہ اپنی بُری نیت کے مطابق گناہ کا مستحق ہو گا۔ جیسا کہ سیدنا ابو کبشہ انماری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اس امت کی مثال چار لوگوں جیسی ہے: ایک وہ شخص جسے اللہ نے مال اور علم عطا کیا، تو وہ اپنے علم کے مطابق اپنے مال میں تصرف کرتا ہے اور حق کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ ایک وہ شخص جسے اللہ نے علم دیا، لیکن مال نہیں دیا، وہ کہتا ہے: اگر میرے پاس اس شخص کی طرح مال ہوتا تو میں بھی ایسے ہی کرتا جیسے یہ کرتا ہے۔“ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((**فَهُمَا فِي الْأَجْرِ سَوَاءٌ**)) ”تو یہ دونوں اجر میں برابر ہیں۔“ اور ترمذی کی روایت میں ہے: ((**فَهُوَ بِنِيَّتِهِ فَأَجْرُهُمَا سَوَاءٌ**)) ”تو وہ اپنی نیت کے مطابق (اجر) پائے گا اور دونوں کا اجر برابر ہو گا“ ”اور ایک وہ شخص ہے، جسے اللہ نے مال دیا، لیکن علم نہیں دیا وہ اپنے مال میں غلط رَوِش اختیار کرتا ہے، ناحق جگہ میں خرچ کرتا ہے اور ایک وہ شخص ہے، جسے اللہ نے نہ علم دیا اور نہ مال دیا، وہ کہتا ہے: کاش میرے پاس اس آدمی جیسا مال ہوتا تو میں بھی اسی شخص کی طرح کرتا۔“ راویِ حدیث کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((**فَهُمَا فِي الْوِزْرِ سَوَاءٌ**)) ”تو یہ دونوں گناہ میں برابر ہیں۔“ اور ترمذی کی روایت میں ہے: ((**فَهُوَ بِنِيَّتِهِ فَوِزْرُهُمَا سَوَاءٌ**)) ”تو وہ اپنی نیت کے مطابق (گناہ) پائے گا اور دونوں کا گناہ برابر ہو گا“ [صحیح/سنن ابن ماجہ:۴۲۲۸، سنن ترمذی:۲۳۲۵، وقال: حسن صحیح، مسند احمد:۱۸۰۲۴، ۱۸۰۳۱، اور اس کے محققین نے اسے حسن قرار دیا ہے۔]

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آمنے سامنے تلواریں سونت کر قتل کا حرص وارادہ رکھنے والے مقتول کو بھی قاتل کے ساتھ جہنم میں جانے کی وعید سنائی ہے۔ [صحیح بخاری:۳۱، ۶۸۷۵، صحیح مسلم:۲۸۸۸] اسی طرح اعمالِ قلبی سے متعلق غلط ارادہ رکھنا بھی قابلِ مواخذہ ہے، اس لیے فاسد عقائد و نظریات کو دلوں میں جگہ نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿...**وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ**...﴾ ”لیکن وہ (اللہ) تمھاری گرفت کرے گا اس چیز پر جو کچھ تمھارے دلوں نے کیا ہے۔“ [البقرۃ:۲۲۵]

مطلب یہ کہ جو کچھ تم نے سچے دل کے ساتھ کیا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر تمھارا مواخذہ کرے گا، یعنی اگر کوئی جان بوجھ کر اپنے اختیار سے فاسد عقائد اپنے دل میں باندھ رکھے یا معاصی و ذنوب کا پختہ ارادہ کر لے تو ان ارادوں پر اس کا محاسبہ ہو گا۔

اور جو خیالات اور وسوسے انسان کی طاقت و اختیار سے باہر ہیں اور خود بخود آتے جاتے رہتے ہیں، اگر آدمی ان کو اپنے دل میں جگہ نہ دے تو ان پر محاسبہ نہیں ہو گا، جیسا کہ اس سے متعلق اوپر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی پیش کی گئی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ کے تعلق سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیتِ کریمہ: ﴿لِلَّهِ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلْأَرْضِ ۗ وَإِن تُبْدُوا۟ مَا فِيٓ أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ ٱللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَآءُ ۗ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ﴾ ”اللہ ہی کے لیے ہے، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اسے ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ اللہ اس پر تمھارا محاسبہ کرے گا، پھر جسے چاہے بخش دے گا اور جسے چاہے عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔“ [البقرۃ: ۲۸۴] نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر بہت گراں گزری، اس لیے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عرض کیا:

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں ایسے اعمال کا مکلف بنایا گیا تھا، جو ہماری طاقت میں ہیں: نماز، روزہ، جہاد اور صدقہ وغیرہ اور آپ پر یہ آیت اتاری گئی ہے، جس کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اسی طرح کی بات کہنا چاہتے ہو، جس طرح تم سے پہلے دونوں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) نے کہی تھی کہ: ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی؟ بلکہ تم لوگ کہو: ((سَمِعْنَا، وَأَطَعْنَا، غُفْرَانَكَ رَبَّنَا، وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ)) ”ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، اے ہمارے رب! تیری بخشش کے طلب گار ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔“ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ”ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، اے ہمارے رب! تیری بخشش کے طلب گار ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔“ جب لوگوں نے اس بات کا اقرار کر لیا اور ان کی زبانیں اس کے تابع ہو گئیں تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی:

﴿ءَامَنَ ٱلرَّسُولُ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِۦ وَٱلْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ

وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِۦ ۚ وَقَالُوا۟ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ ٱلْمَصِيرُ﴾ ”رسول اس پر ایمان لایا، جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل کی گئی اور مؤمنین بھی ایمان لائے، یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں:) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کو دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ ان لوگوں نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، اے ہمارے رب! تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔“ [البقرة : ٢٨٥]

جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُس حکم کو منسوخ کر دیا اور یہ آیت نازل فرمائی: ﴿لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا ٱكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ﴾ قَالَ: نَعَمْ. ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ﴾ قَالَ: نَعَمْ. ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِۦ ۖ﴾ قَالَ: نَعَمْ. ﴿وَٱعْفُ عَنَّا وَٱغْفِرْ لَنَا وَٱرْحَمْنَآ ۚ أَنتَ مَوْلَىٰنَا فَٱنصُرْنَا عَلَى ٱلْقَوْمِ ٱلْكَـٰفِرِينَ﴾ [البقرة : ٢٨٦] قَالَ: نَعَمْ. ”اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا، جو نیکی وہ کرے گا وہ اسی کے لیے ہے اور جو برائی وہ کرے گا اس کا وبال اسی پر ہے۔ اے ہمارے رب! ہم سے جو بھول یا خطا ہو گئی ہو اس پر ہمارا مواخذہ نہ کرنا۔“ (اللہ نے فرمایا: ہاں) ”اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بھاری بوجھ نہ ڈالنا جیسا بوجھ تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔“ (اللہ نے فرمایا: ہاں) ”اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال، جس کی ہمارے اندر طاقت اور سکت نہیں۔“ (اللہ نے فرمایا: ہاں) ”ہم سے در گزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا مالک ہے، سو کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔“ (اللہ نے فرمایا: ہاں) [صحیح مسلم: ١٢٥]

اس روایت میں آیتِ کریمہ کے منسوخ ہونے کی جو بات کہی گئی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ پہلی آیت میں جو ابہام تھا دوسری آیت میں اس کی وضاحت فرما دی گئی، جیسا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تعلق سے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ وہ لوگ نسخ کا لفظ وضاحت کے معنیٰ میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

قُربِ الٰہی حاصل کرنے کے وسائل و اسباب اور ذرائع

(۳۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَالَ: مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُهُ عَلَيْهِ، وَلَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وَلَئِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی تو اس سے میرا اعلانِ جنگ ہے، جن اعمال کے ذریعہ بندہ میری قربت حاصل کرتا ہے ان میں میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہیں جن کو میں نے فرض کیا ہے، نوافل کے ذریعہ بندہ مسلسل میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں ضرور اسے عطا کروں گا اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے ضرور پناہ دوں گا۔“ (صحیح بخاری: ۶۵۰۲)

شرح و فوائد :

اس حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی تو وہ جان لے کہ اس کے خلاف میرا اعلانِ جنگ ہے۔ یعنی جس نے اللہ کے کسی ولی کو تکلیف پہنچا کر اس سے دشمنی مول لی تو اس نے ربِّ کائنات سے دشمنی مول لے لی اور اللہ سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ کے دشمنوں سے دشمنی رکھنا واجب ہے اور ان سے دوستی کرنا حرام ہے اسی طرح اس کے ولیوں سے دوستی رکھنا واجب ہے اور ان سے دشمنی رکھنا حرام ہے۔

آج کل مسلمانوں کے ایک طبقے کی طرف سے ہر ایرے غیرے شخص کو ولایت کے درجہ پر فائز کرکے اسے اللہ کا ولی باور کرایا جاتا ہے اور اسے ماورائی مخلوق سمجھا جاتا ہے، بلکہ بعض لوگوں کے یہاں تو

صریح طور پر کتاب و سنت کی مخالفت کرنے والے شعبدہ بازوں کو ہی اللہ تعالیٰ کا ولی قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں ولایت کے لیے ترکِ دنیا اور رہبانیت لازمی شرط قرار پا چکی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ایمان سے عاری کوئی بھی غیر متقی شخص اگر اپنے ولی ہونے کا دعویٰ کرے یا لوگ اسے ولی باور کرائیں تو ایسوں کے دعوے کو ان کے منہ پر مار دی جائے گی، کیوں کہ حقیقی ولی اللہ پر ایمان لانے والا اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۞ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ﴾ ”سن لو! بے شک اللہ کے ولی (دوست)، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے رہے۔“ [یونس:۶۲-۶۳]

ہمارے یہاں ولی کے بارے میں جو تصور پایا جاتا ہے، اس کے متعلق تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے مذکورہ آیتِ کریمہ کی تفسیر کے تحت مفسرِ قرآن حافظ عبد السلام بھٹوی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

”کچھ لوگوں نے اولیاء اللہ کچھ انوکھی قسم کے مافوق الفطرت آدمیوں کو سمجھ رکھا ہے، جن سے عجیب و غریب کرامتیں اور شعبدے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق پھر یہ بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا ہے کہ دیکھا جائے ان کا عقیدہ کیا ہے؟ وہ مؤحد ہیں یا مشرک، وہ نماز بھی پڑھتے ہیں یا نہیں، پاک دامنی اور حلال و حرام کا خیال رکھنے والے بھی ہیں یا نہیں۔ حالاں کہ اس قسم کی چیزیں اور شعبدے تو شیطانوں اور ان کے چیلوں مثلاً ہندو جوگیوں سے بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ مسمریزم اور ہپناٹزم کے ماہرین بھی لوگوں کو بے وقوف بناتے رہتے ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی ہوں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء، یعنی دوستوں کی پہچان خود بتائی کہ ”الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا“ یعنی وہ لوگ جنھوں نے قرآن و سنت کے مطابق اپنے اعتقاد کو درست کر لیا۔ ”وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ“ اور ہمیشہ گناہوں سے بچتے رہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری کرتے رہے۔ لفظ ”كَانَ“ تقویٰ کے استمرار اور ہمیشگی پر دلالت کر رہا ہے۔

معلوم ہوا کہ ہر انسان جو عقیدہ و عمل درست کر لے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کر لے وہ اللہ کا ولی ہے۔ لیکن لوگ جنگلوں اور پہاڑوں کے عافیت خانوں میں یا خانقاہوں کے حجروں میں ولیوں

کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں، مگر اللہ کے راستے میں جان ومال قربان کرنے والوں سے بڑھ کر اللہ کا ولی (دوست) کون ہو سکتا ہے؟ ولی وہ نہیں جسے سُرخاب کا پر لگا ہوا ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ خود اپنے فرمان کے مطابق تمام اہل ایمان کا ولی ہے، فرمایا: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [البقرة:۲۵۷] ''اللہ ان لوگوں کا ولی (دوست) ہے جو ایمان لائے۔'' (اور دیکھیے سورۂ مائدہ:۵۵) اور یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ جن کا ولی ہے وہ اللہ کے ولی ہیں، کیوں کہ دوستی دونوں طرف سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے ولیوں ہی کا ولی ہے، دشمنوں کا ولی ہرگز نہیں۔ پھر دوستی اور دشمنی کے درمیان کوئی مرتبہ نہیں، کوئی بھی شخص اللہ کا دوست ہو گا یا دشمن، اب آپ خود سوچ لیں کہ آپ اللہ کے دوست ہیں یا دشمن۔ اللہ کے یہ دوست ہر طبقے میں موجود ہیں، علماء، تاجر، صنعت کار، مزدور، کاشت کار، غرض ضروری نہیں کہ پیر یا مولوی ہی ولی ہو، بلکہ ہر طبقے میں ایمان اور تقویٰ والے لوگ اللہ کے ولی ہیں۔ البتہ ایسا شخص جو غیب کی باتیں بتاتا ہو، یا کائنات میں قدرت واختیار رکھنے کی ڈینگ مارتا ہو، یا لوگ اس کے سامنے اس کی یہ شان بیان کرتے ہوں اور وہ چپ رہ کر ان کی تائید کرتا ہو، وہ رحمان کا ولی ہرگز نہیں، وہ تو شیطان کا ولی ہے۔

ہاں اس میں شک نہیں کہ اولیاء کے درجے یقیناً مختلف ہیں، اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ جیسی خلت، ولایت اور دوستی دوسرے رسولوں کو بھی حاصل نہیں ہو سکی، عام آدمی کو کیسے مل سکتی ہے، پھر انبیاء میں بھی درجے ہیں، فرمایا: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ...﴾ [البقرة:۲۵۳] ''یہ رسول، ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔'' اسی طرح اہلِ ایمان کے ایمان وتقویٰ کے فرق کے مطابق ان کی ولایت میں بھی فرق ہو گا، ہاں کوئی بھی مخلص مومن اللہ کی ولایت سے یکسر محروم نہیں اور یہ دوستی اپنے درجے کے مطابق قیامت کے دن کسی نہ کسی وقت ضرور کام آئے گی۔ پھر کافر بھی خواہش کریں گے کہ کاش! ہم کسی درجے کے بھی مسلمان ہوتے، فرمایا: ﴿رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ﴾ [الحجر:۲] ''بہت بار چاہیں گے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا کاش! وہ مسلمان ہوتے۔'' یعنی جن کے دل میں ذرہ برابر یا اس سے بھی کم ایمان ہو گا وہ جہنم سے نکل کر جنت میں جائیں گے

تو کفار چاہیں گے کاش! دنیا میں ہم بھی مسلم بن جاتے، خواہ کسی درجے کے، تاکہ ہمیشہ کے لیے تو جہنم میں نہ رہتے۔" [تفسیر القرآن العظیم : ۲/۴۴-۴۵]

ولی کے لغوی معنیٰ قریبی اور دوست و مددگار کے ہیں اس اعتبار سے اللہ کا ولی وہ سچا و مخلص اور متبعِ شریعت مومن شخص ہوگا، جس نے معاصی سے اجتناب کرتے ہوئے نیکی کی راہوں پر چل کر اللہ کا قرب حاصل کر لیا ہو۔ جیسا کہ زیرِ بحث حدیثِ قدسی میں اللہ نے اُن باتوں کو بیان فرمایا ہے، جن کے ذریعہ اس کے اولیاء اس کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے دو باتیں ذکر کی ہیں :

پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ فرائض کو ادا کر کے اس کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ فرائض کی ادائیگی میں واجبات کو بجالانے کے ساتھ ساتھ حرام امور کو چھوڑ دینا بھی شامل ہے، اس لیے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے ان فرائض میں سے ہیں جنھیں اس نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ فرائض کے علاوہ نوافل کے ذریعہ بھی اس کا قرب حاصل کرتے ہیں اور بندہ جب مسلسل ان کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرتا رہتا ہے تو اللہ بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہے، اسے اپنا قریبی اور محبوب بندہ بنالیتا ہے اور اس سے اس قدر خوش ہوتا ہے کہ اس کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے یعنی جب انسان اللہ کا مقرّب و محبوب بندہ بن جاتا ہے تو نتیجتاً وہ مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے۔ اللہ نے ایسے شخص کے حق میں یہ مژدہ سنایا ہے کہ جو کچھ وہ اللہ سے مانگتا ہے اللہ اسے عطا فرماتا ہے، اس کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے اور اگر وہ کسی چیز سے اللہ کی پناہ طلب کرتا ہے تو اللہ اسے پناہ دیتا ہے۔

اس ربانی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرائض و واجبات مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکاۃ وغیرہ نوافل و مستحب اعمال سے افضل ہیں اور اللہ رب العالمین کو سب اعمال سے زیادہ محبوب ہیں نیز تعارض کے وقت فرائض کو نوافل پر تقدم حاصل ہوگی۔ جو کوئی اللہ کی محبت پانے کا خواہاں ہو اسے چاہیے کہ وہ واجبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ بہ کثرت نوافل کا بھی اہتمام کرے تاکہ وہ اللہ کی محبت اور ولایت کو حاصل کر سکے اور اگر ہم اللہ سے کچھ مانگنا چاہتے ہیں تب بھی ہمیں چاہیے کہ ہم فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ نوافل کا بھی خوب اہتمام کریں، مثلاً فرض نمازیں پڑھنے کے ساتھ سُنن و نوافل بھی

پڑھیں، وجوبی زکاۃ ادا کرنے کے علاوہ نفلی صدقات و خیرات بھی کرتے رہیں اور ماہ رمضان کے روزوں کے علاوہ دیگر نفلی روزے کا بھی اہتمام کریں وغیرہ۔ مثلاً: شوال کے چھ دنوں کا روزہ، یومِ عاشوراء یعنی دسویں محرم کا روزہ، میدانِ عرفات میں موجود حاجیوں کے علاوہ لوگوں کے لیے یومِ عرفہ یعنی ۹/ ذی الحجہ کا روزہ، ایامِ بیض یعنی ہر مہینے (عربی کی ۱۳/ ۱۴/ اور ۱۵ تاریخ) میں تین دن کا روزہ، سوموار اور جمعرات کا روزہ، ایک دن ناغہ کرکے روزہ، ماہِ محرم اور ماہِ شعبان کا روزہ وغیرہ۔

بندۂ مومن جب اللہ کے احکام کی تابع داری کرتا ہے اور اس کی مرضی کے مطابق چلتا ہے تو وہ اللہ کا محبوب بندہ بن جاتا ہے اور اس کا ظاہر و باطن سب کچھ اللہ کے تابع ہو جاتا ہے اور اس سے خلافِ شرع کوئی کام سرزد نہیں ہوتا، اس کے کان، اس کی نگاہیں اور اس کے ہاتھ پیر وغیرہ اللہ کے تابع فرمان ہو جاتے ہیں اور ان سے وہی کچھ سرزد ہوتا ہے جن میں خیر اور اللہ کی خوشنودی ہوتی ہے۔ چناں چہ اللہ کے فرمان: **"میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے۔"** سے یہاں یہی مراد ہے کہ اللہ بندے کے ان چاروں اعضاء کو راہ راست پر لگا دیتا ہے، جن سے بندہ وہی کام کرتا ہے جو اللہ کو پسند ہیں۔ شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ اپنے ولی بندے کو اس کے سمع، بصر اور ہر عمل میں اس قدر سیدھا پن، اصلاح و استقامت عطا فرما دیتا ہے کہ اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں کے ہر عمل میں اس کا ادراک از روئے اخلاص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جاتا ہے اور از روئے استقامت اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے اور از روئے شریعت و اتباع اللہ تعالیٰ کی راہ میں بن جاتا ہے۔ چناں چہ اسے کمال درجے کا اخلاص، استقامت اور متابعت بصورتِ تمام میسر آ جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلیٰ درجے کی توفیق شمار ہوتی ہے۔ سلفِ صالحین سے یہی تفسیر منقول ہے، جو ظاہرِ حدیث کے عین مطابق، حقیقتِ حدیث کے عین موافق اور سیاقِ حدیث کے لیے بالکل متعین ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کی تاویل کا سہارا لیا گیا ہے اور نہ ہی معنیٔ ظاہر سے انحراف اختیار کیا گیا ہے۔" [دیکھیے: توحید اسماء وصفات ص: ۱۵۷-۱۵۸]

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں بننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ بندے کی حاجات و ضروریات کو پوری فرماتا ہے۔

بعض لوگ کسی شرعی دلیل و حجت کے بغیر حلول اور خالق و مخلوق کے اتحاد کا فاسد عقیدہ رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اللہ بندے میں حلول کیے ہوئے ہے اور بندے کے ساتھ اس کا اتحاد ہو گیا ہے۔ حقیقت میں یہ کفریہ عقیدہ ہے اور اس طرح کی مزعومہ باتوں سے اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند و برتر ہے۔ کتاب و سنت کے قطعی دلائل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ سات آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے۔ وحدۃ الوجود کا نظریہ رکھنے والے حلولیوں نے زیرِ مطالعہ حدیث سے بھی اپنا باطل نظریہ و عقیدہ ثابت کرنے کی ناروا کوشش کی ہے، جب کہ اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے کوئی حجت نہیں ہے، بلکہ خود اسی حدیث سے ان کے باطل نظریے کا بطلان ہوتا ہے، کیوں کہ اسی حدیث میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ: ”اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں ضرور اسے عطا کروں گا۔“ جس سے صاف طور پر یہ ثابت ہوتا کہ اللہ بندوں سے الگ ہے اور بندے علاحدہ ہیں، یعنی دونوں ایک نہیں ہیں اور پوری حدیث سے واضح طور پر دو ذاتوں کا اثبات ہو رہا ہے، ایک معبود ہے تو دوسرا بندہ ہے، ایک مسئول (جس سے سوال کیا جائے) ہے تو دوسرا سائل ہے، ایک عطا کرنے والا ہے تو دوسرا وہ ہے جسے عطا کیا جا رہا ہے، ایک وہ ذات ہے جس سے پناہ مانگی جاتی ہے اور وہ پناہ دینے والا ہے اور دوسرا وہ ہے جو پناہ طلب کرنے والا ہے اور اسے پناہ دی جاتی ہے۔ غور کریں کہ اگر بندہ فنا فی اللہ ہو کر خود اللہ ہو جاتا ہے تو پھر اسے اللہ سے دعا و سوال کرنے اور اس سے مدد و پناہ مانگنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ گویا اللہ بندوں کے اندر حلول نہیں کرتا ہے، اس کی ذات ان چیزوں سے پاک ہے اور وہ عرش پر مستوی ہے۔

یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے لیے صفتِ کلام اور صفتِ محبت پر دلالت کرتی ہے اور اس کا کلام اور محبت کرنا ہمارے کلام اور محبت کرنے کی طرح نہیں ہے، بلکہ دیگر صفات کی طرح اللہ کی یہ دونوں صفتیں بھی اسی کے شایان شان ہیں، کسی مخلوق کے مشابہ نہیں ہیں۔

خطا ونسیان اور مجبوری میں کیے گئے گناہ کا معاف ہونا

(**٣٩**) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**إِنَّ اللَّهَ تَجَاوَزَ لِي عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ**)) حَدِيثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالْبَيْهَقِيُّ وَغَيْرُهُمَا

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک اللہ نے میرے لیے میری امت سے غلطی، بھول چوک اور جن پر انھیں مجبور کر دیا گیا ہو، معاف کر دیا ہے۔“ (یہ حدیث حسن ہے۔ سنن ابن ماجہ:٢٠٤٥، السنن الکبریٰ للبیہقی:٧/٣٥٦-٣٥٧)

شرح و فوائد :

میری امت سے مراد امتِ اجابت ہے یعنی اس سے اللہ اور اس کے آخری رسول جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے افراد مراد ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس امت پر احسانِ عظیم ہے کہ آپ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ پر بہت بڑا فضل و کرم کیا ہے، چناں چہ عذر و اضطرار کی صورت میں انجام دیے جانے والے اعمال سے حساب و کتاب اور عقاب و سزا کو اٹھالیا ہے اور وقتِ ضرورت عذر و مشقت کی صورت میں بہت سے احکام میں تخفیف اور آسانی فرما دی ہے، خواہ واجب عمل کو مکمل ساقط فرما کر یا واجبی عمل کے کچھ حصہ کو معاف فرما کر، جیسا کہ بوڑھوں اور کمزوروں کے لیے جہاد کی معافی، بیماروں اور مسافروں کے لیے بعض احکام میں تخفیف وغیرہ اور اللہ رب العالمین کا فضل و احسان اور لطف و کرم ہے کہ اس نے خطا ونسیان اور جبر میں کیے گئے اعمال سے گناہ کو اٹھالیا ہے، ورنہ وہ چاہے تو کسی بھی حال میں اپنے حکم کی مخالفت کرنے والوں کو سزا دے سکتا ہے، لیکن اللہ بندوں کے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے انھیں تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا، جیسا کہ اللہ رب العالمین کا فرمان ہے:

﴿**يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ...**﴾ ”اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔“ [البقرۃ:١٨٥]

دوسری جگہ فرمایا: ﴿**وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ...**﴾ ”اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔“ [الحج: ٧٨]

زیرِ مطالعہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس بات سے باخبر کیا ہے کہ اللہ نے اپنی رحمت

سے میری خاطر میری امت سے بھول چوک، غلطی اور مجبوری میں کیے گئے اعمال کو معاف کر دیا ہے یعنی ان کی وجہ سے کیے گئے اعمال کے سبب وہ سزا کے مستحق نہیں ہوں گے۔

❁ خطا سے مراد قصد وارادہ کے بغیر نادانستہ طور پر غلطی سے انجام پانے والا عمل ہے یعنی انسان کسی جائز کام کا ارادہ کرے اور غلطی سے ناجائز کام سرزد ہو جائے۔ اللہ نے اس طرح سے سرزد ہونے والے عمل کے گناہ کو معاف کر دیا ہے، کیوں کہ وہ بے حد بخشنے والا اور انتہائی مہربان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُم بِهِ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ "اور تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جس میں تم نے خطا کی اور لیکن جو تمھارے دلوں نے ارادے سے کیا اور اللہ ہمیشہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔" [الأحزاب:۵]

کسی سے غیر ارادی طور پر غلطی سے کسی کی جان یا مال کا نقصان ہو جائے تو وہ گناہ گار نہیں ہو گا، تاہم نقصان کی تلافی کرنا ضروری ہو گا، کیوں کہ مالی ادائیگی کا تعلق نقصان سے ہے، اس کے قصد وارادہ سے نہیں ہے اور قتلِ خطا پر دیت اور کفارہ ادا کرنا نیز غلطی سے ضائع کیے گئے مال کو ادا کرنا شرعی طور پر ثابت شدہ امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿...وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا...﴾ "اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مومن گردن آزاد کرنا اور دیت دینا ہے جو اس کے گھر والوں کے حوالے کی گئی ہو، مگر یہ کہ وہ صدقہ (کرتے ہوئے معاف) کر دیں۔" [النساء:۹۲]

کفارہ تو کسی حال میں ساقط نہیں ہو گا، تاہم وارث اگر دیت کو معاف کر دیں تو وہ ساقط ہو سکتی ہے، ہاں اگر بطور کفارہ ایک غلام آزاد کرنے کی طاقت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا ہے، جیسا کہ اسی آیتِ کریمہ میں آگے اللہ کا فرمان ہے:

﴿....فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ ...﴾ "پھر جو نہ پائے تو پے در پے دو ماہ کے روزے رکھنا ہے۔ یہ بطور توبہ اللہ کی طرف سے ہے۔" [النساء:۹۲]

❁ نیز نسیان کا مطلب ہے حکم دیے گئے کام کا دل و دماغ سے اتر جانا، خواہ بھول جانے کی وجہ سے کوئی وجوبی کام ساقط ہو جائے یا بھول جانے کی وجہ سے کوئی ممنوع و حرام کام کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی

رحمت سے اس امت سے بھول کر سرزد ہونے والے عمل کو بھی معاف فرمادیا ہے، یعنی آخرت میں اس کا مواخذہ نہیں فرمائے گا۔ چناں چہ بھول چوک کی بنیاد پر کوئی ممنوع کام کر لینے یا کسی وجوبی کام کو ترک کرنے کی صورت میں کوئی گناہ اور مواخذہ نہیں ہو گا، کیوں کہ بھولنے والے سے گناہ معاف کر دیا گیا ہے، گناہ تو جان بوجھ کر قصد وارادہ کے ساتھ کیے گئے کاموں پر دیا جاتا ہے اور بھول کر یا غلطی سے گناہ کے کام میں ملوث ہونے والا شخص قصد وارادے سے گناہ کا کام نہیں کرتا ہے، لیکن واجبی احکام اس سے نہیں اٹھائے جاتے ہیں بلکہ احکام کو پورا کرنا اس کے لیے ضروری ہو گا، مگر یہ کہ اس کے کرنے یا نہ کرنے سے متعلق کوئی دوسری دلیل پائی جائے۔ مثلاً روزے کی حالت میں غلطی سے بھول کر کھا پی لینا معاف ہے، اس کی وجہ سے آدمی گناہ گار نہیں ہو گا اور اس سلسلے میں مستقل دلیل پائے جانے کی وجہ سے اس کا روزہ بھی مکمل ہو گا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

((إِذَا نَسِيَ فَأَكَلَ وَشَرِبَ فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ؛ فَإِنَّمَا أَطْعَمَهُ اللَّهُ وَسَقَاهُ)) ”جب کوئی بھول جائے اور کچھ کھا پی لے تو اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرے، کیوں کہ اللہ نے اسے کھلایا اور پلایا ہے۔“ [صحیح بخاری:۱۹۳۳، صحیح مسلم:۱۱۵۵]

نیز بھول یا نیند کی وجہ سے نماز چھوٹ جائے تو اس پر گناہ تو نہیں ہو گا، مگر یاد آتے ہی یا نیند سے بیدار ہوتے ہی اس نماز کو ادا کرنا ضروری ہو گا، کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ نَسِيَ صَلاَةً فَلْيُصَلِّ إِذَا ذَكَرَهَا، لاَ كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذَلِكَ ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾)) [طه:۱۴] ”جو شخص نماز پڑھنا بھول جائے تو جب بھی اسے یاد آئے اس کو پڑھ لے، اس کے سوا اس کا اور کوئی کفارہ نہیں ہے۔ (اللہ نے فرمایا) نماز میرے یاد آنے پر قائم کر۔“ [صحیح بخاری:۵۹۷، صحیح مسلم:۶۸۴]

((مَنْ نَسِيَ صَلَاةً، أَوْ نَامَ عَنْهَا، فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا)) ”جو شخص نماز پڑھنا بھول جائے یا سو جائے تو اس کا کفارہ یہی ہے کہ جب بھی اسے یاد آئے وہ اس کو پڑھ لے۔“ [صحیح مسلم:۶۸۴]

اسی طرح غلطی سے یا بھول کر وضو کے بغیر یا ناپاکی کی حالت میں نماز پڑھ لینے کی صورت میں آدمی گناہ گار تو نہیں ہو گا، کیوں کہ اس نے اپنے آپ کو پاک اور باوضو سمجھ کر نماز ادا کیا ہے، لیکن یاد آنے کے بعد اسے دہرانا ضروری ہو گا، کیوں کہ بہت سی صحیح احادیث میں نماز کے لیے طہارت کو ضروری شرط قرار دیا

گیا ہے کہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح غلطی سے بھول کر ایسی حالت میں نماز پڑھ لے کہ اس کے کپڑوں پر گندگی لگی ہوئی تھی تو بھول کی وجہ سے وہ گناہ گار نہیں ہوگا اور اس کی نماز بھی درست ہوگی اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہوگی، کیوں کہ اس بارے میں واضح نص موجود ہے کہ نبی ﷺ ایک مرتبہ نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے جوتے میں گندگی لگی ہوئی تھی تو جبریل علیہ السلام نے دورانِ نماز حاضر ہو کر آپ کو حقیقت حال سے باخبر کیا، جس کی وجہ سے آپ نے جوتے کو نکال دیا، نماز مکمل کی اور اپنی نماز کو دوہرایا نہیں، بلکہ اسی پر بنا کیا۔ [صحیح / سنن أبو داود: ۶۵۰، مسند احمد: ۱۱۱۵۳، سنن دارمی : ۱۴۱۸]

خطا و نسیان اور بھول چوک کی معافی کے لیے دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشنے والے رب العالمین نے خود یہ دعا سکھلائی ہے، جس کی قبولیت میں کیوں کر شک ہو سکتا ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ...﴾ "اے ہمارے رب! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں۔" [البقرۃ:۲۸۶]

اس دعا سے متعلق نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کے بارے میں فرمایا کہ میں نے اسے قبول کر لیا۔ [صحیح مسلم:۱۲۵]

❁ زیرِ مطالعہ حدیث میں معاف ہونے کی تیسری صورت یہ بتائی گئی ہے کہ مجبوری کی صورت میں کیے گئے عمل پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ یعنی کسی صاحبِ ایمان سے اس کی رضا کے بغیر زبردستی کوئی ایسی بات کہلوائی جائے یا کوئی ایسا کام کروایا جائے جو شریعت کے مخالف ہو اور آدمی اسے ناپسند کرے تو اس کی ناپسندیدگی معتبر مانی جائے گی اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اور نہ کوئی دنیوی یا اُخروی سزا اس پر نافذ ہوگی، حتیٰ کہ مجبوری کی حالت میں اگر انسان کلمۂ کفر زبان سے ادا کر دے جب کہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَٰكِن مَّن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ "جو شخص اللہ کے ساتھ کفر کرے اپنے ایمان کے بعد، سوائے اس کے جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو اور لیکن جو کفر کے لیے سینہ کھول دے تو ان لوگوں پر اللہ کا بڑا غضب ہے

اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔" [النحل:١٠٦]

اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس پر کوئی ظالم جبر کرے اور وہ اپنی جان بچانے کی خاطر کلمۂ کفر زبان سے کہہ دے یا فعلاً کفر کا ارتکاب کر لے، جب کہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو تو وہ کافر نہیں ہو گا، اس کے لیے یہ رخصت ہے، لیکن اگر کوئی شخص مرنا قبول کر لے اور کفریہ عمل انجام دینا تو دور کی بات منہ سے بھی کلمۂ کفر یا ایمان و اسلام کے خلاف کوئی بات اپنی زبان سے نہ نکالے تو یہ عزیمت ہے اور ایسا شخص بہت بڑا شہید ہو گا۔

اسی طرح اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قتل کیے جانے کے ڈر سے یا مار پیٹ کے خوف سے کسی معصوم بے گناہ مسلمان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے یعنی اگر کوئی کسی بے گناہ شخص کو قتل کرنے پر مجبور کرے تو اس بے گناہ شخص کا قتل کرنا درست نہیں ہو گا، کیوں کہ اپنی جان بچانے کی خاطر کسی بے گناہ مسلمان کو قتل کرنا مجبوری نہیں ہے اور جس طرح آدمی کو اپنی جان پیاری ہے، ایسے ہی دوسرے مسلمان بھائی کی جان و مال کی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے، جیسا کہ اس موضوع سے متعلق نبوی فرمان گذشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اپنی جان بچا کر دوسرے کی جان مار دے تو مارنے والا اور زبردستی کر کے مروانے والا دونوں مجرم ہوں گے اور دونوں پر قصاص نافذ ہو گا۔ اسی طرح عزیزوں کی محبت کے دباؤ میں یا انھیں خوش کرنے کی خاطر کیا جانے والا عمل مجبوری میں کیا جانے والا عمل نہیں شمار ہو گا اور اس طرح کے دباؤ یا محبت میں کیا جانے والا عمل اگر خلافِ شریعت ہے تو یقیناً وہ گناہ کا باعث ہو گا۔

خطا و نسیان اور جبر کی معافی سے متعلق ایک بات بخوبی جان لیں کہ جان بوجھ کر کوئی گناہ کرنے کے بعد بہانہ بازی کرنا، تنبیہ کے باوجود خواہ مخواہ اس کے لیے عذر تلاش کرنا اور اپنے برے کرتوت پر بھول چوک اور خطا کا لیبل لگانا یا راضی خوشی گناہ کر لینے کے بعد اسے جبر و زبردستی والے خانے میں ڈالنا بہت بڑا جرم ہے اور کیے ہوئے گناہ سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اللہ دلوں سے بخوبی واقف ہے، اس لیے اللہ کو دھوکا دے کر اپنے آپ کو خسارے میں نہ ڈالیں۔ آج کل یہ وبا بہت زیادہ عام ہے کہ لوگ گناہ کا کام کرنے کے بعد بہانے بازی کرتے ہیں، جب کہ اس طرح کے رویے سے بچنا بے حد ضروری ہے۔ گناہ کرنے کے بعد آدمی جب گناہ کا عذر ڈھونڈنے لگتا ہے اور اسے نیکی کے خانے میں ڈالنا چاہتا ہے تو یہ

معاملہ عملِ گناہ سے بھی زیادہ سنگین ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر کوئی گناہ ہو جائے تو اس کا اعتراف کریں اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں بلکہ اپنے کیے پر اللہ سے معافی مانگیں، اللہ اس عمل سے بہت خوش ہوتا ہے اور بندے کو معاف فرما دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ يَٰعِبَادِيَ ٱلَّذِينَ أَسْرَفُواْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُواْ مِن رَّحْمَةِ ٱللَّهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَغْفِرُ ٱلذُّنُوبَ جَمِيعًاۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ﴾ ''کہہ دے اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔ بے شک وہی تو بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔'' [الزمر:۵۳] واضح رہے کہ یہ وعدۂ الٰہی اُنھیں لوگوں کے لیے ہے جو توبہ کریں، جیسا کہ اس کے بعد والی آیاتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے۔

❁ زیرِ مطالعہ حدیث سے یہ شرعی قاعدہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ دینِ اسلام میں تمام اعمال کی بنیاد نرمی اور آسانی پر ہے اور دین کے سارے احکام انسانی طاقت و گنجائش کے مطابق ہیں اور اللہ نے انسانوں کو ان کی طاقت سے بڑھ کر کسی کام کا مکلف نہیں بنایا ہے، جیسا کہ رب تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَاۚ...﴾ ''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا، مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔'' [البقرۃ:۲۸۶]

اسی طرح سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ)) ''بے شک یہ دین آسان ہے۔'' [صحیح بخاری:۳۹] نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابو موسیٰ اشعری اور سیدنا معاذ رضی اللہ عنہما کو جب یمن کی طرف بھیجا تو ان سے فرمایا: ((يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا، وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا، وَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا)) ''تم دونوں آسانی کرنا سختی نہ کرنا، خوش خبری دینا نفرت نہ پھیلانا اور اتفاق سے رہنا اختلاف مت کرنا۔'' [صحیح بخاری:۳۰۳۸، صحیح مسلم:۱۷۳۳]

فانی دنیا میں ایک مسافر کی طرح رہو

(٤٠) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: أَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْكِبِيَّ، وَقَالَ: ((**كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ**)) وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا يَقُولُ: إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ، وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ، وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھے کو پکڑ کر فرمایا: ”تم دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم پردیسی اجنبی یا مسافر ہو۔“ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح کرو تو شام کے منتظر نہ رہو اور اپنی صحت سے اپنی بیماری کے لیے اور اپنی زندگی سے اپنی موت کے لیے (کچھ نہ کچھ) حاصل کرلو۔ (صحیح بخاری: ٦٤١٦)

شرح و فوائد:

اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے وطن میں رہنے والے شخص کو ”غریب“ یعنی پردیسی کہتے ہیں اور راستہ چلنے والے راہ گیر کو ”عابر سبیل“ یعنی مسافر کہتے ہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ پردیس میں رہنے والے پردیسی کو وہ سکون و راحت اور یکسوئی نہیں میسر ہوتی ہے، جو اپنے وطن میں رہتے ہوئے اسے حاصل ہوتی ہے اور راہ گیر کے پاس تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہوتا ہے، وہ مسلسل اپنی منزل کی تلاش میں رہتا ہے اور کہیں پڑاؤ بھی کرتا ہے تو اس کے سامنے اپنی منزل ہی رہتی ہے۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی بلیغ انداز میں یہ وصیت فرمائی ہے کہ یہ دنیا مسافر خانے کی طرح ایک عارضی ٹھکانا ہے، ایک دن یہاں سے سب کو کوچ کر جانا ہے اور کسی کو یہاں مستقل نہیں رہنا ہے، اس لیے یہاں ایک اجنبی پردیسی یا راہ گیر مسافر کی طرح رہو، جس طرح مسافر اپنی اگلی منزل کے لیے ہر وقت تیار اور رواں دواں رہتا ہے اور اگر کہیں کسی جگہ پڑاؤ ڈالتا ہے تب بھی اجنبی کی طرح رہتا ہے، وقتی ضروریات کے سوا کسی اور چیز میں مشغول نہیں ہوتا ہے اور ہر وقت اس کے ذہن و دماغ میں اپنی اصل منزل گھومتی رہتی ہے، ایسے ہی ایک مؤمن شخص کو دنیا سے تعلق رکھنا چاہیے، بہت زیادہ اس سے لو نہیں لگانی چاہیے، اہلِ دنیا سے بہت زیادہ سروکار نہیں رکھنا چاہیے اور اس کی آسائشوں کا

عادی نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ہر وقت اپنی آخرت کی دائمی زندگی اور مستقل رہنے والی جگہ کو بنانے سنوارنے کی فکر کرنی چاہیے، کیوں کہ دنیا کی یہ چند روزہ زندگی اور یہاں کی نیرنگیاں محض کھیل تماشا ہیں، حقیقی اور دائمی زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میں فرمایا:

﴿وَمَا هَٰذِهِ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَآ إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ ٱلدَّارَ ٱلْءَاخِرَةَ لَهِىَ ٱلْحَيَوَانُ ۚ لَوْ كَانُوا۟ يَعْلَمُونَ﴾ ”اور دنیا کی یہ زندگی نہیں ہے، مگر ایک دل لگی اور کھیل اور بے شک آخری گھر، یقیناً وہی اصل زندگی ہے، اگر وہ جانتے ہوتے۔“ [العنکبوت:۶۴]

دوسری جگہ فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔“ [الحشر:۱۸]

نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں دنیا میں رہنے اور اہلِ دنیا سے ربط و تعلق رکھنے کا بیش بہا اصول بیان فرمایا ہے کہ دنیا میں اجنبی پردیسی کی طرح رہو یا پھر راہ گیر مسافر کی طرح رہو یعنی اسے اپنا مستقل ٹھکانا اور قیام گاہ نہ بناؤ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدیث میں وارد لفظ ”اَوْ“ تخییر کے بجائے ”بَلْ“ کے معنی میں مستعمل ہے اور یہی بہتر توجیہ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں ایک راہ چلنے والے مسافر کی طرح رہو، پردیسی کو تو بہرحال ٹھکانا میسر ہوتا ہے، لیکن راہ گیر عارضی ٹھکانے سے بھی محروم ہوتا ہے، اس لیے دنیا اور اہلِ دنیا سے اسی قدر دل لگاؤ جتنے سے یہاں گزر بسر ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا میں مشغول ہو کر اپنی آخرت سے غافل ہو جاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر دنیا اور اہلِ دنیا کی بے ثباتی کو اپنے نہاں خانۂ دل میں بسالے اور اس پر غور و فکر سے کام لے تو اسے دین پر استقامت حاصل ہو گی اور دوام و تسلسل کے ساتھ اعمالِ صالحہ کرنے کی توفیق ملے گی۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو جاؤ اور اپنے اوپر حلال چیزوں کو بھی حرام قرار دے لو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بقدرِ کفایت دنیا سے تعلق رکھو اور حصولِ دنیا ہی کو اپنا مقصودِ حقیقی اور مطمحِ نظر نہ بنالو۔ امام نووی رحمہ اللہ

نے علماء کے حوالے سے اس حدیث کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ:

”دنیا کی طرف جھکاؤ نہ رکھو اور اسے اپنا وطن نہ بناؤ، اپنے جی میں زیادہ دیر تک دنیا میں رہنے اور اس پر خوب توجہ دینے کے بارے میں نہ سوچو، اس سے تم صرف اسی قدر تعلق رکھو جتنا کہ ایک اجنبی شخص اجنبی دیس سے رکھتا ہے اور دنیا سے بہت زیادہ وابستگی نہ رکھو، جس طرح کہ اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹ کر واپس جانے کا ارادہ رکھنے والا ایک پردیسی شخص دیارِ غیر سے بہت زیادہ وابستگی نہیں رکھتا۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔“ [ریاض الصالحین ۱/۱۶۴ تحت رقم الحدیث: ۴۷۰]

ہمارے پیارے نبی ﷺ اگر چاہتے تو نہایت آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے، لیکن نہایت سادہ زندگی گزارتے تھے، کھانے پینے، رہنے سہنے، بود و باش اور نشست و برخاست ہر ایک سے سادگی ٹپکتی تھی، آپ کھجور کی پتیوں اور ٹہنیوں سے بنی چٹائی پر آرام فرماتے۔ ایک مرتبہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے آپ کے جسمِ مبارک پر چٹائی کے نشان کو دیکھ کر عرض کیا کہ اگر آپ ہمیں حکم دیتے تو ہم آپ کے لیے بستر کا انتظام کرتے جو آپ کو اس سختی سے بچاتی۔ تو اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَا أَنَا وَالدُّنْيَا، إِنَّمَا أَنَا وَالدُّنْيَا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ، ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا)) ”مجھے دنیا سے کیا تعلق! میری اور دنیا کی مثال اس سوار جیسی ہے جس نے کسی درخت کے نیچے سایہ حاصل کیا، پھر تھوڑا آرام کیا اور اسے چھوڑ کر چلتا بنا۔“ [صحیح / سنن ابن ماجہ: ۴۱۰۹، سنن ترمذی: ۲۳۷۷، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ: ۴۳۸]

زیرِ مطالعہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ان کے کندھے سے پکڑا، جس سے ان کے لیے نبی ﷺ کی محبت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ طرزِ عمل کسی کو اپنی جانب متوجہ کرنے اور تعلیم دینے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فردِ واحد کو مخاطب کرکے دراصل پوری امت کو تعلیم دی ہے۔ آپ ﷺ کے اس طرزِ عمل کا مقصد شاید یہی تھا کہ وہ پوری توجہ اور انہماک سے آپ کی بات سنیں اور آپ ﷺ کی یہ عام عادتِ مبارکہ تھی کہ کبھی کلماتِ تنبیہ مثلاً ”اَلَا“ وغیرہ کلمات کے ذریعہ اور کبھی اپنے فعل کے ذریعہ سامنے والے کو متوجہ رکھتے تھے اور بڑی عمدگی سے مختلف ضرب الأمثال اور مناسب تشبیہات و تمثیلات کے ذریعہ انھیں وعظ و نصیحت فرماتے تھے، تعلیم دینے کا یہ بڑا عمدہ طریقہ

ہے۔ معلمین اور واعظین کو چاہیے کہ اس نبوی طریقے کو اپنائیں اور ہر طرح سے سامعین و طلبہ کو اپنے سے مانوس رکھیں اور ان میں سننے، سمجھنے اور عمل کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبوی فرمان بیان کرنے کے بعد خود یہ وصیت کی ہے کہ ہمہ وقت اپنی موت کو دھیان میں رکھیں اور اس کے لیے تیار رہیں، بیماری اور موت سے پہلے صحت و زندگی اور فراغت کو غنیمت جانیں، یہ اللہ کی عظیم نعمتیں ہیں اس لیے لمبی لمبی امیدیں باندھنے کے بجائے اعمالِ صالحہ کی طرف سبقت کریں، توبہ و استغفار کرنے میں ٹال مٹول سے کام نہ لیں اور موت کو قریب سمجھ کر خوب خوب اعمالِ صالحہ کا ذخیرہ کرلیں اور کل کے انتظار میں نہ رہیں، جب صبح کریں تو شام کے انتظار میں نہ رہیں اور جب شام کریں تو صبح کے انتظار میں نہ رہیں بلکہ یہ سمجھیں کہ شام یا صبح آنے سے پہلے ہی موت آدبوچے گی، کیوں کہ موت زندگی کی گھات میں ہے اور معلوم نہیں کب زندگی کی شام ہو جائے۔ سنن ترمذی وغیرہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول مرفوعاً بیان ہوا ہے اور ایک دوسری مرفوع حدیث میں بھی اس مفہوم کو بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ : حَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ، وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ، وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ، وَشَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ، وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ)) ''پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو: زندگی کو موت سے پہلے، صحت کو بیماری سے پہلے، فراغت کو مشغولیت سے پہلے، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے اور مال داری کو محتاجی سے پہلے۔'' [حديث صحيح / أخرجه ابن أبي الدنيا في قصر الأمل: ١١١، والحاكم: ٧٨٤٦، والبيهقي في شعب الإيمان: ١٠٢٤٨، وابن أبي شيبة في المصنف: ٣٤٣١٩، أنظر: صحيح الجامع وزيادته : ١٠٧٧، و صحيح الترغيب والترهيب : ٣٣٥٣، وهداية الرواة للألباني : ٥١٠٢]

صحت و فراغت ایسی نعمتیں ہیں جن کو غنیمت سمجھتے ہوئے خوب نیکیاں کمانی چاہیے، حقیقی معنوں میں عقل مند اور پختہ ایمان والے اس کو غنیمت سمجھتے ہیں، جب کہ کاہل و بے وقوف لوگ اس بارے میں غفلت کا شکار رہتے ہوئے اپنا دنیوی و اُخروی خسارہ کر لیتے ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((نِعْمَتَانِ مَغْبُونٌ فِيْهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ؛ اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ))

''دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں اکثر لوگ اپنا نقصان کرتے ہیں: صحت اور فراغت'' [صحیح بخاری: ٦٤١٢]

بیماری اور مشغولیت سے پہلے صحت وفراغت کی حالت میں اگر کوئی شخص مختلف نوافل واعمالِ صالحہ انجام دینے کو اپنی عادت بنالے اور ہیشگی کے ساتھ کوئی نیک عمل انجام دے، مثلاً تہجد پڑھنا، ایام بیض اور ہفتے میں سوم کے دن روزہ رکھنا اور مختلف اوراد ووظائف کا اہتمام کرنا وغیرہ تو بندوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ عظیم انعام واحسان ہوگا کہ بیماری یا سفر وغیرہ کی حالت میں دائمی عادت والے عمل کو نہ کرنے کے باوجود بھی انھیں ان کے اجر سے نوازے گا۔ جیسا کہ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ أَوْ سَافَرَ، كُتِبَ لَهُ مِثْلُ مَا كَانَ يَعْمَلُ مُقِيْمًا صَحِيْحًا)) ”جب بندہ بیمار ہو جائے یا سفر کرے تو اس کے لیے ان تمام اعمال کا ثواب لکھا جاتا ہے، جنھیں مقیم ہونے کی صورت میں یا صحت کے وقت وہ کیا کرتا تھا۔“ [صحیح بخاری:۲۹۹۶]

صحت وتندرستی کی حالت میں اعمالِ صالحہ انجام دینے والوں اور ان کی پابندی کرنے والوں کے لیے یہ بہت بڑی بشارت اور شرف وفضیلت کی بات ہے اور پھر بذات خود بیماری بھی گناہوں کا کفارہ بنتی ہے اور مؤمن بندے رنج والم اور دکھ وتکلیف پہنچنے کی وجہ سے اجر وثواب سے نوازے جاتے ہیں، بشرطیہ کہ وہ صبر سے کام لیں۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ، وَلَا هَمٍّ وَلَا حُزْنٍ، وَلَا أَذًى وَلَا غَمٍّ، حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا إِلَّا كَفَّرَ اللَّهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ)) ”مسلمان کو جو بھی تھکاوٹ، بیماری، رنج وملال، تکلیف اور غم لاحق ہوتی ہے حتی کہ کانٹا جو اسے چبھ جاتا ہے تو اللہ اسے ان کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔“ [صحیح بخاری:۵۶۴۲، صحیح مسلم:۲۵۷۳]

مذکورہ بالا تفصیلات سے معلوم ہوا کہ موت سے پہلے ہی سفر آخرت کا سامان تیار کرلینا چاہیے تاکہ موت کے وقت ندامت کے آنسو نہ بہانا پڑے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موت کے بعد انسان کے اعمال کے اجر وثواب کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، مگر کچھ ایسے اعمال ہیں، جن کے اجر وثواب کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے، ان اعمالِ صالحہ کی تفصیل آگے ایک اضافی حدیث کے تحت مستقل طور پر آرہی ہے۔ إن شاء اللہ

ایمانِ کامل کی علامت: نبی سے محبت اور ان کی اطاعت

(٤١) عَنْ أَبِي مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ**)) حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ، رَوَيْنَاهُ فِي كِتَابِ الْحُجَّةِ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

ابو محمد عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا ہے، جب تک کہ اس کی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں۔“ (یہ حدیث حسن صحیح ہے، ہمیں کتاب الحجہ میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایت ملی ہے۔)

شرح و فوائد :

امام نووی رحمہ اللہ نے اگرچہ اس روایت کی تحسین و تصحیح کی ہے، مگر بہت سے محدثین نے اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے اور یہی درست بھی ہے، شیخ البانی رحمہ اللہ نے نعیم بن حماد راوی کو ضعیف بتا کر اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔[ہدایۃ الرواۃ :۱/۱۳۱] حالاں کہ حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ نے نعیم بن حماد کو ثقہ و صدوق ہونے کی وجہ سے حسن الحدیث قرار دیا ہے اور اس روایت کی وجۂ ضعف یہ بیان کی ہے کہ اس کی سند میں ہشام بن حسان نامی راوی ثقہ ہونے کے ساتھ مدلس ہیں اور اس روایت کو انھوں نے عن کے ساتھ بیان کی ہے نیز ایک دوسرے راوی عبد الوہاب بن ثقفی کو یہ شک ہے کہ انھوں نے یہ روایت اپنے شیخ ہشام بن حسان سے سنی ہے یا کسی دوسرے سے سنی ہے یعنی اپنے استاد کے تعین کے بارے میں انھیں شک ہے۔ اس بنا پر یہ روایت ضعیف ہے۔[أضواء المصابیح ص:۲۲۸]

یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے تاہم اپنی خواہشات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعتِ مطہرہ کے تابع کرنا، جن باتوں کا آپ نے حکم دیا ہے اور جن باتوں کو پسند فرمایا ہے ان پر عمل کرنا اور انھیں پسند کرنا نیز جن چیزوں سے روکا ہے یا ناپسند کیا ہے ان سے اجتناب کرنا اور انھیں ناپسند کرنا ایمان کا حصہ ہے، اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُواْ فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسْلِيمًا﴾ ”پس نہیں! تیرے رب کی قسم ہے! وہ مومن

نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ اپنے آپس کے اختلاف میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تو کرے اس کے بارے میں اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری طرح تسلیم کر لیں۔" [النساء:٦٥]

دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ "اور رسول تمھیں جو کچھ دے وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔" [الحشر:٧]

نبی کریم ﷺ کے احکام و فرامین اور فیصلے سے انکار تو دور کی بات ہے، دل میں اس سلسلے میں انقباض محسوس کرنا بھی ایمان کے منافی ہے۔ ایمان کا بنیادی تقاضا ہے کہ اُن سے بے انتہا اور بے لوث محبت کی جائے اور یہ محبت اللہ رب العالمین کی محبت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، کوئی بھی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ وہ تمام مخلوقات کی محبت کو رسول اللہ ﷺ کی محبت پر نچھاور نہ کر دے۔ سیدنا ابوہریرہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ، وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ)) "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ میں اسے اس کی اولاد، والدین اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔" [صحیح بخاری:١٥، ١٤، صحیح مسلم:٤٤]

سیدنا عبد اللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ نبی ﷺ کے ساتھ تھے اور عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ آپ ﷺ پکڑے ہوئے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! آپ مجھے میری جان کے سوا دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَا وَالَّذِي بِيَدِهِ حَتَّى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ)) "نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! (ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔) جب تک کہ میں تجھے تیری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔" عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "بس اب آپ اللہ کی قسم! مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اب اے عمر! (تیرا ایمان مکمل ہوا)۔" [صحیح بخاری:٦٦٣٢]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ : أَنْ يَكُوْنَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا

يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ، وَأَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهَ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ)) ”تین خصلتیں جس میں ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت پائے گا: اللہ اور اس کے رسول اس کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جائیں، وہ محض اللہ کے لیے کسی سے محبت کرے، وہ کفر میں واپس جانے کو ایسا ہی برا جانے جیسا کہ آگ میں ڈالے جانے کو برا جانتا ہے۔“ [صحیح بخاری:۱۶، صحیح مسلم:۴۳]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ سے قیامت کے بارے میں دریافت کیا کہ قیامت کب قائم ہو گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَاذَا أَعْدَدْتَ لَهَا؟)) ”تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟“ اس نے کہا: کچھ نہیں، مگر یہ کہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں۔ صحیحین ہی کی ایک روایت میں ہے کہ اس نے کہا: "مَا أَعْدَدْتُ لَهَا مِنْ كَثِيْرِ صَلَاةٍ وَلَا صَوْمٍ وَلَا صَدَقَةٍ، وَلٰكِنِّي أُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ" ”میں نے اس کے لیے بہت زیادہ (نفلی) نماز و روزہ اور صدقہ کے ذریعہ تیاری تو نہیں کی ہے، مگر میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ((أَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ)) ”تو اسی کے ساتھ ہو گا جس سے تجھے محبت ہے۔“ انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ہمیں نبی ﷺ کے اس فرمان: ”تو اسی کے ساتھ ہو گا جس سے تجھے محبت ہے۔“ سے جتنی خوشی ہوئی اتنی خوشی کسی اور چیز سے نہیں ہوئی۔ انھوں نے کہا: پس میں نبی ﷺ سے اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرتا ہوں اور میں ان کے ساتھ اپنی اس محبت کی وجہ سے امید رکھتا ہوں کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں گا، اگرچہ میں ان کے عمل جیسا عمل نہیں کر سکا۔ [صحیح بخاری:۳۶۸۸، ۶۱۷۱، صحیح مسلم:۲۶۳۹]

ویسے طبعی طور پر ہر آدمی اپنے متعلقہ امور مثلاً گھر خاندان، بیوی بچوں، دوست احباب اور تجارت وغیرہ سے محبت کرتا ہے اور یہ سب کچھ طبعی طور پر اسے محبوب ہوتی ہیں اور ان سے محبت کرنا اس کی ناگزیر ضرورت بھی ہوتی ہیں، اس لیے ان سے محبت کرنا مذموم نہیں ہے، کیوں کہ شرعی طور پر بندوں کے حقوق کی ادائیگی بھی انسان کی ذمہ داری ہے، لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت دنیا کی ہر چیز سے زیادہ ہونی چاہیے اور جہاں کہیں اللہ اور اس کے رسول کا فرمان آجائے تو اسی کو ترجیح دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ

وَأَمْوَالٌ ٱقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ ”کہہ دے اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مَندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور رہنے کے مکانات جنھیں تم پسند کرتے ہو، تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ [التوبۃ:۲۴]

نبی کریم ﷺ سے سچی محبت کرنے کا تقاضا یہی ہے کہ خلوصِ دل سے آپ ﷺ کی اتباع کی جائے اور اپنے ذہن و دماغ، مزاج و طبیعت اور خواہشات کو نبوی احکام و فرامین کے تابع فرمان بنایا جائے اور دوسروں سے بے نیازی اختیار کی جائے۔ جن کے خواہشات اور اقوال و افعال نبوی احکام اور پاکیزہ شریعت کے تابع ہوں گے وہی لوگ کامل اور سچے مومن ہوں گے کہ جن سے جنت میں داخل کرنے اور جہنم سے نجات دینے کا وعدہ کیا گیا ہے اور حقیقی معنوں میں اللہ سے محبت کرنے والے بھی یہی لوگ ہوں گے اور اللہ بھی ان سے محبت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ”کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھیں تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔“ [آل عمران:۳۱]

کتاب و سنت کی واضح تعلیمات کو چھوڑ کر اپنی من مانی کرنا، اپنے نفس کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پوری کرنا اور اسی خواہش کے پیچھے چلنا دراصل اپنی خواہش کو اپنا معبود بنانا ہے اور یہ کفار و مشرکین کا شیوہ ہے کہ وہ کسی حجت و دلیل کے بغیر اپنی خواہش کا حکم مانتے ہیں، اسی کے پیچھے چلتے ہیں اور اسی کو اپنا فیصل مانتے ہیں۔ قرآن کریم میں انھیں سب سے بڑا گمراہ کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ ”اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔ بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ [القصص:۵۰]

تاہم اگر کوئی صاحبِ ایمان شخص اپنے نفس کی خواہش پر کوئی گناہ کرلے اور اپنے آپ کو اللہ کا گناہ گار سمجھے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا اور وہ اپنے خواہشِ نفس کی عبادت کرنے والا ہے، ورنہ ہر گناہ شرک قرار پائے گا اور ہر گناہ گار مشرک ہوگا، جب کہ معاملہ ایسا نہیں ہے، خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے شرک کے علاوہ دیگر گناہوں کو بخشنے کی بات کہی ہے، فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا﴾ ''بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا اور جو اللہ کا شریک بنائے تو یقیناً اس نے بہت بڑا گناہ گھڑا۔'' [النساء:۴۸]

گویا احکامِ شریعت کی پیروی کرنے اور اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرنے میں لوگ ایک دوسرے سے متفاوت ہیں کوئی درجۂ کمال کو پہنچا ہوتا ہے اور کوئی اس سے کم درجے میں ہوتا ہے اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کسی کا ایمان کم اور کسی کا ایمان زیادہ ہوتا ہے اوپر جو احادیث بیان ہوئی ہیں ان سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے درجے ہیں، لہٰذا لوگ بھی ان درجوں میں مختلف ہیں، ایسا نہیں ہے کہ عام آدمی کا ایمان انبیاء ورسل کے ایمان کے برابر ہوگا۔

راویِ حدیث کا تعارف :

سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن عاص بن وائل سہمی قریشی رضی اللہ عنہ بڑے عابد وزاہد اور متبحر علم صحابیِ رسول ہیں۔ ان کا نسب نامہ کعب بن لوی پر پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۂ نسب میں جاملتا ہے۔ ان کی کنیت ابو محمد ہے نیز ابو عبد الرحمان اور ابو نصیر بھی کہا گیا ہے۔ ان کی والدہ کا نام ریطہ بنت منبہ ہے۔ یہ اپنے والد سے صرف بارہ یا گیارہ برس چھوٹے ہیں اور والد سے پہلے ہی انھیں اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ۶۳ یا ۷۰ ہجری میں فوت ہوئے۔ یہ حدیثیں لکھا کرتے تھے اسی لیے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ حدیثیں ان کے پاس تھیں، لیکن اس کے باوجود بھی ان کی مرویات ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کافی کم ہیں، تقریباً (۷۰۰) حدیثیں ان سے مروی ہیں۔ یہ عبادلہ اربعہ میں سے ایک ہیں، مطلق ابن عمرو سے یہی مراد ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کے والد کے اور دیگر لڑکے بھی ہیں، جس طرح کہ جب ابن عباس، ابن مسعود اور ابن زبیر مطلق طور پر کہا جاتا ہے تو اس اِطلاق سے ان سبھوں کے صاحب زادگان میں سے عبد اللہ ہی مراد ہوتے ہیں۔

✿ ✿ ❀ ✿ ✿

توبہ واستغفار کی فضیلت، مغفرتِ الٰہی کی وسعت اور شرک کی مذمت

(٤٢) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : قَالَ اللَّهُ تَعَالَى : ((**يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِي وَرَجَوْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ عَلَى مَا كَانَ مِنْكَ وَلَا أُبَالِي. يَا ابْنَ آدَمَ! لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِي غَفَرْتُ لَك وَلَا أُبَالِي. يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّك لَوْ أَتَيْتَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيتَنِي لَا تُشْرِكُ بِي شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً**)) رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ : حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ابن آدم! بے شک جب تک تو مجھے پکارے گا اور مجھ سے امید رکھے گا میں تجھے بخشتا رہوں گا خواہ تیرے گناہ کتنے بھی ہوں اور مجھے کوئی پروا نہیں ہو گا۔ اے ابنِ آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کو چھونے لگیں پھر تو مجھ سے مغفرت طلب کرے تب بھی میں تجھے بخش دوں گا اور مجھے کوئی پروا نہیں ہو گا۔ اے ابنِ آدم! اگر تو زمین بھر گناہ لے کر میرے پاس آئے اور مجھ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا ہو گا تو میں تیرے پاس زمین بھر کر مغفرت لے کر آؤں گا۔" (ترمذی: ۳۵۴۰، انھوں نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔)

شرح و فوائد :

یہ حدیثِ قدسی اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت اور جود و سخا کی وسعت اور توبہ و استغفار کی زبردست فضیلت پر دلالت کرتی ہے اور اس سے شرک کی خطرناکی معلوم ہوتی ہے کہ یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اگر انسان کی موت شرک پر ہوئی اور اس نے اسی حالت میں اللہ سے ملاقات کی تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت نہیں فرمائے گا، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿**إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ**﴾ "بے شک اللہ اپنے ساتھ شریک کیے جانے کو نہیں بخشے گا اور جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا بخش دے گا۔" [النساء:۴۸]

اللہ رب العالمین بے انتہا رحمت و بخشش والا ہے، انسان کتنا بھی گناہ کر لے، لیکن اگر وہ اپنے کیے پر پشیمان ہو کر اللہ سے لو لگائے اور اس سے توبہ و استغفار کرے تو اللہ اس کے گناہوں کو معاف فرما دے گا

بشرطیہ کہ اس کا دامن شرک کی آلودگی سے پاک ہو، گناہوں کی بخشش کے لیے اللہ تعالیٰ یہ نہیں دیکھے گا کہ وہ صغیرہ گناہ ہے یا کبیرہ گناہ اور کم ہے یا زیادہ ہے، اسے قطعاً کسی چیز کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔ علماء کا کہنا ہے کہ مؤمنین کے کبائر کی بخشش کے لیے توبہ کرنا ضروری ہے یا یہ کہ کبیرہ گناہوں کی بخشش کا معاملہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سپرد ہے، وہ جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا اور جس پر چاہے گا سزا دے گا۔ اسی طرح حقوق العباد کا معاملہ ہے کہ صاحبِ حق کے حق کو واپس کرنا ضروری ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے حق دار کو جزا سے نواز دے اور قصوروار کے قصور کو اپنے فضل و کرم سے معاف فرمادے۔ یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کسی گناہ گار مومن کو اس کے گناہ کی وجہ سے ایمان سے خارج کرکے اسے کافر کا نام نہیں دیا جائے گا، بلکہ اسے نافرمان مومن کہا جائے گا یا یہ کہا جائے گا کہ وہ اپنے ایمان کی وجہ سے مومن ہے اور کبائر کے ارتکاب کی وجہ سے فاسق ہے۔ کتاب و سنت کے دلائل اسی بات پر دلالت کرتے ہیں اور اسلافِ امت کا اس بات پر اجماع ہے، لہٰذا گناہوں کی کثرت یا کسی بھی حالت میں اللہ کی رحمت اور اس کی مغفرت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت بہت وسیع ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ ”کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔ بے شک وہی تو بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“ [الزمر:۵۳]

زیرِ مطالعہ حدیث کا مقصود لوگوں کو گناہوں پر آمادہ کرنا نہیں ہے کہ اس سے استدلال کرکے آدمی پوری زندگی گناہوں میں پھنسا رہے اور اسی کو اپنا شیوہ بنالے، بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان کو اپنے گناہوں سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ گناہوں پر مصر رہنا اور مغفرت سے مایوس ہو کر اسی گناہ میں لگے رہنا انسان کو توبہ و استغفار سے محروم کر دیتا ہے اور شیطان کی یہی چال ہے کہ وہ لوگوں کو گناہ کے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور توبہ سے غافل کرکے انسان کو مغفرت سے ناامید کر دیتا ہے۔ اس حدیث میں اسی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان کے گناہ خواہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائیں پھر بھی

اسے رحمتِ الٰہی سے مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ سے لو لگانی چاہیے، اپنے کیے پر نادم ہونا چاہیے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے ہوئے خلوصِ دل سے توبہ کرنی چاہیے، کیوں کہ بشری تقاضے کی وجہ سے انسان گناہوں سے معصوم نہیں رہ سکتا ہے۔ چناں چہ اس حدیثِ قدسی میں رب العالمین کی مغفرت کے حصول کے تین اسباب کا بیان ہوا ہے، جن کے ذریعہ مغفرتِ الٰہی کو حاصل کیا جا سکتا ہے: امید کے ساتھ دعا، استغفار اور شرک سے اجتناب۔

❶ امید کے ساتھ دعا کرتے رہنا

پورے اعتماد اور مغفرت کی قوی امید کے ساتھ اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہیے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری اور اس پر صحیح معنوں میں مکمل ایمان رکھتے ہوئے پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اس سے دعا کی جائے تو وہ ضرور قبول فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ ”اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو لازم ہے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔“ [البقرۃ: ۱۸۶]

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُو بِدَعْوَةٍ، لَيْسَ فِيهَا إِثْمٌ، وَلَا قَطِيعَةُ رَحِمٍ إِلَّا أَعْطَاهُ اللَّهُ بِهَا إِحْدَى ثَلَاثٍ : إِمَّا أَنْ تُعَجَّلَ لَهُ دَعْوَتُهُ، وَإِمَّا أَنْ يَدَّخِرَهَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ، وَإِمَّا أَنْ يَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا)) ”کوئی مسلمان ایسا نہیں جو کوئی دعا کرے جس میں نہ کوئی گناہ ہو اور نہ قطع رحمی، مگر اس کے بدلے اللہ تعالیٰ اسے تین چیزوں میں سے ایک عطا فرما دیتا ہے: یا تو اس کی دعا جلد قبول کر لیتا ہے، یا آخرت میں اس کا ذخیرہ کر لیتا ہے، یا اس سے اسی کے برابر برائی ٹال دیتا ہے۔“ لوگوں نے کہا: ”پھر تو ہم بہت دعا کریں گے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اللَّهُ أَكْثَرُ)) ”اللہ کے پاس اس سے کہیں زیادہ ہے۔“ [مسند احمد: ۱۱۱۳۳، اور اس کے محققین نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا يَزَالُ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ

مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ، مَا لَمْ يَسْتَعْجِلْ)) ”تم میں سے ہر ایک کی دعا ہمیشہ قبول کی جائے گی جب تک کہ وہ کوئی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے اور جلدی بھی نہ کرے۔“ پوچھا گیا: ”اے اللہ کے رسول! جلدی کرنا کیا ہے؟“ آپ نے فرمایا: ((يَقُولُ : قَدْ دَعَوْتُ، وَقَدْ دَعَوْتُ، فَلَمْ أَرَ يَسْتَجِيْبُ لِي. فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذَلِكَ، وَيَدَعُ الدُّعَاءَ)) ”یہ کہ کوئی کہے: میں نے دعا کی اور میں نے (دوبارہ) دعا کی تو میں نے نہیں دیکھا کہ وہ میری دعا قبول کرتا ہو، سو اس وقت وہ تھک ہار کر رہ جائے اور دعا کرنا چھوڑ دے۔“ [صحیح مسلم: ۲۷۳۵]

❷ کثرت سے استغفار کرنا

استغفار کا مطلب ہے اللہ سے معافی مانگنا، اپنے گناہوں پر پشیمان ہو کر اللہ سے بخشش و مغفرت طلب کرنا اور اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے صرف اسی کی عبادت کرنا اور اسی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا۔ کتاب و سنت میں بہ کثرت استغفار کا بیان ہوا ہے، کہیں استغفار کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے اور ان کی مغفرت کا ذکر ہوا ہے تو کہیں استغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور بیش تر مقامات پر استغفار کا ذکر توبہ کے ساتھ کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ استغفار کے ساتھ گناہوں سے دوری اختیار کی جائے، کیوں کہ یہ استغفار گناہوں کی دوا ہے۔ نبی کریم ﷺ بذات خود بہ کثرت توبہ و استغفار کرتے تھے اور اپنی امت کو بھی استغفار کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ سب سے افضل اور مغفرت کا مُوجِب استغفار یہ ہے کہ گناہوں پر اصرار اور دوام نہ پایا جائے، کیوں کہ گناہوں پر اصرار مغفرتِ الٰہی کے لیے مانع ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ ”اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں، یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پس اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا اور کون گناہ بخشتا ہے؟ اور انھوں نے جو کیا اس پر اصرار نہیں کرتے، جب کہ وہ جانتے ہوں۔“ [آل عمران: ۱۳۵]

اصرار کے معنی ہیں کسی کام پر اڑ جانا، کوئی پروا اور ندامت و افسوس کا اظہار نیز توبہ کیے بغیر گناہوں پر

گناہ کرتے جانا، لیکن اگر کوئی شخص خلوصِ دل سے استغفار اور توبہ کرلے اور پھر اس سے بشری تقاضے کے تحت کوئی گناہ سرزد بھی ہو جائے تو اسے اصرار نہیں کہیں گے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک آدمی نے گناہ کیا تو دعا کی: "اے میرے رب! میں نے ایک گناہ کیا ہے، تو مجھے بخش دے۔" تو اس کے رب نے فرمایا: "کیا میرے بندے نے جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر پکڑتا ہے، سو میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔" پھر اس نے ایک اور گناہ کیا اور کہا: "اے میرے رب! میں نے ایک اور گناہ کیا ہے، تو اسے بخش دے۔" تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "میرے بندے نے جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر پکڑتا بھی ہے، میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔" پھر بندہ رکا رہا جتنا اللہ نے چاہا، پھر اس نے ایک اور گناہ کیا تو دعا کی: "اے میرے رب! میں نے ایک اور گناہ کیا ہے، تو اسے بخش دے۔" تو اللہ نے فرمایا: "میرے بندے نے جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر پکڑتا ہے، میں نے اپنے بندے کو بخش دیا، سو وہ جو چاہے کرے۔" [صحیح بخاری:۷۵۰۷، صحیح مسلم:۲۷۵۸]

معلوم یہ ہوا کہ استغفار کا فائدہ اس وقت بھی ہے جب توبہ و استغفار اور خلوصِ دل سے گناہ نہ کرنے کا عزم کرنے کے بعد پھر اگر بشری کمزوری کی وجہ سے گناہ سرزد ہو جائے اور یہ سلسلہ ساری زندگی ہر گناہ سرزد ہونے کے بعد جاری رہے یعنی گناہ کے بعد استغفار و توبہ کرنے میں تاخیر نہ کی جائے تب بھی توبہ و استغفار کا فائدہ حاصل ہوگا خواہ زندگی میں کتنی ہی مرتبہ ایسا واقعہ پیش آئے۔ بندہ جب بھی اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبِهِ، ثُمَّ تَابَ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِ)) "بے شک بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہے اور پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔" [صحیح بخاری:۴۷۵۰، صحیح مسلم:۲۷۷۰]

طلبِ استغفار کی سب سے بہترین صورت یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی حمد و ثناء بیان کرے، پھر اپنے گناہ کا اعتراف کرے اور پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے، جیسا کہ سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ اسی مفہوم پر دلالت کرتے ہیں، جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سید الاِستغفار قرار دیا ہے، اس استغفار کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں :

((اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّي، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَأَبُوءُ بِذَنْبِي، فَاغْفِرْ لِي؛ فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ)) ''اے اللہ! تو میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، تو نے مجھے پیدا کیا ہے، میں تیرا بندہ ہوں اور جہاں تک ہو سکتا ہے میں تیرے اقرار اور وعدے پر ہوں، میں اپنے کیے ہوئے کاموں کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں، مجھ پر جو تیری نعمتیں ہیں میں ان کا اقرار کرتا ہوں، میں اپنے گناہ کا تجھ سے اقرار کرتا ہوں، تو مجھے بخش دے، اس لیے کہ تیرے علاوہ کوئی گناہوں کو بخش نہیں سکتا ہے۔''

نبی کریم ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا: ''جو شخص یقین کے ساتھ اس دعا کو دن میں پڑھ لے اور اسی دن شام ہونے سے پہلے اس کی موت آجائے تو وہ جنتی ہوگا اور جو شخص یقین کے ساتھ اسے رات میں پڑھ لے اور صبح ہونے سے پہلے اس کی موت آجائے تو وہ جنتی ہوگا۔'' [صحیح بخاری:٦٣٠٦]

❸ توحید کا اہتمام اور شرک سے دوری

مغفرتِ الٰہی کے حصول کا سب سے بڑا اور اہم سبب توحید ہے، اگر توحید مفقود ہوئی اور آدمی شرک کا مرتکب ہو گیا تو پھر وہ مغفرتِ الٰہی سے محروم ہوگا اور اگر شرک سے اپنے دامن کو بچا کر توحید پر قائم رہا تو یہ اس کی بخشش کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگا۔ شرک اتنا بڑا اور خطرناک گناہ ہے، جس کی بخشش توبہ کے بغیر نہیں ہو سکتی ہے، اس لیے بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام معاملات اور امور میں خوب احتیاط سے کام لے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے شرک لازم آتا ہو، کیوں کہ اگر انسان کی موت توحید پر ہوگی تو اللہ سے امید ہے کہ وہ اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔ جب کہ شرک کے ہوتے ہوئے نہ تو دعا و استغفار نفع بخش ہو سکتی ہے اور نہ کوئی اور چیز فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ ہمارے مسلم معاشرے میں بھی شرک کا وجود پایا جاتا ہے جب کہ یہ سب سے بڑا گناہ ہے، اس لیے یہاں اس کی مختصر تشریح و وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے :

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، الوہیت اور اسماء و صفات میں کسی مخلوق کو شریک ماننے، مخلوق کو خالق کے مساوی و برابر یا مشابہ قرار دینے اور عبادت خواہ وہ قول ہو یا عمل، اسے کسی غیر اللہ کے لیے انجام دینے

اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی جاتی ہے اسی طرح کسی غیر اللہ کی تعظیم کرنے، جس طرح اللہ کو پکارا جاتا ہے اسی طرح کسی مخلوق کو پکارنے، جس طرح اللہ تعالیٰ سے ڈرا جاتا ہے اسی طرح کسی غیر اللہ سے ڈرنے اور جس طرح اللہ تعالیٰ سے امید لگائی جاتی ہے اسی طرح کسی غیر اللہ سے امید لگانے کو شرک کہتے ہیں۔ **شرک کی دو قسمیں ہیں: ایک شرک اکبر اور دوسرا شرک اصغر۔**

❁ دو الٰہ (معبود) کا تصور رکھنا یا عبادت کی کسی قسم کو غیر اللہ کے لیے انجام دینا شرکِ اکبر ہے۔ جیسے کسی غیر اللہ کا سجدہ کرنا، مشکل کے وقت اسے پکارنا اور اس کے لیے ہر قسم کی قدرت یا بعض قسم کی قدرت اور حقِ تصرف ثابت کرنا وغیرہ، خواہ غیر اللہ کو اللہ سے کم تر ہی سمجھ کر کیا جائے۔ چناں چہ ہر عقیدہ جو قول ہو یا عمل، اسے اللہ کے لیے انجام دینا توحید، ایمان اور اخلاص ہے اور اسے کسی مخلوق کے لیے انجام دینا کفر وشرک ہے۔ یہ شرک کبھی معاف نہیں ہوگا اور اس کا ارتکاب کرنے والا ہمیشہ جہنم میں رہے گا، جیسا کہ کتاب وسنت کے بیش تر نصوص میں جابجا اس کی وضاحت وصراحت کی گئی ہے۔

❁ اور ہر وہ ممنوع قول وعمل جو شرکِ اکبر میں واقع ہونے کا ذریعہ اور وسیلہ بنے اور شریعت میں اسے شرک کا نام دیا گیا ہو، شرکِ اصغر ہے۔ مثلاً وہ ارادے، اقوال اور افعال جو عبادت کے درجے تک نہ پہنچیں جیسے عبادت میں دکھاوے کو دخل دینا، غیر اللہ کی قسم کھانا اس کی تعظیم کے بغیر، ''جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں'' یا ''اگر اللہ اور فلاں نہ ہوتا'' جیسے کلمات کہنا نیز دھاگا، کڑا، چھلّا اور تعویذ وغیرہ اس عقیدہ اور نیت کے ساتھ باندھنا کہ ان سے پریشانیاں دور ہوتی ہیں اور مصیبتیں ٹلتی ہیں وغیرہ۔ جس عمل میں بھی یہ آمیزش اور اس طرح کا اعتقاد پایا جائے گا اس کا اجر وثواب ضائع ہو جائے گا اور اس کا مرتکب گناہ گار ہوگا، یہ شرک ملت سے خارج تو نہیں کرتا البتہ اس سے توحید میں کمی اور نقص ضرور آتی ہے اور اگر انسان اسے معمولی سمجھ کر انجام دیتا رہے تو آیندہ یہ شرکِ اکبر میں پڑنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

❁ جس طرح کائنات میں کئی معبود ورب کو تسلیم کرنا اور اس کائنات کا کئی خالق ماننا شرک ہے اور اس طرح کا عقیدہ وتصور رکھنے والا شخص مشرک ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات اور خصائص میں کسی غیر اللہ کو اللہ تعالیٰ کا شریک وسہیم اور ہم سر سمجھنا اور اسے اللہ کا ہم پلہ، مد مقابل اور ساجھی دار قرار دینا بھی شرک ہے اور ایسا کرنے والا شخص مشرک ہے۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ کے علاوہ غیر اللہ کو بھی مافوق

الأسباب طریقے سے نفع وضرر کا مالک اور کائنات میں تصرف کرنے والا سمجھنا شرک ہے۔ یعنی الٰہی اوصاف وخصائص کو کسی مخلوق میں ماننا اور عبادات میں سے کسی عبادت یا سارے عبادات کو کسی مخلوق کے لیے انجام دینا شرک ہے اور ایسا کرنے والا مشرک ہوگا۔ آج ہمارے معاشرے میں شرک کی یہ صورت بہت زیادہ عام ہوتی جارہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مذکورہ بالا دونوں طرح کے شرک کی نفی کی ہے اور اپنی ذاتِ اقدس کو ان ساری چیزوں اور ہر طرح کی شرک کی آلودگیوں سے پاک ومنزہ فرمایا ہے۔ چناں چہ پوری کائنات میں نہ تو دو الٰہ (معبود) ہیں اور نہ اُس الٰہِ واحد (معبودِ برحق) کا کوئی ہم سر اور مدِ مقابل ہے۔ وہ اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک اور معاون نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

● ﴿وَقَالَ ٱللَّهُ لَا تَتَّخِذُوٓاْ إِلَٰهَيۡنِ ٱثۡنَيۡنِۖ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٞ وَٰحِدٞ فَإِيَّٰيَ فَٱرۡهَبُونِ﴾ ”اور اللہ نے فرمایا کہ تم لوگ دو معبود نہ بناؤ، بلاشبہ وہ تو صرف ایک ہی معبود ہے، لہٰذا تم سب صرف مجھ سے ہی ڈرو۔“ [النحل:۵۱]

● ﴿وَإِلَٰهُكُمۡ إِلَٰهٞ وَٰحِدٞۖ لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلرَّحۡمَٰنُ ٱلرَّحِيمُ﴾ ”اور تم سب کا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبودِ (برحق) نہیں، وہ بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔“ [البقرۃ:۱۶۳]

● ﴿لَوۡ كَانَ فِيهِمَآ ءَالِهَةٌ إِلَّا ٱللَّهُ لَفَسَدَتَاۚ فَسُبۡحَٰنَ ٱللَّهِ رَبِّ ٱلۡعَرۡشِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾ ”اگر زمین وآسمان میں کئی معبود ہوتے تو وہ دونوں (یعنی زمین وآسمان) ضرور درہم برہم ہو جاتے سو اللہ عرش کا رب پاک ہے ان چیزوں سے جو وہ لوگ بیان کرتے ہیں۔“ [الأنبیاء:۲۲]

● ﴿مَا ٱتَّخَذَ ٱللَّهُ مِن وَلَدٖ وَمَا كَانَ مَعَهُۥ مِنۡ إِلَٰهٍۚ إِذٗا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهِۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعۡضُهُمۡ عَلَىٰ بَعۡضٖۚ سُبۡحَٰنَ ٱللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾ ”اللہ نے کسی کو بھی بیٹا نہیں بنایا اور نہ اس کے ساتھ کبھی کوئی معبود تھا، اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوق کو لے کر چل دیتا اور ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا، اللہ پاک ہے اس سے جو یہ لوگ اس کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔“ [المؤمنون:۹۱]

اوپر جو آیاتِ کریمہ درج کی گئی ہیں، ان میں سے پہلی اور دوسری آیتِ کریمہ کے اندر حتمی طور پر

ایک معبود ہونے کی بات کہی گئی ہے، بلکہ پہلی آیتِ کریمہ میں اِس حقیقت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دو معبود بنانے سے روکیا گیا ہے اور صرف اُسی ایک معبود سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ حقیقت قرآنِ کریم کی بے شمار آیات کے اندر متعدد پیرائے اور اسلوب میں بیان کی گئی ہے اور اس کے بعد کی دونوں آیتوں میں کئی الٰہ (معبود) کے نظریے کی تردید فرمائی گئی ہے، کہ اگر ایک معبود کے بجائے کئی ایک معبود ہوتے تو کائنات کا نظام، جو بڑی خوش اسلوبی اور نہایت ہم آہنگی کے ساتھ چل رہا ہے، درہم برہم ہو جاتا اور وہ معبود آپس ہی میں ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے، جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور نظامِ کائنات میں کسی طرح کا کوئی بھی خلل نہیں پایا جارہا ہے، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صرف اور صرف ایک ہی معبود ہے اور وہی عبادت اور پرستش کا مستحق ہے اور وہ ذاتِ واحد اس طرح کی خلافِ عقل وفطرت اور بے ہودہ باتوں سے پاک اور منزہ ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے جس طرح کئی معبودان کے وجود کی نفی کی ہے، اسی طرح کسی مخلوق کو اپنا ہم سر، ہم پلہ اور ساجھی دار بنانے کی بھی نفی کی ہے اور حکم دیا ہے کہ اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے اور مراسمِ عبودیت کو خالص اسی کے لیے ادا کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿قُلْ إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ إِلَيَّ أَنَّمَآ إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ ۖ فَمَن كَانَ يَرْجُوا۟ لِقَآءَ رَبِّهِۦ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَٰلِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِۦٓ أَحَدًۢا﴾

''کہہ دے میں تو تمھاری طرح ایک بشر ہی ہوں، میری جانب وحی کی جاتی ہے کہ تم سب کا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، پس جو شخص اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ وہ صالح عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔'' [الکہف:۱۱۰]

مطلب یہ کہ عبادت کو اللہ کے لیے خالص بناؤ، اس میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرو، اس طرح کہ عبادت کے جو مراسم اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں، اسے کسی دوسرے کے لیے نہ بجالاؤ اور عبادت میں کسی مخلوق کو شریک نہ کرو، یعنی مراسمِ عبودیت کو غیر اللہ کی طرف پھیر کر اللہ کے ساتھ کسی مخلوق کو معبود نہ بناؤ۔ بے شک وہی معبودِ برحق، مشکل کُشا اور حاجت روا ہے، اس لیے اس کے ساتھ کسی اور کو مشکل کشا اور حاجت روا بنا کر اپنے آپ کو بے یار و مددگار اور ملامت زدہ نہ بناؤ اور اگر اللہ کے سوا کسی اور

ہستی کو حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے پکارو گے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہیں سکتے اور تمھارا یہ پکارنا دائمی عذاب کا موجب بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

- ﴿لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَخْذُولًا﴾ ”تو اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا، ورنہ تو مذمت کیا ہوا، بے یار و مددگار ہو کر بیٹھ رہے گا۔“ [الإسراء:۲۲]
- ﴿فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ فَتَكُونَ مِنَ الْمُعَذَّبِينَ﴾ ”اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو، ورنہ تم بھی عذاب دیے جانے والے لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے۔“ [الشعراء:۲۱۳]

ان آیتوں میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کیا گیا ہے، جو کہ حقیقی معنوں میں توحید کے سب سے بڑے داعی اور مناد، شرک کا قلع قمع کرنے والے اور روئے زمین پر شرک کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ دراصل رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے پوری امت کو شرک سے روکا جا رہا ہے۔ بظاہر رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے پوری انسانیت کے لیے شرک کی قباحت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ بفرضِ محال رسول اکرم ﷺ اگر شرک کریں تو وہ بھی اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے ہیں۔ جب ان کی یہ حالت ہے پھر دیگر لوگوں کا کیا حال ہو گا؟ جو اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو پکارتے ہیں۔

ہر دور کے مشرکین کی یہ مشترکہ حالت رہی ہے کہ وہ اللہ رب العالمین کو خالق، مالک، رازق اور حاکم تو تسلیم کرتے رہے ہیں، مگر اُسے بلا کسی شرکتِ غیرے الٰہ (معبود) نہیں مانتے، عبادت میں اس کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک کر لیتے ہیں، اللہ کے سوا کسی مخلوق کو بھی حاجت روا اور مشکل کشا ماننے لگتے ہیں، انتہائی عاجزی اور غایت درجے کی محبت کا اظہار کسی اور کے لیے کرنے لگتے ہیں، جب کہ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے، مدد و استعانت کے لیے کسی اور کو نہ پکارا جائے اور کسی بھی اعتبار سے مخلوق میں سے کسی کو اس کا ہم سر اور مد مقابل نہ سمجھا جائے۔ اسی حقیقت کو ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے واضح فرمایا:

﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ ۘ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ ”اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو، اس کے سوا کوئی معبودِ (برحق) نہیں، اس کے چہرے (اور ذات) کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، اُسی کے لیے حکمرانی

ہے اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔" [القصص:۸۸]

اس آیتِ کریمہ میں بھی رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ذریعہ امت کو حکم دیا جارہا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو یعنی عبادت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرو، اپنی ساری امیدیں اُسی سے وابستہ رکھو، خشوع، خضوع اور تذلل کا اظہار صرف اسی کے لیے کرو، محبت اور تعظیم نیز خوف اور خشیت کے اظہار میں کسی کو اس کا ہم سر اور ہم پلہ نہ بناؤ۔ آیتِ کریمہ میں جو ﴿لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ﴾ "اس کے سوا کوئی معبودِ (برحق) نہیں" کی بات کہی گئی ہے، دراصل یہی تمام انبیاء کی دعوت کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، ہماری تخلیق کا مقصود اور غرض وغایت بھی اسی حکم کی بجا آوری ہے، اس میں بیک وقت شرک کی پُرزور تردید و نفی اور توحید کا اثبات پایا جاتا ہے۔ چناں چہ ہر طرح کی عبادت اور بندگی کے لائق وہی ذاتِ واحد ہے، جو ذات ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، کائنات میں صرف اُسی کا حکم چلتا ہے، وہی سب کا حاکم اور فرماں روا ہے، سب کو اُسی کی طرف جانا ہے اور اس کے سامنے پیش ہو کر اپنے کیے کا جواب دینا ہے۔ اُس کے سوا سب کو ہلاکت کا سامنا کرنا ہے اور سب کو جامِ فنا پینا ہے۔ اِس لیے صرف اُسی ایک ہستی کو بِلا شرکتِ غیرے اپنا معبود بناؤ۔ اپنے ذہن کے دریچوں کو کھول کر عقل و دانش کا استعمال کرتے ہوئے غور کریں کہ جو خود ہلاک ہونے والے ہیں اور اللہ کے حضور اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں، وہ معبود کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور کیوں کر انھیں اللہ تعالیٰ کا ہم سر قرار دیا جا سکتا ہے؟

اوپر کی سبھی آیات میں غور کریں! تو آپ کو معلوم ہو گا کہ تمام آیات میں غیر اللہ کو پکارنے سے روکا گیا ہے، یعنی غیر اللہ کو پکارنا گویا اس کی عبادت کرنا ہے۔ اِس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو بھی مافوق الأسباب طریقے سے پکارنا اللہ کے ساتھ اُسے شریک قرار دینا ہے، اُسے اللہ کا ہم سر بنانا ہے اور قرآن کریم میں بڑی شدت کے ساتھ اس سے منع کیا گیا ہے اور صرف ایک اکیلے اللہ کی عبودیت بجالانے کی تاکید کی گئی ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ میں اس کا بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنی عبادت کا حکم دیتے ہوئے اور اپنا ہم سر بنانے سے روکتے ہوئے فرمایا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعْبُدُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُمْ وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ فِرَٰشًا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءً وَأَنزَلَ مِنَ

ٱلسَّمَآءِ مَآءً فَأَخۡرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزۡقًا لَّكُمۡۖ فَلَا تَجۡعَلُواْ لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمۡ تَعۡلَمُونَ﴾ ''اے لوگو! عبادت کرو اپنے اُس رب کی جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور تم سے پہلے لوگوں کو بھی پیدا کیا ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا، اور آسمان سے پانی اتارا پھر اس کے ذریعہ تمھاری روزی کے لیے کئی طرح کے پھل پیدا کیے۔ پس تم کسی کو اللہ کا ہم سر نہ بناؤ حالاں کہ تم جانتے ہو۔'' [البقرۃ:۲۱-۲۲]

یہ آیتِ کریمہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کو واجب اور دیگر مخلوقات کی عبادت کو باطل قرار دیتی ہے اور توحید ربوبیت کا ثبوت فراہم کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی زمین و آسمان کا خالق، رازق اور مدبر ہے۔ اور جب بندہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ خالق، رازق اور مدبر ہونے میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے تو اس کی عبادت میں بھی کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیے۔

یہ کس قدر تعجب خیز اور حماقت بھری بات ہے کہ انسان جانتے بوجھتے ہوئے اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کی پرستش میں لگا ہوا ہے، جب کہ اسے اس بات کا بخوبی علم ہے کہ خالق، مالک، رازق اور مُدبِّر ہونے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک وساجھی نہیں ہے اور نہ الوہیت وعبادت میں کوئی اس کا مدمقابل اور ہم سر ہے۔ اس اعتراف واقرار کے باوجود بھی انسان دوسرے کی عبادت کرتا ہے، یہ کتنی بڑی نادانی اور محرومی کی بات ہے!!

اللہ تعالیٰ نے آیتِ کریمہ میں مخلوقات میں سے کسی کو بھی اپنا ہم سر اور مدمقابل بنانے سے روکا ہے، یعنی کسی بھی مخلوق کو اُس کا ہم سر، مدمقابل اور اس کی برابری کرنے والا بنا کر اس کی عبادت کی طرح اس مخلوق کی عبادت نہ کرو اور اس سے اس طرح محبت نہ کرو جس طرح اللہ سے محبت کرتے ہو، کیوں کہ دیگر مخلوقات کی طرح عبادت کیے جانے والے لوگ بھی مخلوق ہیں، وہ بھی روزی دیے گئے ہیں، ان کی زندگی کی بھی تدبیر کی جاتی ہے، وہ بھی محتاج ہیں، زمین وآسمان میں ایک ذرہ برابر کے بھی وہ مالک نہیں ہیں، نہ وہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان، پھر کیوں کر ان کی عبادت کرتے ہو؟ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَدْعُو مِنْ دُونِ اللَّهِ نِدًّا دَخَلَ النَّارَ)) ''جو شخص اس حالت میں مرا کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی شریک، ہم سر کو پکارتا تھا تو وہ

جہنم میں داخل ہو گا۔“ [صحیح بخاری: ۴۴۹۷، صحیح مسلم:۹۲]

نیز سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((قَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ)) ”اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: میں ساجھی داروں کے شرک سے بے نیاز ہوں، جس کسی نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو ساجھی دار بنایا تو میں اس عمل کو اور اس کے حصے کو چھوڑ دیتا ہوں۔“ [صحیح مسلم:۲۹۸۵]

اللہ کے سوا جن لوگوں کو پکارا جاتا ہے خواہ وہ بت ہوں یا فوت شدہ اشخاص ہوں یا مظاہرِ فطرت ہوں، وہ سب مل کر بھی ایک مکھی نہیں پیدا کر سکتے، نہ پہلے ان میں یہ طاقت تھی، نہ اب ہے اور نہ آئندہ وہ ایسا کر سکتے ہیں، بلکہ اللہ کی یہ معمولی مخلوق مکھی اگر ان سے کوئی چیز چھین لے تو اس سے واپس لینے کی ذرہ برابر سکت نہیں رکھتے ہیں۔ اللہ رب العالمین نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ۖ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ۚ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ﴾ ”اے لوگو! ایک مثال بیان کی گئی ہے، سو اسے غور سے سنو! بے شک جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ سب مِل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے اس سے ہر گز چھڑا نہیں سکتے، مدد مانگنے والا بھی کمزور ہے اور جن سے مدد مانگی جاتی ہے وہ بھی کمزور ہے۔“ [الحج:۷۳]

کتنے بے وقوف ہیں وہ لوگ جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارتے ہیں، جو ایک حقیر مکھی بھی نہیں پیدا کر سکتے اور اگر وہی معمولی مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو اسے واپس نہیں لے سکتے ہیں، جب کہ مکھی انتہائی کمزور اور ناتواں مخلوق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مکھی کے ساتھ ساتھ اللہ کے سوا دوسروں کو پکارنے والے بھی کمزور ہیں اور جن کو پکارا جاتا ہے وہ بھی کمزور ہیں۔

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ اگرچہ بتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مگر اس کا حکم تمام خود ساختہ معبودانِ باطلہ کے لیے عام ہے۔ چناں چہ اللہ کے سوا جن لوگوں کو بھی پکارا جا رہا ہے وہ سب ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ میں داخل ہیں۔ خواہ وہ کوئی بھی ہوں، بت ہوں یا فوت شدہ اشخاص، جنھیں مدد و معاونت اور سفارش کے لیے پکارا جاتا ہے۔ یعنی ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کی عمومیت میں صرف بت ہی شامل نہیں

ہیں، بلکہ تمام مخلوقات میں سے جنھیں بھی داتا، حاجت روا، دست گیر، مشکل کشا اور دافع بلا سمجھ کر پکارا جاتا ہے، سب کے سب ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کی عمومیت میں شامل ہیں۔ اور وہ سب مل کر کے ایک مکھی بھی نہیں پیدا کر سکتے اور نہ اس سے چھینی ہوئی حقیر چیز واپس لینے کی سکت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی اللہ کے علاوہ لوگوں کو بھی مدد کے لیے پکارا جائے اور ان سے اپنی ضرورتیں طلب کی جائیں تو اس سے بڑی نادانی اور خسارہ اٹھانے والی بات اور کچھ نہیں ہو گی۔

مشرکینِ مکہ جو اپنے بزرگوں اور صالحین کے نام پر موجود مختلف بتوں کی پرستش کرتے تھے، ان کے لیے چڑھاوے چڑھاتے تھے، منتیں مانتے تھے اور ان سے اپنی امیدیں وابستہ رکھتے تھے، وہ اس بات کے قائل تھے کہ ہم ان بتوں کی پوجا اُنھیں خالق ومالک سمجھ کر نہیں کرتے ہیں، ہمارا خالق ومالک تو ایک ہی ہے، اسی نے زمین و آسمان بنایا، ہم تو اِنھیں اُس ایک معبود کا تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اللہ تو بہت بلند و بالا ہے، ہماری رسائی وہاں تک کیسے ہو سکتی ہے؟ سو یہ سب اس کے دربار میں ہمارے وکیل اور سفارشی ہیں اور ہماری رسائی اللہ تک کرا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس باطل قول کو نقل کرتے ہوئے فرمایا: ﴿...مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ...﴾ ”ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں گے۔“ [الزمر: ٣]

موجودہ دور میں پیروں، ولیوں اور قبروں کی پوجا کرنے والے نیز اللہ کی عبادت اور الٰہی خصائص میں غیر اللہ کو شریک کرنے والے بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم پیروں اور بزرگوں کی عبادت نہیں کرتے ہیں، یہ تو بس اللہ کا تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں اور اس طرح وہ دھڑلے سے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں قبر پرستی اور پیر پرستی کی جو وبا عام ہے وہ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ لوگ کسی مخلوق کو الٰہی صفات و خصوصیات سونپ کر اس کی عبادت و پیروی کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک اللہ کو ماننے اور اس کی عبادت کرنے والے ہیں، جس کی وجہ سے مسلم معاشرے میں شرک اکبر اور شرک اصغر کی بہ کثرت صورتیں عام ہیں اور کئی طرح سے شرک کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔

اللہ ہمیں شرک کی آلودگیوں سے بچائے اور تا دم حیات توحیدِ خالص پر قائم رہنے اور صرف اپنی عبادت کرنے کی توفیق دے۔ آمین!

مرنے کے بعد جاری رہنے والے اعمال

(٤٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ : صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَو عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَو وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین کاموں کے: صدقہ جاریہ، وہ علم جس سے استفادہ کیا جائے اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔" (صحیح مسلم:١٦٣١)

شرح و فوائد :

انسان کے مرنے کے بعد جو کچھ اجر و ثواب اس کے اعمالِ صالحہ کی وجہ سے یا اور دیگر وجہ سے پہنچتا ہے اس کی تین صورتیں ہیں یعنی ایصالِ ثواب کی تین صورتیں ہیں:

اوّل: وہ عملِ صالح جسے دوسرے لوگوں نے میت کی ارشاد و رہنمائی کی وجہ سے انجام دیا۔

دوم: میت کی جانب سے کیے گئے وہ اعمال اور کارنامے جن سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔

سوم: وہ مشروع امور و اعمال جنھیں دوسرے لوگ انجام دیں اور میت کے دینی مقام و مرتبے یا قربت کی وجہ سے میت کی طرف سے ادا کریں یا اس کی جانب سے صدقہ کریں یا اس کے لیے دعائیں کریں۔ ایصالِ ثواب کی خاطر انجام دیے گئے یہ سارے اعمال خواہ میت کی صلبی و حسی اولاد کی جانب سے ہو یا پھر ان روحانی و معنوی اولاد کی جانب سے ہو جنھوں نے اس سے تعلیم و تربیت یا ہدایت و رہنمائی حاصل کی ہو یا اس کے رشتہ و اقارب اور دوست و احباب یا پھر عام مسلمانوں کی طرف سے ہو۔

ایصالِ ثواب کی یہ تینوں صورتیں زیرِ مطالعہ حدیث میں بیان ہوئی ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موت کے بعد اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے یعنی اس کے اعمال کے اجر و ثواب کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے، مگر تین صورتیں ایسی ہیں کہ اگر مومن شخص اپنی زندگی میں انھیں حسنِ نیت سے انجام دے لے تو اللہ کے فضل سے مرنے کے بعد بھی ان کے اجر و ثواب کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

❶ **جاری رہنے والا صدقہ:** اس سے مراد ایسا صدقہ ہے جو عوام کی بھلائی کے لیے وقف کر دیا

جائے۔ اس میں او قاف اور خیر و بھلائی کی وہ ساری صورتیں اور شکلیں شامل ہیں، جس سے لوگ صدقہ کرنے والے کی موت کے بعد فائدہ اٹھائیں، مثلاً مسجد و مدرسہ، سرائے، یتیم و مسافر خانہ، اسپتال اور پُل و سڑک وغیرہ کی تعمیر، لوگوں کے لیے نل، کنواں، موٹر وغیرہ کے ذریعہ پانی کا انتظام اور جاری رہنے والے رفاہِ عامہ کے دیگر کام اور یہ سارے کام خواہ انسان نے مستقل حیثیت سے انفرادی طور پر انجام دیے ہوں یا مشترکہ طور پر لوگوں کے ساتھ مل کر کیے ہوں، ہر صورت میں اس کا ثواب ملتا رہے گا۔

سرحدِ اسلام کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہونے والے کے عمل و ثواب میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے، جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔ سیدنا فَضَالہ بن عُبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كُلُّ مَيِّتٍ يُخْتَمُ عَلَى عَمَلِهِ، إِلَّا الَّذِي مَاتَ مُرَابِطًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ، فَإِنَّهُ يُنْمَى لَهُ عَمَلُهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَيَأْمَنُ مِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ)) ”ہر میت اپنے عمل پر ختم کر دیا جاتا ہے سوائے اس شخص کے جو اللہ کی راہ میں سرحد کی پاسبانی کرتے ہوئے مرے، کیوں کہ اس کا عمل قیامت کے دن تک بڑھایا جاتا رہے گا اور وہ قبر کے فتنہ سے مامون رہے گا۔“ [صحیح / سنن ترمذی: ۱۶۲۱، سنن أبوداود: ۲۵۰۰] یعنی مُرابط (سرحد کی پاسبانی کرنے والے) کے عمل کا ثواب بڑھتا رہتا ہے اور یہ اضافہ کسی دوسرے کے عمل کے ساتھ ملے بغیر ہوتا ہے جب کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث میں جو امورِ ثلاثہ ہیں ان کا ثواب میت کو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب دوسرے لوگ اس سے مستفید ہوتے ہیں، اس لیے دونوں حدیثوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے اور دونوں حدیثیں آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ اسی طرح اللہ کی راہ میں سرحد کی پاسبانی کرتے ہوئے شہید ہونے والا شخص اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر دشمنوں کے مقابلے میں خود کو فدا کر دیتا ہے، جس سے اس کا مقصود مسلمانوں کی نصرت و مدد کے ساتھ ساتھ کفار کو دینِ اسلام کی دعوت دینا بھی ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کو امن وچین اور رعب و دبدبہ حاصل ہوتا ہے اور کفار کو دینِ اسلام میں داخل ہونے کی سعادت حاصل ہوتی ہے، چہار دانگِ عالم میں اسلام کی اشاعت ہوتی ہے، گویا مُرابطہ بھی صدقہ جاریہ میں داخل ہے، کیوں کہ اس کا فائدہ برابر جاری رہتا ہے۔

❷ **نفع بخش علم:** اس سے مراد کتاب و سنت سے ماخوذ شرعی علم اور ہر وہ علم ہے جو انسانیت کے

لیے نفع بخش ہو اور نیت کی درستی اور دین کی سربلندی اس میں شامل ہو، خواہ یہ شاگردوں کے ذریعہ ہو یا مفید کتابوں کی تالیف و تصنیف کے ذریعہ ہو یا علمِ نافع کے فروغ میں مالی اعانت کے ذریعہ ہو، مثلاً مساجد و مدارس کی تعمیر یا دینی طلبہ کی کفالت وغیرہ۔ چناں چہ کتاب و سنت کی تعلیم دینا یا ان کی تعلیم کا بندوبست کرنا یا درس و تدریس اور وعظ و نصیحت کی مجلسیں قائم کرنا یا مفید کتابوں کی تصنیف و تالیف کرنا اور ان کی نشر و اشاعت میں حصہ لینا، قرآنی نسخوں کی اشاعت و تقسیم میں حصہ لینا، دینی بیانات پر مشتمل آڈیو، ویڈیو تیار کرنا وغیرہ صدقہ جاریہ کی صورتیں ہیں اور جب تک یہ مفید علمی سرمایہ دنیا میں موجود و جاری رہے گا اور لوگ اس سے فیض یاب ہوں گے تو انسان کو اس کا اجر و ثواب ملتا رہے گا۔

صحیح مسلم کی یہ روایت: ((مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْءٌ، وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ)) ”جس کسی نے اسلام میں [کتاب و سنت سے ثابت] کوئی اچھا طریقہ رائج کیا تو اس کے لیے اس کے عمل کا اجر ہے اور ان کا اجر بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کریں ان کے اجر میں کوئی کمی کیے بغیر اور جس نے اسلام میں کسی بُرے طریقے کو رائج کیا تو اس پر اس عمل کا بوجھ و گناہ ہے اور ان کا بوجھ بھی جنھوں نے اس کے بعد اس پر عمل کیا، ان کے بوجھ و گناہ میں کوئی کمی کیے بغیر۔“ [صحیح مسلم: ۱۰۱۷] قطعاً زیرِ بحث حدیث کے منافی و معارض نہیں ہے، کیوں کہ احیائے سنت بھی نفع بخش علم میں داخل ہے۔

عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ : حدیث کا یہ ٹکڑا واضح طور پر علم اور اہلِ علم کی اہمیت و فضیلت پر دلالت کرتا ہے، چناں چہ علمائے دین کے علمِ نافع سے دنیا میں جب تک فائدہ اٹھایا جائے گا اس کا اجر و ثواب انھیں پہنچتا رہے گا، خواہ وہ نفع بخش علم ان کے تقاریر و بیانات کی صورت میں ہو اور بالواسطہ یا بلا واسطہ شاگردان کی صورت میں ہو یا ان کی طبع شدہ کتابوں کی صورت میں ہو۔

❸ **نیک اولاد:** حدیث میں ((يَدْعُو لَهُ)) ”جو اس کے حق میں دعا کرے“ کے الفاظ ترغیب کے لیے ہیں، شرط کے طور پر نہیں ہیں، یعنی اگر والدین نے اولاد کی صحیح اسلامی تربیت کے ذریعہ انھیں نیک و صالح بنایا ہے تو اولاد کے اعمالِ صالحہ کا ثواب ازخود والدین کو پہنچتا رہے گا خواہ وہ دعا کریں یا نہ کریں،

جیسا کہ متعدد احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے، چناں چہ سنن ابن ماجہ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مروی حدیث سے مذکورہ امورِ ثلاثہ کی مزید وضاحت ہوتی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نیک اولاد علی الاطلاق والدین کے لیے صدقہ جاریہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ عِلْمًا عَلَّمَهُ وَنَشَرَهُ، وَوَلَدًا صَالِحًا تَرَكَهُ، وَمُصْحَفًا وَرَّثَهُ، أَوْ مَسْجِدًا بَنَاهُ، أَوْ بَيْتًا لِابْنِ السَّبِيلِ بَنَاهُ، أَوْ نَهْرًا أَجْرَاهُ، أَوْ صَدَقَةً أَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِي صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ، يَلْحَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ)) ”مومن کو وفات کے بعد جو نیک عمل پہنچتے ہیں ان میں یہ بھی ہیں: علم جس کی اس نے تعلیم دی اور جسے پھیلایا یا نیک اولاد جسے اس نے چھوڑا یا قرآن مجید کا نسخہ جسے وراثت میں چھوڑ گیا یا مسجد جسے اس نے تعمیر کیا یا گھر جسے اس نے مسافروں کے لیے بنایا یا نہر جسے اس نے جاری کیا یا صدقہ جسے اس نے صحت کی حالت میں اپنی زندگی میں نکالا، ان سب کا ثواب اس کی موت کے بعد اسے ملتا رہتا ہے۔“ [حسن / سنن ابن ماجہ: ۲۴۲، اس حدیث کو شیخ زبیر علی زئی رحمہ اللہ نے ولید بن مسلم کے عنعنہ اور مرزوق بن ابو ہذیل کے لین الحدیث ہونے کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے، لیکن امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ صحیح ہے اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔]

نیز ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **((إِنَّ مِنْ أَطْيَبِ مَا أَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهِ، وَوَلَدُهُ مِنْ كَسْبِهِ))** ”انتہائی پاکیزہ مال جو انسان کھاتا ہے جو اس کی اپنی کمائی کا ہو اور اس کی اولاد اس کی اپنی کمائی ہے۔“ [صحیح / سنن أبو داود: ۳۵۲۸]

یہ حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اولاد کے اعمالِ صالحہ کا ثواب والدین کو بھی پہنچتا ہے، کیوں کہ اولاد کو انسان کی کمائی قرار دیا گیا ہے اور جب اولاد انسان کی کمائی ہے تو اس کے اعمالِ صالحہ کا ثواب بھی والدین کو حاصل ہو گا۔ نیز نیک اولاد میں لڑکا لڑکی سمیت انسان کی اپنی تمام صلبی اولاد کے علاوہ وہ روحانی اولاد بھی شامل ہیں کہ جنھیں اس نے کتاب و سنت کی تعلیم دی اور صحیح اسلامی نہج پر ان کی تعلیم و تربیت کی، لہٰذا ہر فرد کو اس جانب خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور حدیث میں جاری رہنے والے اعمالِ صالحہ کی تعداد سات بتائی گئی ہے، جو در حقیقت انہی تینوں کی تفصیل ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((سَبْعٌ يَجْرِيْ لِلْعَبْدِ أَجرُهُنَّ وَهُوَ فِيْ قَبرِهِ بَعْدَ مَوْتِه : مَنْ عَلَّمَ عِلْمًا، أَوْ أَجْرَى

نَهْرًا، أَوْ حَفَرَ بِئْرًا، أَوْ غَرَسَ نَخْلًا، أَوْ بَنَى مَسْجِدًا، أَوْ وَرَّثَ مُصْحَفًا، أَوْ تَرَكَ وَلَدًا يَسْتَغْفِرُ لَهُ بَعْدَ مَوتِهِ)) ''سات چیزوں کا اجر بندے کے لیے جاری رہتا ہے جب کہ وہ اپنی موت کے بعد اپنی قبر میں ہوتا ہے: جس نے کوئی علم سکھایا، یا نہر جاری کیا، یا کنواں کھودا، یا پودا لگایا، یا مسجد بنائی، یا مصحف ورثے میں چھوڑا، یا کوئی بچہ چھوڑا جو اس کے مرنے کے بعد اس کی مغفرت کے لیے دعا کرے۔'' [حسن / مسند البزار : ٧٢٨٩، صحيح الجامع الصغير وزيادته للألباني : ٣٦٠٢]

زیرِ مطالعہ حدیث کے آخری جملے کے ذریعہ اولاد کو والدین کے حق میں دعائے خیر و مغفرت کرنے اور والدین کو اپنی اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت دینے کی ترغیب دی گئی ہے، مگر افسوس کہ موجودہ دور میں بیش تر لوگ اس جانب سے پہلو تہی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی توفیق نہیں ملتی ہے اور والدین محض دنیوی مال و دولت اور جاہ و حشمت کے حصول کے لیے اپنی اولاد کی دینی تعلیم وتربیت سے حد درجہ غفلت برت رہے ہیں، جو خود ان کے لیے بھی خسارے کا باعث ہے۔ صدقۂ جاریہ اور نفع پہنچانے والا علم تو اہلِ ثروت اور اہلِ علم کے ساتھ خاص ہو سکتا ہے، مگر اولاد کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے ہر کوئی کوشش کر سکتا ہے اور اس کی کوشش بارآور بھی ہو سکتی ہے۔ کاش! لوگ اس جانب توجہ دیں اور اولاد کی ایسی تربیت کریں اور انھیں ایسی تعلیم دیں جو مرنے کے بعد ان کے لیے دعائے خیر و مغفرت کر سکیں اور نیکیوں کی راہ اپنائیں کہ جس سے والدین بھی فیض یاب ہو سکیں، نیز اولاد کو بھی ہر حال میں اپنے والدین کے حق میں دعا کرتے رہنا چاہیے۔

آج کل دین پسند امیر گھرانوں میں نفلی حج اور عمرہ کا رواج بہت عام ہے اور یہ عمل فضیلت و ثواب کا باعث بھی ہے بلکہ صالح نیت سے کیا گیا کوئی بھی مشروع عمل قابلِ تحسین اور مستحقِ اجر و ثواب ہے، مگر ہمارے یہاں کے عام معاشرتی مسائل اور ہندوستانی مسلمانوں کی خستہ حالت اس بات کی متقاضی ہیں کہ صدقاتِ جاریہ کی جانب بھی خاطر خواہ توجہ دی جائے، کیوں کہ یہ عمل انتہائی پائیدار ہو گا اور مرنے کے بعد بھی اس کا اجر و ثواب صدقۂ جاریہ کرنے والے کے حق میں برابر جاری رہے گا۔

زیرِ مطالعہ حدیثِ نبوی میں وفات کے بعد اجر و ثواب پہنچانے والے مذکور تمام اعمال ایسے ہیں جو فوت ہونے والے نے اپنی زندگی میں خود کیے تھے، تاہم مختلف احادیث کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ

ایسے اعمال بھی ہیں، جن کے ذریعہ میت کو اجر وثواب پہنچتا رہتا ہے:

▪ متعلقین و اقرباء کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ کسی بھی صالح شخص کی جانب سے میت کے لیے دعائے مغفرت کرنا میت کے حق میں فائدہ بخش اور سود مند ہے، جیسا کہ کتاب و سنت کے بہت سارے نصوص میں عام مؤمنین کی مغفرت کے لیے دعا کی ترغیب دی گئی ہے اور نصوصِ کتاب و سنت میں اس بات کی بھی صراحت پائی جاتی ہے کہ مؤمنین کے حق میں کی گئی مسلمانوں کی دعاؤں کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔

▪ اس بات پر اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ میت کے حق میں اولاد و احفاد اور اقرباء کی جانب سے مالی صدقہ کرنا بھی میت کے حق میں نفع بخش ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ قبیلہ بنی ساعدہ کے بھائی سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی ماں کا انتقال ہوا تو وہ ان کے پاس موجود نہیں تھے، پس وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میری ماں فوت ہو گئیں جب کہ میں ان کے پاس موجود نہیں تھا اب اگر میں ان کی جانب سے صدقہ کروں تو کیا یہ ان کے لیے کچھ نفع بخش ہو گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں" سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ بے شک میرا پھل دار باغ ان کی طرف سے صدقہ ہے۔ [صحیح بخاری: ۲۷۵۶، ۲۷۶۲] نیز سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے والد فوت ہو گئے ہیں اور انھوں نے مال چھوڑا ہے اور کوئی وصیت نہیں کی ہے، پس اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں" [صحیح مسلم: ۱۶۳۰]

▪ اگر میت نے اپنے پیچھے مال و دولت چھوڑا ہے تو اس کی طرف سے قرض کی ادائیگی کرنا میت کے ورثاء پر وصیت پر عمل کرنے اور وراثت کی تقسیم سے پہلے ہی واجب ہے۔ [دیکھیے: حسن / سنن ترمذی: ۲۰۹۴] لیکن اگر نہیں چھوڑا ہے اور ورثاء کے پاس قرض ادا کرنے کی وسعت و استطاعت نہیں ہے تو کوئی بھی شخص ادا کرنے کی ذمہ داری لے سکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری خود لے رکھی تھی۔ [صحیح / سنن أبو داود: ۲۹۵۴] لہٰذا اگر کوئی ذمہ داری اٹھانے والا نہ ہو تو ایسے لوگوں کے قرض کی ادائیگی بیت المال سے کی جائے گی یا پھر بیت المال کی عدم موجودگی میں گاؤں اور محلے کے مسلمانوں کو اس کا قرض ادا کرنا چاہیے، اس لیے کہ قرض ادا کرنے کا فائدہ میت کو

پہنچتا ہے، چناں چہ میت کی مغفرت کا معاملہ قرض کی ادائیگی تک معلق رہتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ حَتَّى يُقْضَى عَنْهُ)) ”مؤمن کی جان اس کے قرض کے ساتھ لٹکی رہتی ہے، یہاں تک کہ اسے ادا کر دیا جائے“ [صحیح / سنن ترمذی: ۱۰۷۸، سنن ابن ماجہ: ۲۴۱۳] قرض کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ شہید کا معاملہ بھی اس کی وجہ سے معلق رہتا ہے، یہاں تک کہ سوائے قرض کے شہید کے سارے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((يُغْفَرُ لِلشَّهِيْدِ كُلُّ ذَنْبٍ إِلَّا الدَّيْنَ)) ”قرض کے سوا شہید کے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔“ [صحیح مسلم: ۱۸۸۶] اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقروض کا جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا اور جب ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے ادائیگی کی ذمہ داری لی تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ [صحیح بخاری: ۲۲۸۹، ۲۲۹۵]

- ایصالِ ثواب کی خاطر میت کی طرف سے کوئی بھی بدنی عبادت نہیں ادا کی جائے گی، کیوں کہ بنیادی طور پر بدنی عبادت میں کسی کی نیابت زندگی میں جائز نہیں ہے تو پھر مرنے کے بعد کیوں کر جائز ہو گی؟ البتہ بطور نیابت جن عبادتوں کا انجام دینا کتاب و سنت کے واضح اور صریح نصوص سے ثابت ہے انھیں میت کی طرف سے ادا کیا جا سکتا ہے اور وہ محدود طور پر دو ہیں:

❶ میت کی طرف سے قضا شدہ روزے، جسے وہ قدرت کے باوجود نہ رکھ سکا ہو اور اس کی جانب سے مانے گئے نذر کے روزے جسے پورا کرنے سے پہلے ہی اس کی وفات ہو گئی، ورثاء پر ان کو پورا کرنا ضروری ہے، خواہ میت نے اس کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ)) ”جو کوئی فوت ہو جائے اور اس کے ذمے روزے ہوں تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے۔“ [صحیح بخاری: ۱۹۵۲، صحیح مسلم: ۱۱۴۷]

نیز سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول! میری ماں وفات پا گئیں اور ان کے ذمہ ایک مہینے کا روزہ ہے، کیا میں ان کی جانب سے ان روزوں کی قضا دے سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، مزید فرمایا: ((فَدَيْنُ اللَّهِ أَحَقُّ أَنْ يُقْضَى)) ”اللہ کا قرض اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کو پورا کیا جائے۔“ [صحیح

بخاری:۱۹۵۲، صحیح مسلم:۱۱۴۸]

تاہم میت کے جو روزے شرعی عذر مثلاً شدید بیماری اور سفر وغیرہ کی وجہ سے چھوٹے ہوں تو ورثاء ان روزوں کی تکمیل کے مکلف نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فرمان: ﴿**لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا...**﴾ ”اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا، مگر اس کی گنجائش کے مطابق“ [البقرۃ:۲۸۶] کے بموجب انھیں ویسے ہی معاف فرمادے گا۔ ویسے ان روزوں کے بدلے میں فدیہ دینا بہتر ہے۔

❷ میت کی جانب سے حج بدل کرنا جائز ہے، خواہ میت پر حج فرض ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اور خواہ اس نے اس کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ اور اگر میت استطاعت کے باوجود کسی مجبوری کی بنا پر حج نہیں کر سکا یا حج کرنے کی نذر مانی اور اسے پورا کرنے سے پہلے ہی فوت ہو گیا تو ایسی صورت میں میت کی طرف سے حج کرنا جائز ہی نہیں بلکہ استطاعت کی صورت میں واجب ہے۔ سیدنا بُریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اسی درمیان ایک عورت آئی اور عرض کیا: میں نے اپنی ماں کو ایک لونڈی بطور صدقہ دیا تھا اور اب وہ وفات پا چکی ہیں، تو آپ نے فرمایا: تمھارا اجر ثابت ہو گیا اور حقِ وراثت نے اسے تجھ پر لوٹا دیا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! بے شک ان کے اوپر ایک مہینے کا روزہ تھا کیا میں ان کی طرف سے روزہ رکھ دوں؟ آپ نے فرمایا: ان کی طرف سے تم روزہ رکھ دو۔ انھوں نے کہا: میری ماں نے کبھی بھی حج نہیں کیا تھا کیا میں ان کی طرف سے حج کر دوں؟ آپ نے فرمایا: تم ان کی طرف سے حج کر دو۔ [صحیح مسلم: ۱۱۴۹] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قبیلۂ جُہَینہ کی ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: میری والدہ نے حج کی منت مانی تھی، لیکن وہ حج نہ کر سکیں یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئیں، کیا میں ان کی طرف سے حج کروں؟ آپ نے فرمایا: ((**نَعَمْ، حُجِّي عَنْهَا، أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ أَكُنْتِ قَاضِيَةً؟ اُقْضُوا اللَّهَ؛ فَاللَّهُ أَحَقُّ بِالْوَفَاءِ**)) ”ہاں! ان کی طرف سے تو حج کر، تمھارا کیا خیال ہے اگر تمھاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا نہ کرتیں؟ اللہ کا قرض ادا کرو، اللہ اس کو پورا کرنے کا زیادہ حق دار ہے۔“ [صحیح بخاری:۱۸۵۲]

ایصالِ ثواب سے متعلق مذکورہ بالا صورتوں کے سوا میت کی طرف سے کوئی اور بدنی عبادت کرنا یا ثواب پہنچانے کی خاطر کسی بدنی عبادت کو میت کے واسطے انجام دینا جائز نہیں ہے اور یہ استدلال بھی

درست نہیں ہے کہ میت کی طرف سے روزہ رکھنا اور حج کرنا چوں کہ ثابت ہے اس لیے بطور ایصالِ ثواب دیگر اور عبادات اس کی جانب سے ادا کی جاسکتی ہیں، اس لیے کہ عبادات توقیفی ہیں یعنی شریعت کی جانب سے مقرر کردہ ہیں اور ان کی عام یا مخصوص ادائیگی کے لیے صریح دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ چناں چہ ایصالِ ثواب کے نام پر قُل اور قرآن خوانی کا اہتمام کرنا، تیجہ، ساتواں، دسواں اور چالیسواں وغیرہ کرنا خود کی گھڑی ہوئی بدعات ہیں، جن سے بچنا ضروری ہے۔ ان اعمال کی انجام دہی سے میت کو ثواب بھی نہیں پہنچے گا، بلکہ ان بدعات کو انجام دینے والے شریعت کی مخالفت کرنے کی وجہ سے خود ہی گناہ گار ہوں گے۔ درحقیقت یہ سارے گھڑے ہوئے اعمال میت کے حق میں صدقہ و خیرات کے بجائے رشتہ و اقارب کو کھانے کھلانے اور شکم پروری کی رسمِ بد ادا کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں، اگر حقیقت میں آپ اپنے والدین اور اقرباء کے لیے ایصالِ ثواب کے خواہاں ہیں تو ان بدعی طریقوں کے بجائے شرعی طریقے کو اپنائیں اور اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے والدین کی تعلیم وتربیت کے مطابق رب چاہی زندگی گزاریں اور زیادہ سے زیادہ نیکیوں کے کام انجام دیں۔ یاد رکھیں آپ کے ان اعمالِ صالحہ کا مکمل اجر و بدلہ جہاں آپ کو ملے گا وہیں آپ کے والدین کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔

زیرِ بحث حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد انسان کا تعلق دنیا سے یکسر منقطع ہو جاتا ہے، نہ وہ کسی کی مدد کر سکتا ہے اور نہ کوئی مخلوق اس کی کسی طرح سے مدد کر سکتی ہے سوائے ان مخصوص اعمال و افعال کے جن کا بیان کتاب و سنت میں ہوا ہے۔ جو لوگ قبروں میں مدفون لوگوں سے فریاد رسی کرتے ہیں اور ان سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں حقیقت میں یہ شرک ہے، مرنے کے بعد انسان کا تعلق دنیا سے ختم ہو جاتا ہے اور وہ دنیا والوں کی مدد کرنے کے بجائے خود مدد کے محتاج ہوتے ہیں۔

زیرِ مطالعہ حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ نیک و صالح خاتون سے شادی کرنی چاہیے تاکہ نیک و صالح اولاد ہوں اور اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت ہو سکے۔ آج کل اس جانب بہت کم توجہ دی جاتی ہے اور بیش تر لوگوں کی نگاہ سیرت و کردار کے بجائے مال و دولت پر ہوتی ہے اور ایسا دونوں جانب سے ہوتا ہے یعنی کماؤ داماد اور مال و جاہ والی بہو کی تلاش ہوتی ہے۔

✿ ✿ ❁ ✿ ✿

حاملینِ حدیث کے لیے دعائے نبوی اور مؤمن کی چند خوبیاں

(٤٤) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**نَضَّرَ اللَّهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَأَدَّاهَا، فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيهٍ، وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ. ثَلَاثٌ لَا يَغُلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ مُسْلِمٍ إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلَّهِ وَالنَّصِيْحَةُ لِلْمُسْلِمِينَ وَلُزُومُ جَمَاعَتِهِمْ فَإِنَّ دَعْوَتَهُمْ تُحِيْطُ مِنْ وَّرَائِهِمْ**)) رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ وَغَيْرُهُ.

ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ اس شخص کو تروتازہ رکھے، جس نے میری حدیث کو سنا، اسے یاد کیا، اس کی حفاظت کی اور پھر اسے آگے بیان کیا، بعض اوقات حاملِ فقہ فقیہ نہیں ہوتا اور بسا اوقات حاملِ فقہ اپنے سے زیادہ فقیہ تک بات پہنچا دیتا ہے۔ تین خصلتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں مسلمان کا دل خیانت اور بخل نہیں کرتا: اللہ کے لیے عمل کو خالص کرنا، مسلمانوں کے لیے خیر خواہی اور مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنا، کیوں کہ ان (مسلمانوں) کی دعوت (دعا) دور والوں کو بھی گھیر لیتی ہے۔" (صحیح / مسند الشافعی : ١١٠٥، کتاب الرسالة ص:٤٠١، شعب الإیمان للبیہقی:١٧٣٨)

شرح و فوائد :

یہ حدیث مسند شافعی اور شعب الإیمان کے علاوہ سنن ترمذی:٢٦٥٨، سنن أبو داود:٣٦٦٠، سنن ابن ماجہ :٢٣٠، ٢٣٦، ٣٠٥٦، سنن دارمی : ٢٣٣، ٢٣٤، ٢٣٥، ٢٣٦، اور مسند احمد : ١٣٣٥٠، ١٦٧٣٨، ١٦٧٥٤، ٢١٥٩٠ وغیرہ میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ موجود ہے۔

اس مہتم بالشان حدیث کو سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ کئی ایک صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، جن کی تعداد تقریباً چوبیس کے قریب ہے اور اس حدیث کے طرق واسانید کی تعداد ایک سو پچاس سے زائد ہے، جیسا کہ شیخ **عبد المحسن بن حمد العباد البدر** حفظہ اللہ نے اپنی کتاب "**دراسة حديث نضر الله امرءًا سمع مقالتي...رواية ودراية**" میں انھیں تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان طرق و اسانید میں سے بعض صحیح اور بعض حسن درجے کی ہیں اور بعض ضعیف بھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت نے اسے متواتر احادیث میں شمار کیا ہے۔

یہی وہ حدیث ہے جس پر اعتماد کرتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ نے اپنی یہ اربعین تیار کی ہے، چناں چہ "اربعین نووی" کی تصنیف کے دیگر اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ حدیث بھی ہے، جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے اپنے مقدمۂ اربعین میں اس کی صراحت کرر کھی ہے۔

یہ حدیث علم، اہلِ علم اور علم کی نشر و اشاعت کی زبردست اہمیت و فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ چناں چہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"**ولو لم يكن في فضل العلم إلا هذا وحده لكفى به شرفًا، فإن النبي ﷺ دعا لمن سمع كلامه ووعاه وحفظه وبلغه**" "اگر علم کی فضیلت میں صرف یہی ایک حدیث ہوتی تو یہ اکیلے ہی علم کی شرف و فضیلت کے لیے کافی تھی، کیوں کہ اس میں نبی ﷺ نے ان لوگوں کے لیے دعا فرمائی ہے جنھوں نے آپ ﷺ کے کلام کو سنا، سمجھا، یاد کیا اور اسے دوسروں تک پہنچا دیا۔" [مفتاح دار السعادۃ ۱/۷۱]

حدیث میں وارد لفظ "نَضَّرَ" نَضَّارَةٌ سے ماخوذ ہے۔ اس کو تشدید کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور اکثر محدثین نے مشدد ہی پڑھا ہے، جس کے معنی حسن، شگفتگی اور ترو تازگی کے ہیں، جب کہ اسے تخفیف کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ نیز "نَضَّرَ" کا اصل مفہوم دل کی خوشی کے اثرات کا چہرے پر ظاہر ہونا ہے، جس کی وجہ سے چہرہ روشن اور چمکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو کوئی بھی حدیث کو پڑھے پڑھائے گا نبوی دعا کے بموجب اللہ اس کے چہرے کو ترو تازگی عطا فرمائے گا، اس کی قدر و منزلت میں اضافہ فرمائے گا اور اسے دنیا و آخرت کی مسرت و شادمانی سے نوازے گا۔

یہ حدیث کتاب و سنت سے مسائل کو استنباط کرنے والے علماء و فقہاء اور محدثین کی فضیلت پر بھی دلالت کرتی ہے نیز احادیث کو یاد کرنے اور لوگوں کے درمیان اس کی تبلیغ و اشاعت کرنے پر ابھارتی ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فہم و استنباطِ مسائل اور اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں یہ بشارت پائی جاتی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے ادوار میں بھی لوگ دین کی فہم و بصیرت حاصل کریں گے اور تا قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا اور جس طرح قرونِ اولیٰ کے لوگوں کو حدیث پڑھنے پڑھانے کی ضرورت تھی آج بھی اس کی ضرورت ہے۔

اس فرمانِ نبوی میں حدیث کو یاد کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی جو بات کہی گئی ہے اس

میں حدیث کو زبانی یاد رکھنا اور تحریری طور پر محفوظ کر لینا دونوں شامل ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جہاں حدیث کو زبانی یاد کرتے تھے وہیں بعض صحابہ انھیں تحریری شکل میں بھی محفوظ رکھتے تھے اور پھر اس کے بعد کے ادوار میں ائمۂ حدیث نے نبوی احادیث کو زبانی اور تحریری دونوں طرح سے محفوظ کیا اور اس کی محفوظیت کا ایسا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جس کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی ہے۔ گویا حدیث میں بیان کی گئی شرف وفضیلت کے حامل زبانی یاد کرکے یا تحریری طور پر محفوظ کرکے دوسروں تک پہنچانے والے دونوں طرح کے لوگ ہوں گے۔

نبوی فرمان میں ''عَبْدًا'' نکرہ واقع ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی شخص خواہ وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہو یا ان سے سننے والوں میں سے کوئی ہو حتیٰ کہ ہمارے اس دور میں بھی حدیث کا علم حاصل کرنے والے لوگ بھی اس مطلق حکم اور نبوی دعا میں داخل وشامل ہیں۔

((فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيهٍ، وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ)) ''رُبَّ'' تقلیل اور تکثیر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور حدیث کے اس ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو سننے والے بہت سے راوی یا کچھ راوی عالم وفقیہ تو نہیں ہوتے، لیکن وہ لوگ حدیث کو یاد کر کے مسائل واحکام کا استنباط کرنے والے علماء وفقہاء تک اس حدیث کو پہنچا دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ فہم و استنباط میں شاگرد استاد سے آگے بڑھ سکتا ہے اور ہر محدث کا فقیہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

حدیث میں وارد فقہ وفقیہ کے الفاظ معروف اصطلاحی کلمات نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد حدیث اور فہم واستنباطِ مسائل کا وہبی ملکہ ہے۔ اس حدیث میں فقہ کا لفظ حدیث کے لیے استعمال ہوا ہے، نیز فقہ وفقیہ کے موجودہ اصطلاحی الفاظ بہت بعد میں ایجاد ہوئے ہیں۔

''لَا يَغِلُّ'' اسے کئی طرح سے پڑھا گیا ہے: ❶ یاء پر فتحہ، غین پر کسرہ اور لام کو تشدید کے ساتھ پڑھا گیا ہے، ایسی صورت میں یہ غَلَّ يَغِلُّ، باب ضرب یضرب سے ہے، جس کے معنی: کسی کے متعلق دل میں کینہ رکھنا، پوشیدہ دشمنی رکھنا کے ہیں۔ ❷ نیز اسے ''يَغُلُّ'' یاء پر فتحہ، غین پر ضمہ اور لام تشدید کے ساتھ پڑھا گیا ہے، ایسی صورت میں یہ غَلَّ يَغُلُّ، باب نصر ینصر سے ہے، جس کے معنی ہیں: خیانت کرنا۔ ❸ اسی طرح اسے یاء پر ضمہ، غین پر کسرہ اور لام تشدید کے ساتھ یعنی يُغِلُّ پڑھا گیا ہے، ایسی

صورت میں یہ اَغَلَّ يُغِلُّ إِغْلَالاً (افعال) سے مشتق ہے، جس کے معنی خیانت کرنا اور خیانت کے ساتھ متصف ہونا کے ہیں۔ ❹ اسی طرح اس میں ایک لغت يَغِلُ بھی ہو سکتا ہے یعنی اس کی یاء پر فتحہ، غین پر کسرہ اور لام کو مخفف پڑھا جا سکتا ہے جو کہ وَغَلَ يَغِلُ وُغُوْلًا باب ضرب سے مشتق ہے، جس کے معنی برائی میں داخل ہونا، حد سے آگے بڑھنا اور غلو کرنا کے ہیں۔ لیکن راجح بات یہی ہے کہ یہاں یہ خیانت کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔

زیرِ مطالعہ حدیث کے محولہ بالا ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ ان تینوں خصلتوں کے ذریعہ دلوں کی اصلاح ہوتی ہے، جو کوئی بھی ان تینوں خصلتوں کو مضبوطی سے اپنائے گا اس کا دل خیانت، بغض و حسد، دشمنی اور برائی سے پاک وصاف رہے گا۔ بے شک مومن ان تینوں خصلتوں کی ادائیگی میں خیانت نہیں کرتا ہے اور نہ اس کے دل میں کوئی ایسی خواہش وضرورت، خیانت اور بغض وحسد پیدا ہوتی ہے جو اسے حق سے دور کر دے اور حدیث کی تعلیم وتبلیغ سے روک دے۔

دل کے خیانت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مومن ان تین خصلتوں کو اپنانے میں کوتاہی نہیں کرتا، بلکہ ان پر مداومت برتتا ہے اور انھیں بخوبی انجام دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے حدیث میں موجود مذکورہ تینوں خصائل واعمال کی اہمیت وفضیلت کے ساتھ ساتھ مومن کی بھی فضیلت واضح ہوتی ہے۔ یہ تینوں خصلتیں حسب ذیل ہیں:

❶ اللہ کے لیے عمل کو خالص کرنا یعنی عمل کو خالصتاً لوجہ اللہ کیا جائے اور عمل کے ذریعہ فقط اللہ کی رضا وخوش نودی کا حصول مقصود ہو، کسی اور دُنیوی مقصد کا حصول اس کے پیچھے نہ ہو۔ عمل کی قبولیت اور دنیا وآخرت میں کامیابی کے لیے خلوص کا پایا جانا لازمی شرط ہے۔

❷ مسلمانوں کے لیے نصیحت وخیر خواہی: نصیحت کا مطلب منصوح کے لیے خیر وبھلائی چاہنا، مصالحِ عامہ کی طرف ان کی رہنمائی کرنا اور ان کی ہدایت واصلاح کے لیے دعا کرنا ہے۔ جب کہ اس حدیث کے بعض طرق میں ((النَّصِيْحَةُ لِوُلَاةِ الْمُسْلِمِيْنَ)) کے الفاظ آئے ہیں۔ ”وُلَاةِ الْمُسْلِمِيْنَ“ سے مراد حکام اور علماء وارباب دانش ہیں۔ مسلمان حکمرانوں کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ حق بات اور بھلائی کے کاموں میں ان کی پیروی کی جائے، ان کی طرف سے عائد کردہ قوانین سے روگردانی نہ کی

جائے، ان کے خلاف بغاوت نہ کیا جائے اور اگر ان کے فیصلے، احکاماتِ شریعت سے متصادم ہوں تو ان پر ان کی غلطی کو واضح کیا جائے اور خلوصِ دل سے ان کی ہدایت واصلاح کے لیے دعا کی جائے۔

❸ **مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنا کیوں کہ ان کی دعا دور والوں کو بھی گھیر لیتی ہے:** مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اعتقاد، عملِ صالح، نماز باجماعت، جمعہ اور عیدین میں مسلمانوں کی موافقت کرنا اور مسلمان حکمرانوں کی اطاعت کرنا وغیرہ۔ نیز مسلمانوں کی جماعت میں اختلاف و تفرقہ نہ پیدا کیا جائے اور کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے مسلمانوں کے دشمنوں کو فائدہ پہنچے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچے یا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

روایتِ مذکورہ میں جماعت (اور جماعت المسلمین) سے مراد تین باتیں ہیں: ① تمام مسلمانوں کا اجماع۔ ② صحیح العقیدہ مسلمانوں کی نماز باجماعت۔ ③ مسلمان حکمرانوں اور خلیفہ کی اطاعت پر مجتمع مسلمین۔ [أضواء المصابیح ص:۲۹۴]

((فَإِنَّ دَعْوَتَهُمْ تُحِيْطُ مِنْ وَّرَائِهِمْ)) حدیث کا یہ ٹکڑا اپنے سے پہلے جملے کا سبب و وجہ بیان کر رہا ہے یعنی یہ جملہ علت و سبب بیان کرنے کی جگہ میں ہے گویا تقدیری عبارت اور اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ کوئی بھی شخص مسلمانوں کی جماعت سے دور نہیں رہ سکتا، کیوں کہ مسلمانوں کی دعا مسلمانوں کو ان کے پیچھے سے اور دور والوں کو بھی گھیرے رہتی ہے، انھیں اپنی لپیٹ و حفاظت میں لیے رہتی ہے اور وہ دعا انھیں شیاطین کے مکر و فریب سے اور گمراہی سے بچاتی ہے۔ اس میں یہ تنبیہ ہے کہ جو کوئی بھی مسلمانوں کی جماعت سے نکلے گا اسے ان کی برکت حاصل نہیں ہو گی، کیوں کہ وہ اس دائرے سے خارج ہو جائے گا جسے مسلمانوں کی دعا گھیرے رہتی ہے۔ اس لیے کسی بھی شخص کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان کی برکت و دعا سے محروم رکھے۔ لہٰذا ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے علاوہ دوسروں کے لیے بھی دعا کرتا رہے، کیوں کہ جو شخص دوسروں کے لیے دعا کرتا ہے اسے بھی دوسروں کی دعائیں پہنچتی ہیں۔

✿ ✿ ❁ ✿ ✿

احادیث اَربعین کا مکمل عربی متن

(**١**) عَنْ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِيْنَ أَبِي حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : ((**إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ**)) رَوَاهُ إِمَامَا الْمُحَدِّثِينَ أَبُو عَبْدِ اللهِ مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ بْنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ بَرْدِزْبَهْ الْبُخَارِيُّ الْجُعْفِيُّ، وَأَبُو الْحُسَيْنِ مُسْلِمُ بْنُ الْحَجَّاجِ بْنِ مُسْلِمٍ الْقُشَيْرِيُّ النَّيْسَابُورِيُّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا فِي صَحِيْحَيْهِمَا اللَّذَيْنِ هُمَا أَصَحُّ الْكُتُبِ الْمُصَنَّفَةِ

(**٢**) عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَيْضًا قَالَ : بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ، إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ، شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعْرِ، لَا يُرَى عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ، وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ. حَتَّى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى فَخِذَيْهِ، وَقَالَ : يَا مُحَمَّدُ! أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنْ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا**)) قَالَ : صَدَقْتَ. فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ! قَالَ : فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيْمَانِ؟ قَالَ : ((**أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ**)) قَالَ : صَدَقْتَ. قَالَ : فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ؟ قَالَ : ((**أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ**)) قَالَ : فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ؟ قَالَ : ((**مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ**)) قَالَ : فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا؟ قَالَ: ((**أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا، وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُنْيَانِ.**)) ثُمَّ انْطَلَقَ، فَلَبِثْتُ مَلِيًّا، ثُمَّ قَالَ : ((**يَا عُمَرُ! أَتَدْرِي مَنِ السَّائِلُ؟**)) قُلْتُ : اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ. قَالَ : ((**فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

(**٣**) عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : ((**بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ : شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللَّهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَحَجِّ الْبَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

(٤) عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ- : ((**إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يُرْسَلُ إِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ، وَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ : بِكَتْبِ رِزْقِهِ، وَأَجَلِهِ، وَعَمَلِهِ، وَشَقِيٌّ أَوْ سَعِيدٌ؛ فَوَاللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ غَيْرُهُ إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا. وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

(٥) عَنْ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ أُمِّ عَبْدِ اللَّهِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ : قَالَ : رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((**مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ : ((**مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ**))

(٦) عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : ((**إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ، وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا أُمُورٌ مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنْ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ، كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى يُوشِكُ أَنْ يَرْتَعَ فِيهِ، أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، أَلَا وَإِنَّ حِمَى اللَّهِ مَحَارِمُهُ، أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

(٧) عَنْ أَبِي رُقَيَّةَ تَمِيمِ بْنِ أَوْسٍ الدَّارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**اَلدِّينُ النَّصِيْحَةُ**)) قُلْنَا : لِمَنْ؟ قَالَ : ((**لِلَّهِ، وَلِكِتَابِهِ، وَلِرَسُوْلِهِ، وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

(٨) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللَّهِ، وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ؛ فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

(**٩**) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ صَخْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : ((**مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوهُ، وَمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَثْرَةُ مَسَائِلِهِمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

(**١٠**) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللَّهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا، وَإِنَّ اللَّهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِينَ فَقَالَ تَعَالَى : ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾** [المؤمنون : ٥١] **وَقَالَ تَعَالَى : ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾** [البقرة : ١٧٢] **ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ : يَا رَبِّ! يَا رَبِّ! وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ، وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لَهُ؟**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

(**١١**) عَنْ أَبِي مُحَمَّدٍ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ سِبْطِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَيْحَانَتِهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ : حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيْبُكَ**)) رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ : حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ.

(**١٢**) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ**)) حَدِيثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وابْنُ مَاجَةَ

(**١٣**) عَنْ أَبِي حَمْزَةَ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ خَادِمِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

(**١٤**) عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ [يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ] إِلَّا بِإِحْدَى ثَلَاثٍ : اَلثَّيِّبُ الزَّانِي، وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالتَّارِكُ لِدِينِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

(**١٥**) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهُ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

(**١٦**) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْصِنِي؟ قَالَ : ((**لَا تَغْضَبْ**)) فَرَدَّدَ مِرَارًا، قَالَ : ((**لَا تَغْضَبْ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

(**١٧**) عَنْ أَبِي يَعْلَى شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، وَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهُ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

(**١٨**) عَنْ أَبِي ذَرٍّ جُنْدُبِ بْنِ جُنَادَةَ، وَأَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**اتَّقِ اللَّهَ حَيْثُمَا كُنْتَ، وَأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ**)) رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ : حَدِيثٌ حَسَنٌ، وَفِي بَعْضِ النُّسَخِ : حَسَنٌ صَحِيحٌ

(**١٩**) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ : كُنْتُ خَلْفَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا، فَقَالَ : ((**يَا غُلَامِ! إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ : اِحْفَظِ اللَّهَ يَحْفَظْكَ، اِحْفَظِ اللَّهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللَّهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللَّهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ لَكَ، وَإِنِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ عَلَيْكَ؛ رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ، وَجَفَّتِ الصُّحُفُ**)) رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ : حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ. وَفِي رِوَايَةِ غَيْرِ التِّرْمِذِيِّ : ((**اِحْفَظِ اللَّهَ تَجِدْهُ أَمَامَكَ، تَعَرَّفْ إِلَى اللَّهِ فِي الرَّخَاءِ يَعْرِفُكَ فِي الشِّدَّةِ. وَاعْلَمْ! أَنَّ مَا أَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ، وَمَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ. وَاعْلَمْ! أَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ، وَأَنْ الْفَرَجَ مَعَ الْكَرْبِ، وَأَنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا**))

(**٢٠**) عَنْ أَبِى مَسْعُودٍ عُقْبَةَ بْنِ عَمْرٍو الْأَنْصَارِيِّ الْبَدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُوْلَى : إِذَا لَمْ تَسْتَحِي فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

(**٢١**) عَنْ أَبِي عَمْرٍو وَقِيلَ : أَبِي عَمْرَةَ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قُلْتُ : يَا رَسُولَ اللَّهِ! قُلْ لِي فِي الْإِسْلَامِ قَوْلًا لَا أَسْأَلُ عَنْهُ أَحَدًا غَيْرَكَ؛ قَالَ : ((**قُلْ : آمَنْتُ بِاللَّهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

(**٢٢**) عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا : أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ : أَرَأَيْتَ إِذَا صَلَّيْتُ الْمَكْتُوبَاتِ، وَصُمْتُ رَمَضَانَ، وَأَحْلَلْتُ الْحَلَالَ، وَحَرَّمْتُ الْحَرَامَ، وَلَمْ أَزِدْ عَلَى ذَلِكَ شَيْئًا؛ أَأَدْخُلُ الْجَنَّةَ؟ قَالَ : ((**نَعَمْ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

(**٢٣**) عَنْ أَبِي مَالِكٍ الْحَارِثِ بْنِ عَاصِمٍ الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى

اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**الطُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ تَمْلَأُ الْمِيزَانَ، وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ تَمْلَآنِ –أَوْ: تَمْلَأُ– مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، وَالصَّلَاةُ نُورٌ، وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ، وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ، وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ، كُلُّ النَّاسِ يَغْدُو، فَبَائِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا أَوْ مُوبِقُهَا**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

(**٢٤**) عَنْ أَبِي ذَرٍّ الْغِفَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا يَرْوِيهِ عَنْ رَبِّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى، أَنَّهُ قَالَ : ((**يَا عِبَادِي! إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي، وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا؛ فَلَا تَظَالَمُوا. يَا عِبَادِي! كُلُّكُمْ ضَالٌّ إِلَّا مَنْ هَدَيْتُهُ، فَاسْتَهْدُونِي أَهْدِكُمْ. يَا عِبَادِي! كُلُّكُمْ جَائِعٌ إِلَّا مَنْ أَطْعَمْتُهُ، فَاسْتَطْعِمُوْنِي أُطْعِمْكُمْ. يَا عِبَادِي! كُلُّكُمْ عَارٍ إِلَّا مَنْ كَسَوْتُهُ، فَاسْتَكْسُونِي أَكْسُكُمْ. يَا عِبَادِي! إِنَّكُمْ تُخْطِئُونَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَأَنَا أَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا؛ فَاسْتَغْفِرُونِي أَغْفِرْ لَكُمْ. يَا عِبَادِي! إِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوا ضُرِّي فَتَضُرُّونِي، وَلَنْ تَبْلُغُوا نَفْعِي فَتَنْفَعُونِي. يَا عِبَادِي! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوا عَلَى أَتْقَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ، مَا زَادَ ذَلِكَ فِي مُلْكِي شَيْئًا. يَا عِبَادِي! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوا عَلَى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ، مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِنْ مُلْكِي شَيْئًا. يَا عِبَادِي! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ قَامُوا فِي صَعِيْدٍ وَاحِدٍ، فَسَأَلُونِي، فَأَعْطَيْتُ كُلَّ وَاحِدٍ مَسْأَلَتَهُ، مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِمَّا عِنْدِي إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ. يَا عِبَادِي! إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُحْصِيْهَا لَكُمْ، ثُمَّ أُوَفِّيكُمْ إِيَّاهَا؛ فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللَّهَ، وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذَلِكَ فَلَا يَلُومَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

(**٢٥**) عَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَيْضًا أَنَّ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُورِ بِالْأُجُورِ، يُصَلُّونَ كَمَا نُصَلِّي، وَيَصُومُونَ كَمَا نَصُومُ، وَيَتَصَدَّقُونَ بِفُضُولِ أَمْوَالِهِمْ. قَالَ : ((**أَوَلَيْسَ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ مَا تَصَّدَّقُونَ؟ إِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةً، وَكُلِّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةً، وَكُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةً، وَكُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةً، وَأَمْرٌ بِمَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنْ مُنْكَرٍ صَدَقَةٌ، وَفِي بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ**)) قَالُوا : يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَيَأْتِي أَحَدُنَا شَهْوَتَهُ وَيَكُونُ لَهُ فِيهَا أَجْرٌ؟ قَالَ : ((**أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِي حَرَامٍ أَكَانَ عَلَيْهِ وِزْرٌ؟ فَكَذَلِكَ إِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ، كَانَ لَهُ أَجْرٌ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

(۲۶) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**كُلُّ سُلَامَى مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ، كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيْهِ الشَّمْسُ تَعْدِلُ بَيْنَ اثْنَيْنِ صَدَقَةٌ، وَتُعِيْنُ الرَّجُلَ فِي دَابَّتِهِ فَتَحْمِلُهُ عَلَيْهَا أَوْ تَرْفَعُ لَهُ عَلَيْهَا مَتَاعَهُ صَدَقَةٌ، وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ، وَبِكُلِّ خُطْوَةٍ تَمْشِيْهَا إِلَى الصَّلَاةِ صَدَقَةٌ، وَتُمِيْطُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ صَدَقَةٌ**)) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ

(۲۷) عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ، وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

■ وَعَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ : ((**جِئْتَ تَسْأَلُ عَنِ الْبِرِّ؟**)) قُلْتُ:نَعَمْ. فقَالَ:((**اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ، اَلْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ إِلَيْهِ النَّفْسُ، وَاطْمَأَنَّ إِلَيْهِ الْقَلْبُ، وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ، وَإِنْ أَفْتَاكَ النَّاسُ وَأَفْتَوْكَ**)) حَدِيثٌ حَسَنٌ، رَوَيْنَاهُ فِي مُسْنَدَي الْإِمَامَيْنِ أَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ وَالدَّارِمِيُّ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ

(۲۸) عَنْ أَبِي نَجِيحٍ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : وَعَظَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْعِظَةً وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوبُ، وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُونُ، فَقُلْنَا : يَا رَسُولَ اللَّهِ! كَأَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا، قَالَ : ((**أُوصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللَّهِ، وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ تَأَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ، فَإِنَّهُ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ فَسَيَرَى اِخْتِلَافًا كَثِيرًا، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّيْنَ، عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ؛ فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ**)) رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ : حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ

(۲۹) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قُلْتُ : يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَخْبِرْنِي بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدْنِي مِنَ النَّارِ؟ قَالَ : ((**لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ عَظِيْمٍ، وَإِنَّهُ لَيَسِيْرٌ عَلَى مَنْ يَّسَّرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ : تَعْبُدُ اللَّهَ لَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا، وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ، وَتَصُومُ رَمَضَانَ، وَتَحُجُّ الْبَيْتَ**)) ثُمَّ قَالَ : ((**أَلَا أَدُلُّكَ عَلَى أَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ الصَّوْمُ جُنَّةٌ، وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ، وَصَلَاةُ الرَّجُلِ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ**)) ثُمَّ تَلَا : ﴿ **تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ** ﴾ حَتَّى بَلَغَ ﴿ **يَعْمَلُونَ** ﴾ ثُمَّ قَالَ : ((**أَلَا أُخْبِرُكَ بِرَأْسِ الْأَمْرِ وَعَمُودِهِ وَذِرْوَةِ سَنَامِهِ؟**)) قُلْتُ : بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ : ((**رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ، وَعَمُودُهُ الصَّلَاةُ،**

وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ)) ثُمَّ قَالَ : **((أَلَا أُخْبِرُكَ بِمَلَاكِ ذَلِكَ كُلِّهِ؟))** فقُلْتُ : بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ! فَأَخَذَ بِلِسَانِهِ وَقَالَ : **((كُفَّ عَلَيْكَ هَذَا))** قُلْتُ : يَا نَبِيَّ اللَّهِ! وَإِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهِ؟ فَقَالَ : **((ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ عَلَى وُجُوهِهِمْ** -أَوْ قَالَ : **عَلَى مَنَاخِرِهِمْ- إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ؟!))** رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ : حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ

(٣٠) عَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ جُرْثُومِ بْنِ نَاشِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : **((إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا، وَحَدَّ حُدُودًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا، وَحَرَّمَ أَشْيَاءَ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا، وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ رَحْمَةً لَكُمْ غَيْرَ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا))** حَدِيثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَغَيْرُهُ

(٣١) عَنْ أَبِي الْعَبَّاسِ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ : يَا رَسُولَ اللَّهِ! دُلَّنِي عَلَى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِيَ اللَّهُ وَأَحَبَّنِيَ النَّاسُ؛ فَقَالَ : **((ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللَّهُ، وَازْهَدْ فِيمَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ))** حَدِيْثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَغَيْرُهُ بِأَسَانِيدَ حَسَنَةٍ

(٣٢) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ سَعْدِ بْنِ مَالِكِ بْنِ سِنَانٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : **((لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ))** حَدِيثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالدَّارَقُطْنِيُّ وَغَيْرُهُمَا مُسْنَدًا، وَرَوَاهُ مَالِكٌ فِي الْمُوَطَّإِ عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى عَنْ أَبِيهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرْسَلًا، فَأَسْقَطَ أَبَا سَعِيدٍ، وَلَهُ طُرُقٌ يُقَوِّي بَعْضُهَا بَعْضًا

(٣٣) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : **((لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعَى رِجَالٌ أَمْوَالَ قَوْمٍ وَدِمَاءَهُمْ، وَلَكِنِ الْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي، وَالْيَمِينُ عَلَى مَنْ أَنْكَرَ))** حَدِيثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ وَغَيْرُهُ هَكَذَا، وَبَعْضُهُ فِي الصَّحِيْحَيْنِ

(٣٤) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : **((مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ))** رَوَاهُ مُسْلِمٌ

(٣٥) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : **((لَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَنَاجَشُوا، وَلَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ، وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا، اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ، وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَكْذِبُهُ، وَلَا**

يَحْقِرُهُ، اَلتَّقْوَى هَاهُنَا، وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، بِحَسْبِ امْرِئٍ مِّنَ الشَّرِّ أَنْ يَّحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ : دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

(**٣٦**) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((**مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ. وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ، يَسَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. وَاَللَّهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ. وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا، سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ بِهِ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ. وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللَّهِ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ، وَيَتَدَارَسُونَهُ فِيْمَا بَيْنَهُمْ؛ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمْ السَّكِينَةُ، وَغَشِيَتْهُمْ الرَّحْمَةُ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَذَكَرَهُمْ اللَّهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ. وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ))** رَوَاهُ مُسْلِمٌ بِهَذَا اللَّفْظِ

(**٣٧**) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا يَرْوِيهِ عَنْ رَبِّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى، قَالَ : ((**إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ، ثُمَّ بَيَّنَ ذَلِكَ، فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللَّهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً، وَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللَّهُ عِنْدَهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ إِلَى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ إِلَى أَضْعَافٍ كَثِيرَةٍ، وَإِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللَّهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً، وَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللَّهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً))** رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ فِي صَحِيْحَيْهِمَا بِهَذِهِ الْحُرُوْفِ

(**٣٨**) عَنْ أَبِي هُرَيْرَة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُول اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَالَ : مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقْد آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُهُ عَلَيْهِ، وَلَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وَلَئِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيْذَنَّهُ))** رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

(**٣٩**) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:((**إِنَّ اللَّهَ تَجَاوَزَ لِي عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ))** حَدِيثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالْبَيْهَقِيُّ

(**٤٠**) عَنِ ابْن عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ : أَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْكِبَيَّ، وَقَالَ : ((**كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ))** وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا

يَقُولُ : إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ، وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ، وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

(**٤١**) عَنْ أَبِي مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ**)) حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ، رَوَيْنَاهُ فِي كِتَابِ الْحُجَّةِ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

(**٤٢**) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : قَالَ اللَّهُ تَعَالَى : ((**يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِي وَرَجَوْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ عَلَى مَا كَانَ مِنْكَ وَلَا أُبَالِي. يَا ابْنَ آدَمَ! لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِي غَفَرْتُ لَك وَلَا أُبَالِي. يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّك لَوْ أَتَيْتَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيتَنِي لَا تُشْرِكُ بِي شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً**)) رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ : حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ

(**٤٣**) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ : صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ**)) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

(**٤٤**) عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((**نَضَّرَ اللَّهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَأَدَّاهَا، فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيهٍ، وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ. ثَلَاثٌ لَا يَغُلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ مُسْلِمٍ : إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلَّهِ وَالنَّصِيْحَةُ لِلْمُسْلِمِينَ وَلُزُومُ جَمَاعَتِهِمْ فَإِنَّ دَعْوَتَهُمْ تُحِيْطُ مِنْ وَّرَائِهِمْ**)) رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ وَغَيْرُهُ.

ZIA-E-NABVI

URDU TARJUMA WA SHARH ARBAIEN NOVI

By: Jamshed Alam S/o Abdussalam Salafi

اس کتاب کی چند نمایاں خصوصیات

☆ ہر حدیث کی معنوی و مرکزی مضمون کی مناسبت سے دل کش و معنی خیز اور موزوں عنوان بندی کی گئی ہے۔

☆ ہر حدیث کی ترقیم و متنِ حدیث نئے صفحہ پر دائیں جانب لکھا گیا ہے اور اردو ترجمہ اس کے بالمقابل بائیں جانب رکھا گیا ہے تاکہ حدیث کے الفاظ کو پڑھنے اور ترجمہ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

☆ احادیث کے ترجمہ اور شرح کی زبان شستہ و سلیس، بامحاورہ، عام فہم اور واضح ہے نیز طرزِ نگارش بھی شگفتہ و دل آویز اور مؤثر ہے۔

☆ طلبہ کی آسانی کے لیے بعض احادیث کے مشکل الفاظ کی مختصر تشریح و وضاحت بھی کی گئی ہے۔

☆ ''شرح وفوائد'' کے عنوان سے ہر حدیث کی جامع انداز میں شرح کی گئی ہے اور جو مباحث و مسائل مزید تفصیل طلب اور توضیح کے محتاج تھے، انھیں قدرے تفصیل سے مدلل قلم بند کیا گیا ہے۔

☆ پوری کتاب میں وارد احادیث کی مختصر تخریج اور غیر صحیحین احادیث پر محدث عصر و فقیہِ دہر علامہ محمد ناصر الدین البانی اور ماہرِ علوم حدیث شیخ حافظ زبیر علی زئی رحمہما اللہ کی تحقیقات وافادات پر اعتماد کرتے ہوئے تصحیح و تحسین کا حکم لگایا گیا ہے۔

☆ پوری کتاب میں کہیں بھی کسی ضعیف حدیث سے استدلال نہیں کیا گیا ہے بلکہ صرف صحیح اور حسن حدیثوں پر اعتماد کیا گیا ہے۔

☆ قرآنی آیات سورہ و آیت نمبر کی تعیین کے ساتھ مصحف عثمانی سے ضبط کی گئی ہیں اور ان کا ترجمہ بالغ نظر مترجم و مفسرِ قرآن حافظ عبد السلام بھٹوی حفظہ اللہ کی معروف تفسیر ''تفسیر القرآن الکریم'' کے حوالے سے رقم کیا گیا ہے۔

☆ اربعین نووی کے تمام راویانِ حدیث کا مختصر اور جامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔

☆ اربعین نووی میں موجود تمام احادیث کے عربی متن کو کتاب کے آخر میں علاحدہ طور پر یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ انھیں یاد کرنے میں آسانی رہے۔

PUBLISHED BY :

Maktaba Al-Salam Antari Bazar, Shohratgarh, Siddhart Nagar, (U.P.) India 272205

+919628953010 / +91 63932 25101, maktabsalam2@gmail.com / abuafaf9@gmail.com